ہدیہ بارگاہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

مقالاتِ ایوبی

(حصہ سوئم)

مؤلفہ

امام المتکلمین امین المحققین حضرت مولانا محمد ایوب صاحب دہلوی قدس سرہٗ

ناشر:

مکتبہ رازی

۵ اشہاب مینشن، محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی ۱

بلا قیمت
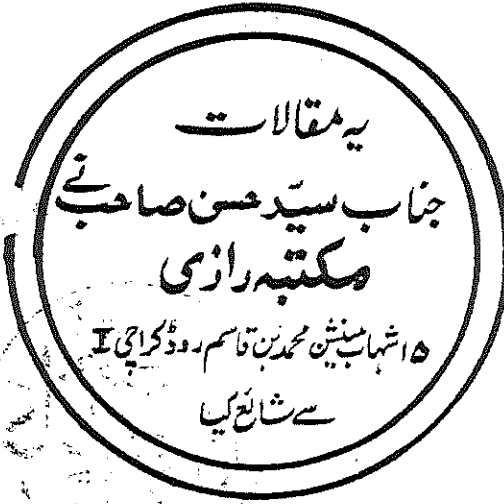
ہمارا مقصد

خالص علمی سطح پر دلائل و براہین کے ساتھ مخالفین اسلام کے پھیلائے ہوئے مغالطوں کا جواب دینا اور اسلامی عقائد و تعلیمات کی حقیقی روح سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

جھلکیاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا ایوب دہلوی کو میں نے دیکھا بھی نہیں سنا بھی نہیں۔ میرے حصّے میں تو صرف یہ سعادت آئی ہے کہ میں ان کی تصانیف سے استفادہ کروں۔

سنتا ہوں کہ مولانا بے تکان بولنے والوں میں سے تھے۔ ان کی تصانیف سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ علمائے کرام کے اس گروہ میں شامل تھے۔ جس کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مفسر بھی تھے، محدث بھی اور محقق بھی۔ منطق اور فلسفے پر ان کی گہری نظر تھی۔ اللہ نے ذہن رسا بھی دیا تھا۔ اور فکر صحیح سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ حافظ تو وہ تھے ہی لیکن حافظہ بھی بلا کا تھا۔ کیا کیا باتیں انھیں یاد تھیں۔ ان کا اندازہ ان دلیلوں اور حوالوں سے ہوتا ہے۔ جو اپنے مبحث کے درمیان وہ بڑی آمد کے ساتھ لے آتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس دور کے امام المتکلمین تھے تفسیر اولیٰ کی دو چھوٹی چھوٹی کتابوں کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں فہم قرآن

کی خاص بصیرت سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔

بنیادی طور پر وہ معلم تھے اور خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ بات کس طرح سمجھائی جاتی ہے۔ ان کی کسی تصنیف کو پڑھئے گرہ کے بعد گرہ کھلتی جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موضوع آسان سے آسان تر ہوتا جا رہا ہے۔ منطق ان کا خاص جوہر ہے ان کے پاس استدلال بھی ہے اور استدراک بھی۔ وہ علمی اور تحقیقی سطح سے اپنے مخالف پر دلیلوں کی ایسی بوچھار کرتے ہیں کہ اسے ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑتی ہے۔ مقصود کائنات فتنۂ انکار حدیث، مسئلہ قربانی، اور ختم نبوت اگرچہ کہ چھوٹے چھوٹے کتابچے ہیں۔ لیکن ان میں مولانا کا مزاج اور رنگ پوری طرح نمایاں ہے۔

سنا ہوں کہ وہ بڑی سادہ و پُر کار شخصیت کے مالک تھے۔ نہ اپنے لئے کبھی انھوں نے دنیا کی پروا کی نہ کسی بڑے سے بڑے دنیا دار کو خاطر میں لائے۔ ہاں طلب علم کی خو بو کسی میں پاتے تو جی جان سے اس کے ہو رہتے۔ درس و تدریس کے لئے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا جس کا دل چاہتا آتا اور ساتھ لے جاتا۔ محفل میں پہنچتے ہی جس موضوع پر بولنے کی دعوت دی جاتی اسی پر گفتگو شروع کرتے اور انہیں سننے والے تو ایسے ہیں یوں معلوم ہوتا جیسے بس اسی ایک موضوع پر مولانا مدت العمر تحقیق کرتے رہے ہیں۔

ارتجالاً شعر کہنا اور فی البدیہہ تقریر کرنا مشکل ضرور ہے۔ لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا علمی موضوعات پر قلم برداشتہ لکھنا اور فی الفور بولنا۔ یہ انہیں کے بس کی بات ہے جن کی صلاحیتیں ہی خداداد نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کا شوق علم اور مطالعے کی لگن بھی بے مثال ہوتی ہے۔ مولانا کا تو اوڑھنا بچھونا ہی علم تھا۔ وہ طالب علم ہی پیدا ہوئے اور طالب علم

ہی مرے یہ اور بات کہ ان کی نگاہ کیمیا اثر نے سنگریزوں کو مسیحا بنا دیا۔

وہ اسلاف کا صحیح نمونہ تھے وہ علم اور اعجازِ نطق کو بیچتے نہ تھے۔ ہوسِ زر ان کے پاس سے بھی نہ گذری تھی۔ فقر و غنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ جب اپنے کندھے پر کپڑے کے تھان ڈال کر کوچہ و بازار میں گشت کرتے تو کوئی سمجھ نہ سکتا تھا کہ اپنے دور کا رازی نظروں کے سامنے سے جا رہا ہے۔ علم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے عمل کی نعمت سے بھی انھیں سرفراز کیا تھا۔ ایسی جامع کمالات شخصیت کہاں روز روز دیکھنے میں آتی ہے۔ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا":

تصنیفاتِ الہٰی کی مختلف جلدوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ ان کی تقریروں کے بہت سے ٹیپ محفوظ ہیں۔ انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا علم و حکمت کے خزانوں کو محفوظ کرنا ہے۔ جو بھی یہ خدمت انجام دے گا تشنگانِ علم کے شکریہ کا مستحق ہوگا۔

زیرِ نظر کتابچہ ایک اہم موضوع پر ان کے گہرے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔

انھیں تو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پرواہ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم ان کے درجات کی بلندی کے لئے ضرور دعا کریں ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

والسلام :۔ شاہ بلیغ الدین
منصورہ ۔ کراچی

اللہ سمیع اور بصیر ہے

یعنی اللہ تعالے سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ جگہ جگہ قرآن میں سمیع اور بصیر آیا ہے ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر نہیں ہے یہ حکماء کی جماعت ہے اور دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ سمیع و بصیر ہے۔ یہ اہل اسلام کی بڑی جماعت ہے۔ اس پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع ہے اور بصیر ہے۔ لیکن سمیع و بصیر کے معنیٰ کیا ہیں۔ اس میں ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کے معنی علم کے ہیں۔ لیکن بڑی جماعت مسلمانوں کی یہ کہتی ہے کہ نہیں سمیع اور چیز ہے۔ بصیر اور چیز ہے اور علم اور چیز ہے اور مسلمان حکماء اور معتزلہ اور دیگر تمام جماعتیں یہ کہتی ہیں کہ نہیں سمیع و بصیر ہے ہی نہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سمیع و بصیر نہیں ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ عالم ازل میں معدوم تھا اور تمام آسمانی مذاہب اس کے قائل ہیں اور معدوم ایسی چیز ہے۔ جو نہ سنائی دے گی نہ دکھائی دے گی۔ اس لیے اللہ تعالے ازل میں سمیع و بصیر ہو نہیں سکتا۔ اگر یہ کہو کہ وہ ایک خاص وقت میں دیکھتا اور سنتا ہے تو یہ خصلت حادث ہوئی اور حادث کا اس کو لاحق ہونا یہ ناجائز اور غیر معقول ہے۔ حدوثی خصلت اس میں پیدا نہیں ہوسکتی جب عالم ازل میں معدوم ہے نہ وہ سنائی دے گا۔ اور نہ دکھائی دے گا۔ تو وہ ازل میں سمیع و بصیر ہے ہی نہیں جب کچھ ہے ہی نہیں تو کیا دیکھتا ہے کیا سنتا ہے یہ دلیل انھوں نے بیان کی

اور اگر یہ کہو کہ معدوم چیز سنائی دے سکتی ہے اور دکھائی دے سکتی ہے تو جب عالم معدوم تھا اس وقت اس نے اس کو معدوم دیکھا اور جب وہ موجود ہو گیا تو اس نے اس کو موجود دیکھا اور اگر معدوم کے وقت وہ عالم کو موجود دیکھے گا تو وہ دیکھنا غلط ہو گا تو اس کو معدوم ہی دکھائی دینا چاہئے. پھر جب وہ پیدا ہو گیا تو اس نے اس کو موجود دیکھا تو پہلے معدوم دیکھا اور پھر اس کو موجود دیکھا تو دونوں دیکھنے میں فرق ہو گیا۔ ایک دوسرے کے خلاف ہو گیا تو اس کے علم میں تغیر ہو گیا۔ اور اللہ پاک کا علم یا کوئی اور صفت ایسی نہیں ہے جو متغیر ہو۔ لہذا وہ ازل میں سمیع و بصیر نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل اصل میں حکماء کی ہے اور مسلمانوں میں جو لوگ سمیع و بصیر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے اس دلیل کو استعمال کیا یہ اصل میں فلسفیوں کے یہاں کی بات ہے۔ عام مسلمانوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ سمیع و بصیر ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ سماعت و بصارت کی قوت متحقق ہے۔ یعنی یہ قابلیت موجود ہے۔ جب کوئی شے سامنے آئے تو دکھائی دے۔ اور اگر کوئی آواز ہو تو سنائی دے جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ازل میں سنائی دے اور دکھائی دے۔ ازل میں قوت سننے اور دیکھنے کی موجود ہے۔ ائمہ اہل سنت کا یہ جواب ہے۔ انھوں نے کہا کہ قوت موجود ہے اور قوت ہونے کو یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ دکھائی دے اور سنائی دے۔ بلکہ جب کوئی شے ہو تو دکھائی دے جائے اور سنائی دے جائے۔ لیکن یہ جواب غلط ہے۔ اس لئے کہ اللہ پاک میں استعداد ہے ہی نہیں۔ اس کے کل کمال بالفعل موجود ہیں۔ قابلیت نہیں ہے۔ قابلیت ممکن کی صفت ہے۔ مخلوق میں قابلیتیں ہوا کرتی ہیں۔ خالق میں قابلیت نہیں

ہوتی۔ قابلیت کے معنیٰ امکان، استعداد، ہوسکنا یعنی ایک ایسی قوت موجود ہے جب عمل کا وقت آئے گا تو وہ عمل کرے گا۔ یہ معنیٰ ہوئے۔ جواب کی غلطی واضح ہوگئی۔ اگر مان لیا کہ ازل میں استعداد موجود تھی اور اس کو ٹھیک بھی سمجھ لیا جائے۔ تب بھی ازل میں سمیع و بصیر نہ رہا۔ فعل سماعت و بصارت تو نہ ہوا۔ عالم ازل میں دکھائی تو نہ دیا۔ جب ہوگا تب دکھائی دے جائے گا۔ جس طرح ہمارے سامنے جب کوئی شے یا آواز آئے گی تو ہمیں دکھائی یا سنائی دے گی۔ مگر قوت دیکھنے اور سننے کی پہلے سے موجود ہے۔ تو یہ صفت مخلوق ہے۔ غلط چیز ہے۔ یہ ہزار سالہ علماء کا متفقہ جواب تھا۔ جسے میں نے رد کر دیا میں اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ جواب صحیح نہیں یہ کیا کہا کہ جب سامنے چیز آئے گی تو خدا دیکھے گا: وہ تو کہتا ہے کہ انہم یرونہ بعیدا و نراہ قریبا تم اسے دور دیکھ رہے ہو۔ ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزار دس ہزار سال کی بات ہے۔ ہمیں یہ اب نظر آ رہی ہے۔ یہ قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ استعداد کا ہونا یہ خاصہ ممکن ہے۔ اور لیس کمثلہ شئی اس جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ ہم جو سمیع و بصیر ہیں یہ ہمارا خاصہ ہے۔ اور وہ ہم جیسا ہے نہیں جب وہ ہم جیسا نہ ہوا تو جب کوئی شے ہو تو وہ دیکھے۔ ایسا نہیں ہے وہ شے ہو یا نہ ہو اگر وہ سمیع ہے تو سنے گا وہ بصیر ہے تو وہ دیکھے گا۔ یہ قوت ہم میں بھی موجود ہے کہ چیز سامنے ہو تو دیکھ لیں گے اگر چیز سامنے نہ ہو تب بھی ہم میں دیکھنے کی قوت موجود ہے۔ جو آواز پکاری جائے گی۔ وہ ہم سن لیں گے اور نہیں پکاری گئی تب بھی ہم میں سننے کی قوت موجود ہے۔ تو وہ ہم جیسا ہوگیا۔ لہذا یہ جواب بالکل

غلط ہے۔ اب اصل اعتراض کا جواب میں دیتا ہوں۔ جہاں میں کا لفظ آتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ میری بات ہے اور کسی نے یہ بات نہیں کہی۔ میں کہتا ہوں تم جو یہ کہتے ہو کہ ازل میں عالم معدوم تھا۔ اور معدوم دکھائی نہیں دے سکتا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ مغالطہ اور دھوکہ ہے جو سارے جہاں کو لگا۔ ازل چیز کیا ہے۔ ازل کوئی شے نہیں ہے۔ یا کوئی ظرف نہیں ہے کہ جہاں خدا تھا اور اس ظرف میں عالم نہیں تھا۔ اور ازل میں عالم اس کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گو تمہارے خیال کے مطابق دیکھنے کی طاقت سہی۔ ازل کوئی چیز نہیں۔ بالکل غلط بات ہے۔ ازل ماضی کی جانب لاانتہا جانے کے بعد کوئی چیز سرے پر ہے۔ یہ ذہن میں فرض کر لیا ہے۔ یہ تمام علماء اور متکلمین کو دھوکا لگا ہے۔ زمانہ غیر متناہی جانب ماضی کے اوپر کوئی شے مخیلہ میں آگئی ہے۔ انسان نے اس کا نام ازل رکھ دیا ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہے تو اس کی حد کہاں تک ہے۔ اور کہاں سے لاادل شروع ہوا۔؟ یہ بات جو آپ سن رہے ہیں۔ ایک ایک دو دو ہزار سال کے محققین علماء بیان نہیں کر سکے۔ کیا چیز ہے ازل اگر ازل کوئی شے ہے تو وہ ماضی میں چلی چلی آرہی ہے۔ تو وہ کہاں ختم ہوئی اور کہاں سے حدوث شروع ہوا۔ جہاں اس کو ختم کروگے اور جہاں سے حدوث شروع کردگے۔ وہ اس سے پہلے بھی ہو سکتا تھا اور اس کے بعد بھی ممکن تھا۔ اس سے ہزار برس لاکھ برس پہلے بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ ازل کہاں تک گیا۔ کیونکہ جتنے آگے اوپر بڑھ جایئے۔ لیکن وہ اس سے بھی پہلے پیدا کر سکتا تھا اور جب وہ پیدا کر سکتا ہے۔ تو وہ ازل ہو نہیں سکتا۔ تو یہ ازل کیا چیز ہے۔ یہ محض دھوکا ہے

تمام عالم کو دھوکا ہو گیا۔ یہ ازل کیا بلا ہے کوئی چیز نہیں ہے۔ باطل واہمہ ہے۔ یہ تو
جب ہو کہ ازل کوئی شے ہو اور اس میں خدا ہو اور اس کے باہر کوئی شے ہو اس
میں مخلوق ہو۔ پہلے ایک بات تو آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ ازل چیز کیا ہے۔ وہ وجود جو بغیر
قدرت کے ہے۔ "ہوا ہے" نہیں۔ "ہے" جو وجود کسی قدرت کا نتیجہ نہیں ہے۔
اس میں کسی قدرت نے تاثیر نہیں کی۔ اس وجود کا نام ازل ہے۔ اسی کا نام لا اول
ہے۔ ھوالاول والاخر والظاھر والباطن یہاں جو اول اور آخر ہے وہ اضافی
چیزیں ہیں۔ جو اول ہو گا وہ آخر نہیں ہو سکتا۔ اور جو آخر ہو گا وہ اول نہیں ہو سکتا
تو وہاں اول کے کیا معنیٰ ہیں۔ لا اول لا اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور ہمارے
یہاں جو اول ہے وہ اول ہے جو کبھی بھی آخر نہیں ہو گا۔ اور جو آخر ہے
وہ کبھی اول نہیں ہو گا۔ اور وہ کہتا ہے کہ وہ اول بھی ہے اور آخر بھی۔
ازل کو اول رکھو۔ ابد کو آخر رکھو تو تمہارے خیال کے مطابق جس وقت وہ ازل
میں ہے اسی وقت وہ ابد میں ہے۔ جس وقت وہ ازل میں ہے۔ عالم معدوم
ہے اور جس وقت عالم پیدا ہوا اس وقت ٹھیک وہی وقت ہے جس وقت
وہ ازل میں ہے اور اگر غل مچ رہا ہے اور بشارت ہو رہی ہے۔ تو وہ ازل میں
غیر ازلی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ آج تک کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے۔ صحیح جواب یہ
کہ یہ جو تم نے تقسیم کی ہے۔ ماضی۔ حال۔ مستقبل زمانے کی۔ یہ تقسیم غلط ہے۔ وہاں
ماضی و مستقبل کچھ نہیں۔ سب حال ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے۔ اب
اگر کہو کہ زمانہ جنت اور دوزخ کا لا انتہا جائے گا۔ تو ایک لا انتہا تو وہ ہے کہ ایسی
چیزیں ہیں جو موجود بالفعل ہوں اور ایک لا انتہا ہی کے یہ معنی ہیں کہ شروع تو ہوں

مگر ایک جگہ سے شروع ہوں پھر کسی جگہ ختم نہ ہوں۔ جیسے عدد ایک سے شروع ہوا اور کہیں ختم نہیں ہوگا جتنا بڑھتے چلے جائیں۔ اس کے آگے اور عدد موجود ہوگا۔ اور ایک لانتہاہی یہ ہے کہ شروع ہی نہ ہو سرے سے۔ لااول ہو۔ جو لااول ہوگا۔ وہ قطعی لاآخر ہوگا۔ آخر ہوتے ہی وہ لااول ہو نہیں سکتا اور جنت اور دوزخ کا جو سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ لاانتہا اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا وہ آگے جائے گا۔ اتنا ہی اپنے رب کو دیکھے گا۔ لاآخر کے معنی یہ ہیں کہ آخر سے آخر جگہ ہوگی۔ اس کے آگے وہ خود ہوگا یعنی اللہ جیسے ایک دیوار لاانتہا لمبی چلی چلی جائے۔ اور اس کے آگے ایک ہرن دوڑتا چلا جائے۔ تو جب وہ آنکھ پھیر کر دیکھے گا۔ دیوار کو پائے گا۔ اس لئے مخلوقات کا سلسلہ کتنا ہی لاانتہا جائے کتنی ہی جگہ چلا جائے۔ جب مڑ کر دیکھے گا۔ اپنے رب کو پائے گا۔ یہ معنیٰ لاانتہا کے ہیں

اصل میں یہاں دقت یہ ہے کہ اپنے رب کو اپنے موجود علم پر قیاس کیا اپنی بصارت سماعت اور علم پر اپنے رب کی بصارت۔ سماعت اور علم کو قیاس کیا ہے۔ یہ ہے بنیادی غلطی۔ اس وجہ سے یہ تمام دقتیں اور پریشانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کا جو موجود علم ہے یہ وسط میں ہے۔ وسط کہتے ہیں بیچوں بیچ کو جیسے مرکز دائرہ میں۔ ہمارے علما سے بعض جگہ بھول ہوئی ہے کہ اللہ کے علم میں جو سب سے بہتر صورت تھی۔ اس پر یہ عالم بنایا جو ذریعہ عقبیٰ کا جنت کا اور دوزخ کا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ یہ بہتر سے بہتر چیز نہیں بنائی نہ یہ ذریعہ نہ وہ مقصود۔ دونوں بہتر نہیں ہیں بیچ میں ہیں۔ ان دونوں سے بہتر لاانتہا قدرت ہے۔ ذریعہ پر بھی اور جنت پر بھی۔ جو جنت انبیاء علیہم السلام کو ملے گی۔ اللہ پاک اس سے لاانتہا بہتر

ہوتی۔ لہذا شبہہ کا مادہ بالکل کٹ گیا اور صحیح بات آپ کے علم میں آگئی کہ عالم کے
بدلتے ہی احکام بدل گئے۔ سارا عالم اس بات کو نہیں سمجھ سکا اگر تم ذرہ برابر تعاون
کرو تو یورپ کے فلاسفہ کو ڈ ۲ منٹ میں علمی شکست ہو سکتی ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتے
اس عالم کو اس عالم پر قیاس کرتے ہیں۔ عالم امکان ہی میں عالم بدلنے سے احکام
بدل جاتے ہیں۔ تو جب عالم وجوب آئیگا۔ تو وہاں بھی تمام احکام جو امکانی عالموں
میں ہیں ان سب کے خلاف ہو جائے گا۔ ہزارہا شبہات جو پیدا ہوئے ہیں سب
اسی بنیاد پر پیدا ہوتے ہیں کہ ایک عالم کی چیز کو دوسرے عالم میں ملا دیا۔ اب دیکھئے
کہ اس عالم میں زنا کی سزا رجم ہے۔ لیکن عالم خواب میں کوئی کتنا بھی بڑا زنا کرے۔
اس پر کوئی سزا مرتب نہیں ہے۔ اسی طرح جب بھی ایک عالم کی چیز کو دوسرے عالم
کی شے پر قیاس کرے گا۔ ہمیشہ غلطی کرے گا۔ علم ہندسہ میں یہ ثابت ہے کہ مربع کا
دوچند مربع ہے۔ مگر عدد یہ محال ہے کسی مربع کا دوچند مربع نہیں ہوتا۔ ایک کا دوگنہ
۲ ہے ۲ کبھی مربع نہیں ہوتا۔ جزر ۲ کا جزر اعشاریہ آئے گا۔ ۱۰۰ کا دوگنہ ۲۰۰ ہے
کبھی مربع نہیں ہوگا۔ عالم بدل گیا حکم بدل گیا۔ محسن کشی عالم شریعت میں بہت بری
چیز ہے۔ عالم بدلتے ہی محسن کشی کی برائی ختم ہوگئی۔ خضرؑ اور موسیٰؑ جا رہے تھے۔
کشتی والے نے مقدس آدمی سمجھ کر کشتی میں سوار کر لیا۔ خضرؑ نے کیا کیا کہ اس میں بیٹھ کر
کشتی کو توڑ دیا۔ یہ محسن کشی ہوئی تاکہ۔ اس نے تو احسان کیا بغیر ٹکٹ کشتی میں سوار
کرالیا۔ اور انھوں نے کشتی توڑ دی۔ تین باتیں ہوئیں تینوں شریعت کے خلاف
ہوئیں۔ تو اب ادھر کی چیز ادھر اور ادھر کی چیز ادھر ملا دو۔ تو کبھی غلطی عمر بھر دور
نہیں ہوگی۔ غلطی کبھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تقدیر کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی وجہ

وہ چاہے۔ اسی موجود شعور پر تمام فلسفے کی ترتیب ہے۔ موجود شعور پر اپنے رب کو قیاس کیا اور تمام فلسفے کو مرتب کیا۔ یہ غلط ہے۔ موجود شعور درحقیقت بیچ میں ہے اس پر اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ آپ غور کریں۔ ایک حسی مثال سے یہ بات حل ہو جاتی ہے۔ اس عالم کے اندر یہ شعور ہے کہ چیز سامنے ہو تو آپ کو نظر آئے۔ اس آنکھ کی ضرورت اس عالم میں ہے۔ مخلوق میں لاانتہا ایسے عالم ہیں کہ جہاں اس آنکھ کی ضرورت نہیں۔ خواب میں بغیر اس آنکھ کے دیکھتا ہے یا نہیں دیکھتا۔ بغیر اس کان کے سنتا ہے یا نہیں سنتا بغیر اس زبان کے بات کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ عالم بدل گیا۔ عالم کے بدلتے ہی ان آلات کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھنے کے لئے (۱) بعد بعید نہ ہو، (۲) قریب قریب نہ ہو یعنی آنکھ سے دور نہ ہو کہ نظر نہ آئے۔ اتنے قریب نہ ہو کہ نظر نہ آئے جیسے پلکیں۔ (۳) مقابل میں ہو۔ ادھر ادھر کی چیز نظر نہیں آتی (۴) کوئی حجاب درمیان میں نہ ہو (۵) اور روشن ہو۔ یہ شرطیں ہیں اس عالم میں نظر آنے کی مگر عالم بدلتے ہی نہ آنکھ کی ضرورت پڑیگی لقد کنت فی غفلۃ من ھذا وہ اس کو ماننے سے بالکل غافل تھا پہلے فکشفنا عنک غطاءک پھر ہم نے پردہ ہٹا دیا وبصرک الیوم حدید آج اس کی آنکھ بہت تیز ہے۔ اس آنکھ سے اس عالم میں دیکھ سکتا ہے۔ دوسرے عالم میں اس کی ضرورت نہیں۔ بغیر آنکھ کے دیکھ لے گا بغیر کان کے سن لے گا۔ اور روز خواب میں دیکھتا ہے۔ عالم بدلتے ہی کسی چیز کی شرط کی ضرورت نہیں رہی۔ انسانی عالم بدلنے میں اس حاسے کی ضرورت نہیں۔ یہی تو وجوبی عالم جب بدلے گا۔ وہ عالم وجوب ہے۔ یہ عالم امکان ہے۔ وہ ایک نئے ہی قسم کا عالم ہوگا۔ اس لئے وہ بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے بغیر کان کے سنتا ہے۔ نہ وہاں بعد ہے نہ قریب ہے۔ انسان بھی عالم خواب میں بغیر زبان کے بات چیت کرتا ہے یا نہیں۔ زبان کو مطلق حرکت نہیں

بنانے پر قادر ہے۔ کسی جگہ اس کی بہتری نہیں ٹھہرے گی کہ اس سے بہتر نہیں بنا سکتا
اور اس سے کمتر پر بھی لا انتہا قادر ہے جب بہتر بھی لا انتہا قادر ہوا۔
اور کمتر پر بھی لا انتہا قادر ہوا تو موجود عالم بیچ میں آگیا۔ خواہ عالم آخری ہو خواہ
عالم اولی۔ جو موجود شعور ہے یا مخلوقات کو جو شعور دیا ہے۔ خواہ شعور انبیاء
و مرسلین ہو۔ خواہ شعور انسانی ہو۔ ملائکہ مقربین و حور عین یا کوئی اور مخلوق ہو جو علم ان
کو دیا ہے اس کے لا انتہا اضافے پر قادر ہے اور اس کی کمی پر لا انتہا قادر ہے۔ اسی
لئے فرمایا وما اوتیتم من العلم الا قلیلا تمہیں تھوڑا سا علم دیا ہے۔ اس مخلوقی
علم پر لا انتہا پر قادر ہے۔ اور جو علم اس کا اپنا علم اس کو کوئی نہیں جانتا۔ سوائے خود
اس کے۔ ہمارا تو وہ علم ہے جو اضافی ہے۔ جیسے بیت اللہ اللہ کا گھر حقیقت میں تو وہ
اس کا گھر نہیں ہے جس میں وہ رہے۔ صرف اس کو نسبت ہے۔ وہ گھر سے پاک ہے
مکان سے پاک ہے۔ اس طرح علم اللہ ہے۔ یہ علم مخلوقی جس کے دینے پر وہ قادر ہے
وہ لا انتہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ شعور دے سکتا ہے۔ اس وقت انسان کو سب سے
زیادہ شعور دیا ہے۔ مگر وہ اس پر قادر ہے کہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو انسان کو ایسا
ہی بے شعور سمجھے جیسا انسان جانور یا پتھر کو بے شعور سمجھتا ہے۔ اور پھر اس سے بہتر ایسی
مخلوق پیدا کرے جو اس مخلوق کو اتنا ہی بے شعور گردانے تو اس مخلوقی علم پر وہ لا انتہا
قادر ہے۔ مخلوقی علم کی یہ شان ہے کہ وہ اس پر لا انتہا قادر ہے۔ اور جو اس کا ذاتی
علم ہے۔ اس کو تو کوئی نہیں جان سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود اپنے کسی مقدس
نبی پر ظاہر کر دے۔ ویسے اس کے علم کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ لا یحیطون بشیء
من علمہ۔ اس کے علم کا ذرہ برابر بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ الا بما شاء مگر اتنا جتنا

یہی ہے۔ یہ ضابطہ مجھ پر منکشف ہوا جو میں نے ظاہر کر دیا۔ اور مختلف طریقہ سے سمجھا دیا کہ ایک لائن کی چیز دوسری لائن میں شامل نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر اللہ کے حالات کو اپنے حالات پر قیاس کریں گے، تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چھت پر سے آدمی گر پڑے کوئی بات نہیں۔ دوسرا آدمی اگر دھکا دیدے تو فوراً پکڑا جائے گا۔ قصاص ہوگا۔ حالانکہ دونوں فریق متفق ہیں کہ موت کا دینے والا خدا ہے۔ لیکن چونکہ یہ موت دینے میں شریک ہوا۔ اس نے شرک کیا۔ ان الشرک لظلم عظیم ؕ اس لئے وہ ماخوذ ہوا۔ بات صاف ہو گئی کہ ہر عالم کے احکام الگ ہیں اور مختلف ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ خدائے تعالےٰ ازل میں سمیع و بصیر نہیں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ ازل میں ایسا ہی سمیع ہے جیسا اب ہے اب بھی تو وہ سن رہا ہے وہ ان کے خیال کے مطابق ازل میں تھا۔ یہ تصور خود غلط ہے۔ وہاں تھا کا سوال ہی نہیں وہ ازل میں ہے۔ تھا، ہے، ہوگا، یہ تین چیزیں ہیں۔ ایک صحیح ہے دو غلط ہیں۔ وہاں حال ہے نہ ماضی ہے۔ نہ مستقبل وہاں کوئی زمانہ نہیں ہے کہ ازل سے اتنا زمانہ گذرنے کے بعد آج وہ یہاں پہنچا اور پھر اتنا زمانہ گذرنے کے بعد وہ قیامت میں پہنچے گا۔ انہم یرونہ بعیدا ونراہ قریبا۔ وہ اس کو دور دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہ بعد میں سمجھا دوں گا کہ ایسا کیوں ہے۔ تو یہ کہنا کہ ازل میں عالم معدوم تھا اس لئے اس کو دکھائی نہیں دے سکتا۔ تو جب تک معدوم موجود نہ ہوگا۔ وہ سمیع و بصیر نہیں ہوگا یہ غلط ہے۔ وہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ ہر وقت سنتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا انی اسمع اریٰ جا ؤ فرعون کے پاس میں سن بھی رہا ہوں۔ دیکھ بھی رہا ہوں۔ ابھی تو پہنچے بھی نہیں تھے وہ پہنچنے سے پہلے ہی سن رہا تھا۔ آپ اب سن رہے ہیں۔ وہ ازل میں

سن رہا ہے اور ٹھیک اسی وقت سن رہا ہے۔ جب آپ سن رہے ہیں۔ ہمارے لئے زمانہ معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے لئے بس اک آن ہے۔ ھوالاول والآخر۔ وہی اوّل ہے وہی آخر ہے۔ دونوں ایک ہیں۔ جب وہی اول ہے وہی آخر ہے تو زمانہ خارج ہو گیا۔ زمانہ میں ترتیب ہے۔ ھوالاول والآخر میں ترتیب ہے نہیں۔ کیونکہ اول و آخر وہی ایک ہے۔ اول ازل ہے آخر ابد ہے۔ تو جب وہ ازل میں ہے اسی وقت وہ ابد میں ہے۔ شرعی دلیل سے بھی ثابت ہو گیا اور عقلی دلیل سے بھی ثابت ہو گیا۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ سمیعٌ وبصیر ہے

اب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ سمیع وبصیر ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سماعت وبصارت دونوں کمال ہیں۔ بہرا پن اور اندھا پن یہ دونوں نقصان اور زیاں ہیں اور اللہ نقصان سے پاک ہے۔ لہٰذا وہ سمیع وبصیر ہے یہ استدلال جو انھوں نے کیا ہے یہ غلط ہے بالکل۔ یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ وہ سمیع وبصیر ہے۔ مگر دلیل جو وہ لائے ہیں وہ دلیل غلط ہے۔ اس لئے کہ سماعت وبصارت کو جو تم کمال بتاتے ہو تو یہ کمال مخلوقی ہے جس طرح وہ مخلوقی عیب سے پاک ہے اسی طرح وہ مخلوقی کمال سے بھی پاک ہے۔ جیسے غبی ہے وہ نقص ذہانت کے مقابلے میں تو تمہاری دلیل کے مطابق اللہ تعالےٰ کو ذہین ہونا چاہیئے اور کل جماعتوں کے نزدیک اللہ تعالےٰ کو ذہین کہنا کفر ہے۔ الحاد ہے۔ ناجائز ہے۔ غلط ہے۔ عقل ہے یہ کمال ہے۔ اور بے عقلی عیب اور نقصان ہے اور وہ نقصان سے پاک ہے۔ تو اس کو عقلمند ہونا چاہیئے اور اس کو یا عاقل کہہ کر پکارنا چاہیئے۔ مگر نہیں پکار سکتے لہٰذا یہ دلیل بھی بالکل غلط۔ اس لئے کہ یہ دلیل

اس بات پر مبنی ہے کہ خدا کے کمال وہ ہوں جو مخلوق کے کمال ہوں۔ اگر آپ
کسی کو قتل کر دیں تو آپ ظالم اور قاتل کہلائیں گے۔ اور وہ اگر کسی کو مار ڈالے
تو کوئی اس کو برا نہیں کہے گا۔ سب یہ کہیں گے کہ مرضی اس کی، وہی بات وہ کہے تو حق
وہی بات آپ کہیں تو ناحق۔ اگر وہ مار ڈالے بکرے کو وہ حرام اور آپ اس کے
بتائے ہوئے حکم اور طریقہ کے مطابق بکرے کو ذبح کریں وہ حلال اور جائز۔ حالانکہ
چیز ایک ہی ہے۔ اس نے بھی مار ڈالا۔ آپ نے بھی مار ڈالا۔ تو شریعت کا جو حکم ہے
وہ اس پر لاگو نہیں ہوگا۔ جو چیز ہمارے لئے یہاں جائز ہے وہ ضروری نہیں کہ اس
کے لئے بھی جائز ہو۔ جب تک وہ خود اطلاع نہ کر دے۔ یہاں بغیر کسی گناہ یا جرم
سابق کے دکھ دینا قطعی ناجائز ہے۔ ہمارے یہاں یہ رائج ہے کہ برا ہے۔ قبیح ہے
دہریہ بھی جو جزا سزا کا قائل نہیں ہے۔ وہ بھی اس کو برا سمجھتا ہے۔ اگر آپ چلتے چلتے
کسی بچے کا کان کاٹ لیں تو سب برا اور ظالم کہیں گے۔ مگر خدا ہزاروں لاکھوں کو
بے کان کا پیدا کر رہا ہے۔ دکھ دے رہا ہے۔ مار رہا ہے۔ مگر اس کو کوئی برا نہیں
کہتا۔ جو خدا کا قائل نہیں۔ وہ تو کچھ کہے گا ہی نہیں۔ لیکن جو خدا کے قائل ہیں سب
یہی کہہ رہے ہیں کہ بڑا رحیم ہے۔ مہربان ہے۔ دیالو ہے۔ لہٰذا کوئی حکم انسان کا
خدا پر لاگو نہیں ہے نہ ہماری طرح وہ سمیع ہے۔ نہ بصیر ہے۔ نہ ہماری طرح سنتا
ہے نہ ہماری طرح دیکھتا ہے۔ وہ ایسا سمیع و بصیر نہیں ہے جو انہوں نے کہا کہ اگر
سمیع و بصیر ہوگا تو ایسا ہوگا۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ سمیع و بصیر ہے۔ مگر سمیع و بصیر
کے معنی ہیں کہ وہ عالم ہے۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھ لیں کہ سمیع و بصیر کے معنی عالم
کے بتائے۔ انہوں نے بھی انسان ہی پر قیاس کیا۔ آپ اپنا ہاتھ دیکھیں اور آنکھ بند

کرلیں۔ اب بھی ہاتھ آپ کے سامنے ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ پہلے میں آپ ہاتھ کو دیکھ رہے ہیں۔ اور دوسرے میں آپ کو علم ہے کہ ہاتھ آپ کے سامنے ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ علم اور شے ہے اور رویت اور ہے۔ تو یہ کہنا کہ سمیع و بصیر کے معنی علیم کے ہیں یہ غلط ہے۔ یہ آنکھ کان اس عالم میں ہیں۔ عالم کے بدلتے ہی ان کی ضرورت نہیں رہتی۔ عالم خواب میں بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے بغیر کان کے سنتا ہے۔ بغیر زبان کے بولتا ہے۔ اور بات کرتا ہے۔ برابر چلتا ہے۔ بغیر قدموں کے اور اتنا تیز چلتا ہے کہ طیارہ بھی اتنا تیز نہیں چل سکتا۔ ایک آن میں جہاں چاہتا ہے پہنچ جاتا ہے۔ ہاتھ ملاتا ہے بغیر ہاتھ کے۔ مرنے کے بعد پورا انسان جوں کا توں باقی رہتا ہے اور یہ بدن ایسا ہے۔ جیسے زائد ناخون کو کاٹ کے پھینک دو۔ یا گلی انگلی کاٹ دو۔ تو وہ گل سڑ جاتی ہے اور کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بدن گل سڑ جائے گا۔ مگر انسان مکمل باقی رہے گا اور پورا کا پورا عذاب ثواب اس کے اوپر ہوگا۔ بہت غور کا مقام ہے۔ ڈرنے کا مقام ہے۔ اللہ آپ کو اور مجھے عذاب قبر سے بچائے۔ پورا انسان ہوگا۔ بڑی تیز حالت ہوگی۔ یہ شعور ختم ہو جائے گا۔ یہ گھٹیا شعور ہے۔ بہت قوی شعور ہوگا۔ سب خیر کو جان جائے گا۔ کیسا نے کیسا ذہین آدمی ہو۔ اس نے جو پہلے غلط بات یا غلط فعل کیا تھا۔ اب یاد ہے اس کو؟ نہیں یاد۔ ۵۰ برس پہلے کی بات بالکل یاد نہیں۔ مگر اس بدن کے ہٹتے ہی ایک آن میں ایک ایک بات اور ایک ایک فعل یاد آئے گا۔ جوں کا توں منقش ہے یہ بدن حاجب ہے۔ جیسے کاربن رکھ کر آپ لکھتے ہیں۔ جو لکھتے ہیں جو لکھ کر کاٹتے ہیں۔ سب نیچے منقش ہوتا رہتا ہے۔ اوپر کا کاغذ حاجب ہے جب اوپر سے

کاغذ پھاڑیں گے۔ نیچے جون کا تون منقش پائیں گے یہی حال انسان کا ہے۔ بدن حاجب ہے۔ جب یہ حاجب بدن اوپر سے پھاڑ اجائے گا۔ اسی کا نام نزع ہے۔ یہ جتنے حرکات و سکنات ہیں ان ہی کا نام عمل ہے۔ تو یہ حرکات و سکنات جوں کے توں منقش سامنے آجائیں گے۔ یہ پورا کا پورا مندرج نظر آئے گا۔

یہ کیسا رجسٹر کیسی کتاب ہے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب بات اس میں لکھی ہے۔ جس طرح یہاں کاربن کاپی میں ننھا سا نقطہ اور کٹی ہوئی غلطی سب منقش ہوجاتی ہے۔ اس طرح وہاں بھی کوئی آپ نے گناہ کیا ہے۔ پھر توبہ کرلی یا نیک کام کیا بھلائی کی تو وہ گناہ بھی کٹا ہوا وہاں موجود ہوگا۔ اسی لئے وہاں ہر ہر شئے کا حساب ہوگا۔

اس دن حساب کے لئے تیرا نفس خود کافی ہے۔ سب کو معلوم ہوجائے گا۔ خیر یہ مسئلہ دوسرا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ استدلال غلط ہے۔ انھوں نے اپنے اوپر قیاس کرکے اللہ کو سمیع و بصیر کہا۔ یہ غلط ہے۔ وہ سمیع و بصیر ضرور ہے مگر کیا سمیع و بصیر ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ جیساکہ اور سب لوگ دیکھتے اور سنتے ہیں۔ انہ بکل شئی بصیر یہاں کبھی کسی نے آواز کو دیکھا ہے۔ مگر وہ آواز کو دیکھتا ہے۔ مزے کو بھی دیکھتا ہے۔ وہ ہر شئے کو دیکھ رہا ہے۔ انہ بکل شئی بصیر وہ بصارت بالکل الگ ہے جس طرح اس کی ذات ہماری ذات سے مختلف ہے اسی طرح اس کی سماعت اور بصارت بھی ہماری سماعت و بصارت سے الگ اور مختلف ہے اس طرح اس کے تمام اوصاف اور خصلتیں تمام کائنات سے مختلف اور جدا ہیں۔ ان پر ان کو قیاس

ہی نہیں کرنا چاہیئے سمیع و بصیر اور جو نام اس نے اپنے رکھے ہیں اور اپنے نبیوں کے ذریعہ ہم کو بتلائے ہیں وہ سب حق ہیں. لیکن ان ناموں کو اپنے پر قیاس کرکے ان کا وہ مفہوم سمجھنا یہ غلط ہے اور جو دلائل بیان کئے ہیں وہ غلط ہیں وہ سمیع و بصیر ہے. مگر ایسی سماعت و بصارت نہیں ہے جیسی مخلوقات میں ہے اور سمیع و بصیر کے معنی علیم کے جن لوگوں نے لئے ہیں. غلط ہیں سماعت اور چیز ہے اور بصارت اور چیز ہے. علم اور چیز ہے. بس جو کچھ اس نے کہا ہے وہ صحیح اور حق ہے. ہم کوئی قیاس اس کے متعلق نہیں کر سکتے. دلیل سے ثابت نہیں ہوتا. کیونکہ دلائل صرف اس عالم میں جاری ہیں. اس دلیل سے اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ وہ کوئی شے ہے لیکن کیا ہے یہ پتہ نہیں چلا. دلیل سے پتہ نہیں چل سکتا. کیونکہ دلیل پڑوسی کا نام ہے. قرین کا نام ہے. ساتھی کا نام ہے. جیسے آپ کہیں میری دوکان کہاں ہے. تاج کمپنی کے پاس ہے تو آپ کو میری دوکان کا علم نہیں ہوا. پڑوس کی دوکان کا علم ہوا اور اس کے ذریعہ آپ نے میری دوکان کو جان لیا حقیقت میں اس کا کچھ بھی علم نہیں دلیل دراصل پڑوسی ہے. ایسا پڑوسی جس کو آپ جانتے ہیں. جب آپ کہیں کہ بنیان والے کے برابر کی دوکان ہے تو مخاطب کہے گا. ہاں میں جان گیا کیا خاک جان گیا کچھ نہیں جانا تو نے تو بنیان والے کی دوکان کو جانا.

ایک عالم نے ایک بڑے عالم سے کہا کہ میں خدا کو چھ دلیلوں سے جانتا ہوں تو انھوں نے جواب دیا کہ دلیلوں ہی کو تو جانتے ہو. خدا کو تو نہیں جانتے. یہ کوئی پختہ بات تو نہیں ہے. مگر میں نے سنا ہے. وہ بیان کر دیا

ایک جماعت کہتی ہے کہ سماعت کے بغیر سمیع نہیں ہو سکتا اور بصارت کے
بغیر بصیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا وہ سمیع و بصیر ہے۔ یہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ
حی بغیر حیات کے ہے وہ اگر سمیع بغیر سماعت نہیں ہوگا۔ تو حی بغیر حیات کے
نہیں ہوگا۔ اور حی ہونے پر سب متفق ہیں۔ وتوکل علی الحی الذی لا یموت
کیونکہ حیات نام ہے۔ حس و حرکات کا۔ اور حس ایسی ناقص شے ہے کہ وہ
سب کو تو محسوس کرتا ہے۔ مگر خود کو محسوس نہیں کر سکتا۔ قوت حسیہ کو آج
تک یہ محسوس نہیں ہوا کہ حس آخر چیز کیا ہے۔ اور حرکت نام ہے ایک چیز کو
چھوڑ کر دوسرے چیز میں جانا اس کی حالت یہ ہے کہ ایک جزاس کا مٹتا ہے۔ تب دوسرا
جز ہوتا ہے۔ غیر مجتمع الاجزاء ہے۔ تو اس کا پورا تحقق ہی نہیں۔ یہ کیا تحقق
ہے کہ مٹنے پر متحقق ہو تو یہ حرکت انتہائی عیب ہے اور حس و حرکت ہی کی
جامعیت کا نام حیات ہے۔ تو اگر حی بغیر حیات کے نہ ہو تو وہ ذی حس اور ذی
حرکت ہو جائے اور یہ خاصہ اور خصلت جسم کی ہے اور وہ خالق جسم ہے۔ اس لئے اس میں نہ
حس ہوگا۔ نہ حرکت ہوگی۔ تو ہمارے خیال کے مطابق حیات نہیں ہوگی۔ تو وہ حی نہیں ہوگا۔ تو جس
طرح وہ حی بغیر حیات کے ہے اسی طرح وہ سمیع بغیر سماعت کے ہے۔ بصیر بغیر بصارت
کے ہے اور حسی شہادت آپ کو خواب کی مل گئی کہ ہم یہاں حی ہیں۔ لیکن ہم
حی ہوتے ہیں۔ خواب کے اندر نہ حس ہوتا ہے نہ حرکت ہوتی ہے۔ نہ سماعت
ہوتی ہے نہ بصارت ہوتی ہے۔ حالانکہ وہاں وہ حی ہوتی ہے۔ تو خدا تعالٰی
سمیع و بصیر ہے۔ بغیر سماعت و بصارت کے اس نے نہیں کہا کہ میرے لئے
سماعت و بصارت ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ میرے لئے حیات ہے۔ تو

ہم جتنا اس نے کہا ہم اتنا ہی کہیں گے نہ زیادہ کریں گے نہ کم کریں گے۔ ایسے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب اعرابی نے کہا کہ میں نہ زیادہ کروں گا نہ کم کروں گا کہ فقد افلح اس نے فلاح پائی۔ جو نبیؐ کے قول سے کم کرے نہ زیادہ کرے۔ وہی کامیاب ہے۔ آپ کو بہت تفصیل سے سمجھا دیا اور اگر خدا نے توفیق دی تو آپ کے سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اگر سمجھ میں نہ آیا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ترکیب یہ بتا دی کہ فذکر ربک اذا نسیت۔ جب تم بھول جاؤ اور یاد نہ رہے تو اللہ کا ذکر کرو۔ اللہ تعالیٰ توفیق دیدے گا۔ اور یاد دلا دے گا۔

اللہ تعالیٰ قادر ہے

علمار کا اس مضمون پر اتفاق ہے کہ ہدایت کا لفظ قرآن میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک معنیٰ صرف راستہ دکھانے کے ہیں اور دوسرے معنی ہیں منزلِ مقصود تک پہنچانا۔

صورت یہ ہوئی کہ ایک جگہ اللہ پاک نے فرمایا یہدی من یشاء اللہ بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے اور ایک جگہ یہ فرمایا هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ دونوں راستے دکھائے۔

ایک جگہ فرمایا لا تھدی من احببت تیرے ذمہ ان کی ہدایت نہیں ہے۔

واللہ یہدیٰ من یشاء یہ اس کی ضد ہے۔

تو جس سے محبت کرتا ہے ہدایت نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے۔

معتزلہ اور سنیوں کا مقابلہ ہے۔

(معتزلہ) وہ کہتے ہیں واَمّا ثَمُودُ فَهَدَيْنٰهُمْ ہم نے ثمود کو ہدایت کی فاستحبوا العمیٰ علی الھدیٰ انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہدایت کے معنیٰ منزلِ مقصود تک پہنچانے کے ہوتے تو وہ گمراہی اختیار نہ کرتے۔

ہمارے علمار نے بالاتفاق یہ کہا کہ ہدایت کے چونکہ لغت میں دو معنیٰ آتے ہیں ایک معنیٰ رستہ دکھانا اور دوسرا منزل تک پہنچانا تو جہاں یہ کہا کہ لیس علیک ھداھم تیرے ذمہ ہدایت نہیں ہے۔ وہاں معنیٰ منزلِ مقصود تک پہنچانے کے ہیں۔ واللہ یہدیٰ من یشاء اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جہاں فرمایا۔ وھدینٰہ النجدین

ہم نے ان کو دونوں راستوں کی ہدایت کی وہاں معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ دونوں راستے دکھا دیئے۔ چاہے جس راستے پر چلے اور چاہے جہاں پہنچے۔ قرآن میں جہاں جہاں ہدایت کا لفظ آیا ہے یہی دو معنیٰ مراد ہیں۔ ایک جگہ فرمایا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (وہ سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے اور ایک جگہ فرمایا۔ لیس علیک ھدٰھم (۲) تیری ذمہ ان کی ہدایت نہیں ہے)، تو یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئی۔ تضاد ہو گیا۔ تو علماء نے فرمایا کہ دو طریقے ہیں ایک ہدایت کے معنیٰ منزل مقصود تک پہنچانے کے ہیں اور ایک ہدایت کے معنی راستہ کے دکھانے کے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ راستہ دکھانا ہے۔ خدا کے ذمہ۔ خدا کی جہاں ہدایت آئی ہے وہاں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے ہیں۔ جہاں دو مختلف معنیٰ آئیں گے تو ایک جگہ منزل تک پہنچانے کے اور ایک جگہ راستہ دکھانے کے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے دو معنیٰ ہیں۔ ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ کے معنی یہ ہیں کہ اسے دونوں راستے دکھا دیئے جس راستے پر چلو۔ فسق و فجور کے یا طاعت و نیکی کے۔ دونوں راستے دکھا دیئے۔

اور جہاں یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نہیں کرتا۔ وہاں ہدایت کے معنیٰ یہ ہیں کہ جسے چاہتا ہے جنت کی ہدایت کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے جہنم کی ہدایت کر دیتا ہے۔

آگے جو آیت کا ٹکڑا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے جہنم کے راستے کے کسی شے کی ہدایت نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جنت کے راستے کی ہدایت وہ کرتا ہے۔

تمام علماء میں یہ مشہور ہے۔ جلیل القدر آئمہ میں کہ خدا کی جو ہدایت ہے وہ دو طریقوں کی ہے۔ ایک راستے کا دکھانا اور ایک منزل تک پہنچانا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایت ہے صرف راستہ دکھانا ہے۔ اس پر تمام علماء متفق ہیں۔ اور یہ چیز ہے غلط۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ راستہ دکھائے اور پھر وہ نہ دیکھے۔ یہ بالکل عقل میں نہیں آتا۔ یعنی یہاں بھی جب ہم راستہ دکھاتے ہیں کبھی کوئی مان جاتا اور کبھی کوئی نہیں مانتا۔ ہم اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نبی کامیاب ہو جاتا۔ حق تعالیٰ دکھائے اور پھر نہ دیکھے۔ نہیں وہ لو دکھائے گا۔ تو فوراً دیکھنا پڑے گا اس کو۔ تو یہ کہنا کہ ہم نے ثمود کو ہدایت کی اور ہدایت کے معنیٰ یہ

کہ ہم نے اس کو طریق جنت دکھایا۔ یعنی نیک عمل کا طریقہ یا ایمان کا طریقہ اس کو دکھایا۔ وہ راستہ پھر اس نے ایمان کے طریقے کو چھوڑ کر فسق کے طریقے کو اختیار کر لیا۔ تو خدا دکھاتا تو وہ کب چھوڑتا اس کو۔ تو یہ اصول ہی غلط ہے۔

اب اس کا حل کیا ہے۔ حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو سب کو جنت ہی کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ وہ دوسرا راستہ کفر اور فسق کا دکھاتا ہے۔ پھر تو کوئی چیز ہی باقی نہ بچنے کی۔ اگر وہ دکھا دیگا کفر کا راستہ تو بچاؤ کی کوئی صورت ہی نہیں رہنے کی۔

اللہ تعالیٰ سب کو جنت کا راستہ دکھاتا ہے۔ اب اعتراض کیجئے۔ وہی اعتراض ہوگا جہاں جہنم کا راستہ دکھائے گا۔ کہ ہم نے ثمود کو راستہ دکھایا۔

یہاں ایک دقت ہے۔ بڑی عجیب و غریب حیرت انگیز بات ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جب براہ راست راستہ دکھائے گا وہ جنت ہی کا راستہ دکھائے گا جب غیر کے واسطہ سے دکھائے گا نبی کے واسطہ سے یا کسی اور کے تو اس میں دونوں باتیں ہوں گی۔ قصہ ختم ہو گیا۔ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ کے معنے یہ ہیں۔ ثمود کو ہم نے ہدایت کی بالواسطہ صالح علیہ السلام۔ تو پھر اس نے گمراہی کو اختیار کیا اگر وہ

صالح علیہ السلام کا واسطہ نہ ہوتا اور خدا دکھاتا تو ثمود بھی ہدایت اختیار کر لیتا
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیئے۔ تو دونوں راستے کہاں
سے دکھائے۔ خود تھوڑا ہی دکھائے ہیں نبی کے واسطے سے بتایا ہے کہ یہ کفر ہے، یہ
ایمان ہے۔ یہ ہدایت ہے۔ یہ ضلالت ہے۔ اگر خود دکھا دیتا تو پھر بچنے کی کوئی
صورت ہی نہیں تھی۔ پھر کہا ولٰکن اللہ یھدی من یشاء اس کے کیا معنی ہیں۔ لاتھدی من
احببت تیرے ذمہ ان کی ہدایت فرض نہیں ہے۔ ان کی ہدایت نہیں کر سکتا کا
مطلب یہ ہے کہ جبراً کوئی گودی میں اٹھا کر ان کو ساتھ نہیں لا سکتا۔ بالاختیار نبی بھی
آئے گا۔ یعنی نبی بھی جنت ہی تک پہنچائے گا۔ وہ بھی صرف راستہ نہیں دکھائے گا بلکہ
وہ بھی لے جائے گا۔ اتنا فرق ہے کہ نبی کو حکم یہ ہے کہ جبراً تو ان کو نہیں لا سکتا تو سمجھائے
گا اور اپنے پیچھے پیچھے تو ان کو لئے چلا آئے گا۔ یہ تو مامور ہی اسی بات پر ہے نبی کہ اپنے ساتھ
لے کر اس کو آ۔ تنہا اس کے لئے نہیں۔ بالاختیار وہ بھی جنت ہی میں لے کر جائے گا۔ یعنی
کہا ناکہ خدا تو اس کو جبراً جنت میں لے جائے گا اور نبی جو ہے اختیاراً لے جائیگا فرق ہو گیا
یعنی خدا تعالیٰ جسے ہدایت کریگا براہِ راست وہ ہدایت حقیقی ہے۔ جنت میں لے جائیگا
راستہ نہیں دکھائے گا۔ جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے اس کو ہدایت کی وہاں راستہ
دکھانے کا قصہ آتا ہے وہاں واسطہ آتا ہے نبی کا۔ براہ راست اس نے راستہ نہیں
دکھایا۔ راستہ دکھانے کا کیا فائدہ۔ راستہ تو ہم بھی دکھا دیتے ہیں اور خدا کے جو
نیک بندے ہیں وہ بھی دکھاتے ہیں نبی بھی دکھاتے ہیں۔ سمجھ میں آ گیا نا۔ خدا جو راستہ
دکھائے گا وہ درحقیقت وہاں پہنچا ہی دیگا۔

اور یہاں بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اگر کسی سے کوئی پوچھے کہ کیماڑی کا راستہ
کونسا ہے تو بتا دیں گے کہ اس سمت کو۔ تو ادھر چلا جا۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو اُدھر
جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں ہمیں بھی وہاں جانا ہے ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ تو نبی کا یہ

کام ہے کہ وہ بتاتا ہے۔ میں بھی وہیں کا رہنے والا ہوں۔ وہیں پر جانے والا ہوں
تمہیں جانا ہے تو میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔ زبردستی وہ گودی میں اٹھا کر نہیں لے جائیگا
اور اگر لے جائیں گے تو لوگ کہیں گے تمہیں کیا۔ جائے یا نہ جائے۔ خیال میں آگیا نا
نبی بھی ادھر لے جائے گا۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ وہ جبراً نہیں لے جائے گا اور خدا جو
ہے وہ جبراً طوعاً سب طرح سے لے جائے گا۔ سمجھ میں آگیا نا۔

تو دونوں ہدایتیں مل گئیں۔ تو دونوں ہدایتیں جو یہ ہیں۔ سمجھ میں آگیا نا۔ کہ اللہ
تبارک تعالیٰ جو ہدایت کرتا ہے تو اس ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ براہِ راست اگر
ہدایت کرے گا تو بے شک وہ جنت ہی کی ہدایت ہو گی۔

وہ براہِ راست دعوت دے رہا ہے دارالسلام کی تو ٹھیک ہے۔ اگر اللہ
تبارک وتعالیٰ نبی کے واسطہ سے ہدایت کر رہا ہے۔ آپ سمجھ گئے نا۔ دو ہدایتیں
ہیں۔ ایک نبی کے واسطے سے اور ایک براہِ راست، سمجھ میں آگیا نا اچھی طرح سے۔
نبی نے تو ابوبکر اور ابوجہل دونوں کو ہدایت کی تھی نا۔ دونوں ہدایتوں میں ایک
کامیاب ہوئی ایک میں ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوبکر کو خدا نے براہِ راست
ہدایت کر دی تھی اس وجہ سے ان کی ہدایت میں کامیابی ہوئی۔ اور اسکو ہدایت
نہیں کی تھی اور نبی کے واسطے سے ابوجہل کو بھی ہدایت ہوئی۔ اس کو خدا نے
براہِ راست ہدایت نہیں دی ورنہ وہ بھی آجاتا واللہ یھدی من یشاء ہدایت
دے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی۔ سیدھی سی بات ہے۔ ہدایت
کے معنی یہ ہیں کہ وہ منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے اور جو عام ہدایت ہے
کہ سب کو خدا نے ہدایت کر دی۔

ہم نے راستہ کی سب کو ہدایت کر دی ہے۔ کچھ شکر گذار ہو گئے کچھ
ناسپاس ہو گئے۔ یہاں ہدایت کے معنی یہ ہیں۔ ہم نے بہ واسطہ نبی سب کو

ہدایت کردی۔ عام ہدایت سب کو نبی کے واسطے سے ہے۔ خیال میں آگیا نا۔ اور نبی جو ہدایت کرتا ہے وہ اختیاری طور پر وہ بھی جنت میں لے جانے کے لئے کرتا ہے۔ جبراً نہیں کرتا۔ خیال میں آگیا نا۔ اب اس ہدایت کے بعد خلاف سمت کو بھی چلا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ نہ کہ ہدایت کی جاتی ہے اور خلاف سمت والا بھی ہدایت کر دیتا ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے۔ ادھر اور مخالف سمت کو وہ کہتا ہے کہ تمہاری راہ ادھر ہے۔ اب اس کو یہ حق نہیں ہے کہنے کا کہ تو تو ادھر جا رہا ہے اور مجھے ادھر کا راستہ بتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ دین کی تائید کر دیتا ہے فاسق آدمی سے بھی۔ وہ فاسق خود تو نہیں جاتا دوسرے سے کہتا ہے کہ تو چلا جا سمجھ میں آگیا نا۔ جیسے ابو طالب نے سب کنبہ کو جمع کیا کہ تم سب نبی کو قبول کر لو تو آپؐ نے فرمایا۔ چچا آپ زیادہ مستحق ہیں۔ انہوں نے کہا۔

میں نے آگ کو اختیار کیا عار پہ۔ انکار کیا۔ تو دوسروں سے کہا۔ اپنے بیٹوں سے وہ سب ایمان لے آئے اور وہ خود نہیں لائے ایک آدمی وہیں بیٹھا رہا جما ہوا اور اسے بھی وہیں جانا ہے۔ آگیا خیال میں۔ تو دوسروں کو بھیج رہا ہے آپ نہیں جاتا۔ ابوطالب۔ خیال میں آگیا نا۔

بعض آدمی ایسا ہے کہ خلاف جہت کو جا رہا ہے۔ ایک شخص کافر ہے۔ غیر مسلم ہے اس سے پوچھا جائے کہ اسلام میں سیدھا راستہ کیا ہے! وہ جانتا ہے اس بات کو تو کہے گا کہ تم کلمہ پڑھو، نماز پڑھو، روزہ رکھو۔ عیسائی بھی یہی بتائے گا۔ تو دین اسلام میں سیدھا راستہ کیا ہے تو غیر مسلم جو اس مذہب سے واقف ہے۔ تو وہ ضرور بتائے گا۔ غلط نہیں بتائے گا۔ اس سے اگر یہ کہے گا کہ تو خود کیوں نہیں جاتا تو وہ کہے گا میرا گھر اس سمت نہیں ہے۔ میرا گھر اس سمت ہے

مجھے ادھر جانا ہے۔

آج کل جو درس ہمارے ہاں چل رہا ہے۔ اس کے متعلق برابر بحث چلی آرہی ہے اور ایک گروہ کہتا ہے قادر ہے۔ غیر قادر ہے۔ ان دونوں گروہوں کے دلائل اور تفسیر سب مفصل پہلے آچکی اور بیان کر چکا۔ اب میں ذاتی طور پر اپنی دلیل بیان کرتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قادر ہونے کی۔

تو دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک وہی ہے اور دوسرا کسی بھی وہی ہے تقریباً۔

کسبی تو یہ ہے۔ یہ انگلی ہے۔ ساکن ہے یہ انگلی۔ اب ہم نے یہ ہلائی متحرک ہوگئی۔ خیال میں آگیا نا۔ پھر ساکن ہوگئی۔ حرکت کے بعد سکون آگیا اور رعشہ کی جو حرکت ہے وہ حرکت ہی رہے گی۔ حرکت کے خلاف سکون کبھی نہیں ہونے کا۔ تو اس حرکت کو غیر اختیاری کہیں گے۔ ہمارے شعور میں رواج میں یہی بات ہے نا۔ ٹھیک ہے۔

تو قدرت کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ قدرت کے معنی یہ ہیں کہ فعل اور ترک فعل دونوں مساوی ہوں یہ نہ ہو کہ ایک ہی چیز ہو فعل ہی فعل ہو ترک فعل نہ ہو سکے۔ ان دونوں گروہوں نے جو طریقہ دلیل کا اختیار کیا ہے وہ بھی غلط ہے یعنی دلائل تو ہیں ہی غلط لیکن جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بھی غلط ہے۔

علمائے متکلمین نے جو خدا کو قادر مانتے ہیں یہ بیان کیا ہے کہ عالم حادث ہے۔ پہلے نہیں تھا پھر ہوا جو ایسا فعل کرے جو پہلے نہ ہو پھر ہو وہ قادر ہوگا اور انہوں نے عدم سے استدلال کیا ہے عدم قدرت پر کہ جو فعل دائم ہو اس کا فاعل قادر نہیں ہوگا۔ جیسے سورج ہے اس کا فعل گرمی اور روشنی پہنچانا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کبھی روشنی پہنچائے کبھی نہ پہنچائے وہ غیر قادر ہے اور متکلمین نے یہ کہا کہ اس کا فعل

حادث ہے اس لئے وہ قادر ہے۔ اور یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ شے کا حادث ہونا قدرت پر دلالت نہیں کرتا۔ پتھر اوپر سے آگرے تو نئی بات حادث ہوگئی تو پتھر کا یہ فعل اس کی قدرت پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ غیر اختیاری فعل ہے گو حادث ہے۔ اسی طرح انہوں نے دوام کو اختیار کیا ہے عدم قدرت پر۔ گولہ اوپر سے گرے یہ حادث ہے مگر قدرت پر دلالت نہیں کرتا۔ اور نہ دوام جو ہے وہ عدم قدرت پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس کی ذات وصفات سب دائم ہیں۔ اس کا دوام یہ نہیں چاہتا کہ فعل دائم ہو۔ اس کی ذات دائم ہے۔ تو اگر فعل دائم ہوگا تو اس کے فعل کے بغیر جب ہم فعل سے قطع نظر کریں گے تو وہ ناقص ہو جائے گا۔ جس طرح آگ بغیر حرارت کے ناقص ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے فعل اور ترک فعل دونوں برابر ہیں اور جس میں فعل اور ترک فعل دونوں موجود ہوں وہ قادر ہے۔ اللہ پاک نے یہاں جتنی چیزیں بنائی ہیں ان میں دونوں صورتیں ظاہر ہیں۔ مثلاً جب حرکت ہو رہی ہے تو اس نے سکون کو ترک کر رکھا ہے اور جب سکون ہو رہا ہے اسوقت حرکت کا فعل ترک ہو رہا ہے۔ موت کے وقت حیات کو ترک کر رکھا ہے۔ حیات کے وقت موت کو ترک کر رکھا ہے۔ جس وقت اوپر کا حصہ بن رہا ہے نیچے کا حصہ ترک ہو رہا ہے جس وقت نیچے کا حصہ بن رہا ہے اوپر کا حصہ ترک ہو رہا ہے۔ تو اللہ کی ہر فعل کے اندر فعل اور ترک دونوں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ تارک اور فاعل ہے۔ اور جو فاعل اور تارک ہے وہی قادر ہے تو اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ اس سے زیادہ واضح دلیل نہیں ہو سکتی کہ اللہ فعل بھی کر رہا ہے اور ترک فعل بھی کر رہا ہے۔ حیات کے وقت ممات نہیں ہوگی اور ممات کے وقت حیات نہیں ہوگی۔ اللہ پاک دونوں متضاد چیزوں کا خالق ہے جو متضاد چیزوں کا خالق ہے وہ قادر ہی ہوگا۔ غیر قادر نہیں ہو سکتا اور یہ دلیل میرے اس طرح سمجھ میں آئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فرمایا

کل شیٔ خلقنا زوجین ہم نے ہر شے کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے کل شیٔ
ہر شے کل کا لفظ بولا کہ جس شے کو بھی میں نے پیدا کیا اس میں تعدد اور تزوج موجود
ہے۔ تو تعدد اور تضاد دلیل ہے اس کی قدرت کی۔ اگر قدرت نہ ہوتی تو کثرت
اور تزوج نہ ہوتا۔ ایک ہی قسم کی چیز ہوتی۔ ہر شے کو دیکھ جایئے کثرت اور اختلاف
ہوگا وحدت کہیں نہیں ملیگی کوئی شے واحد نہیں ہوگی۔ کیونکہ واحد میں تو قابلیت
ہی نہیں ہے ایجاد کی۔ اگر واحد موثر ہوگا۔ ایجاد میں تو ایجاد اس کو لازم ہوگی
اور لازم ہوتے ہی وہ کثرت بن جائے گا وحدت نہیں رہے گی۔ تو وہ وحدہٗ لاشریک
بالکل واحد ہونے کی حیثیت سے خالق نہیں ہے۔ خدا کی ذات پاک جو ہے وہ موثر
نہیں ہے۔ وہ پاک ہے تاثیر سے۔ وہ تو عیب ہے۔ تو اب کثرت ہونی چاہیئے تو
وہ جو زیادت ہے۔ وہ کیا شے ہے وہ ہے اس کی مشیت۔ جس زیادت کی بنا
پر یہ فعل ہو رہا ہے اسی کا نام مشیت ہے۔ وہ واحد صاحب مشیت جو ہے وہ ہے
فاعل ساری کائنات کا۔ یہ اس کی مشیت جو ہے اسی کا نام قدرت ہے۔ بڑی عجیب
بات ہے۔ جب تک مشیت نہ ہو فعل ہی نہیں ہوگا۔ واحد میں تو فعل کی قابلیت ہی
نہیں ہے۔ تو ساری کائنات جو ہے وہ وابستہ ہوگئی مشیت سے تو اب کثرت ہوگئی
ایک واحد اور ایک مشیت تو واحد مع مشیت کے موثر ہے۔ تنہا واحد موثر نہیں ہے
اگر موثر ہوتا تو وحدت سے یہ کثرت جدا نہ ہوتی۔ وحدت کا جو اثر ہے اگر اس اثر
کو کاٹ دیتے تو واحد واحد نہ رہتا کثیر ہو جاتا جیسے سورج ہے۔ اس کا اثر ہے روشنی
اگر روشنی کو کاٹ دے گی تو سورج سورج نہیں رہے گا۔ اور وحدت ازلی ابدی چیز ہے
اگر عالم اس کا اثر ہے اور اس کو کاٹ دیں گے تو سورج سورج نہیں رہے گا اور وحدت
ازلی ابدی چیز ہے اگر عالم اس کا اثر ہوگا۔ اور اس کو (عالم کو) اگر کاٹ دیں گے تو جس
طرح سورج لاشے محض ہو گیا اسی طرح واحد بھی لاشے محض ہو جائے گا اس لئے یہ وحدت

کا اثر ہے ہی نہیں۔ واحد موثر ہے ہی نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی چیز شامل نہ ہو
اس میں بڑا ڈر لگتا ہے کہ شرک ہے نہیں اس میں مشیت شریک ہے۔ جب تک
مشیت شامل ذات نہیں ہوگی اس کا اثر ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جب مشیت ہوگئی اسی کا نام
قدرت ہے تو وہ قادر محض ہوگیا۔ یعنی جب تک مشیت نہیں ہوگی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہ
ہوسکتا ہے کہ عالم سے ابد تک نہ ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ عالم کو ازل سے ابد تک پیدا ہی نہ کرتا
اور اگر ذات موثر ہوتی تو وہاں پیدا کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا وہ تو ہوتا ہی۔ تو معلوم
ہوا کہ ایک اور شے ملی اس کے ساتھ آکر وہ کون سی شے ہے وہ کوئی شریک نہیں ہے
بلکہ وہ اس کی مشیت اس کی قدرت اور اس کا ارادہ ہے اس مشیت کی بناء پر یہ پیدا
ہوا۔ اسی وجہ سے یہ عالم اتنا کمزور ہے۔ اس کی ذات میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ اس
میں کوئی قابلیت نہیں ہے محض اس کی مشیت کی فرع ہے۔ جبتک اس کی مشیت ہے
یہ ہے جب اس کی مشیت ہٹ جائے یہ لاشے محض ہو جائے اس کی مثال ایسی ہے کہ
خیال کیجئے کہ دس گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ خیال میں دوڑ گئے۔ اب ان تیز سے تیز
شے سے بھی تیز دوڑائیے۔ دوڑ گئے ایک سیکنڈ میں اب ان کو آگے پیچھے کر دیجئے۔ ہوگئے
جب تک آپ خیال کرتے رہیں گے یہ دوڑتے رہیں گے۔ آپ کے خیال ہٹاتے ہی اب
کہاں گئے وہ گھوڑے۔ بس یہی حال اس عالم کا ہے۔ جب تک اس کی مشیت ہے یہ
عالم نظر آرہا ہے۔ یہ چاند یہ سورج یہ آسمان یہ زمین یہ تارے اس کی مشیت ہٹ جائے
گی کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ابھی میں بات کر رہا ہوں اتنی باریک باتیں بیان کر رہا ہوں۔
بیان بند ہوتے ہی آپ سب زمین میں رکھ آئیں گے۔ کہاں گئیں وہ باتیں۔ کچھ دن بعد
سب راکھ ہوجائے گا پتہ بھی نہیں چلے گا کچھ بھی نہیں رہے گا۔ ارے کچھ ہو تو رہے بھی کچھ بھی
نہیں ہے۔ محض اسکی مشیت ہے۔ ان سے ذمہ لے لیا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ شے
شے ہے بس اس بنا پہ شے ہے۔ اس نے کہد یا تا کہ اولیہ یکف بربک انہ علی کل شیٔ شہید

کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر شے کی شہادت دے رہا ہے۔ اگر وہ ہر شے کی مشیت کی
شہادت بند دے کلمح البصر او ھو اقرب پلک جھپکتے ہی یا اس سے بھی کم وقت میں
ختم کر دیگا۔ تو کیا چیز ہے۔ اس کے اندر معلوم ہوا کہ کچھ ہے ہی نہیں سب اکڑ رہے
ہیں۔ ہم سورج ہم چاند ہم زمین ہم نیک ہم بد ہم فلاں ہم فلان یہ سب جو دعویٰ
کر رہے ہیں۔ سب اس کی مشیت پر اس کی مشیت ہٹی اور سب لا دعویٰ ہیں کہیں بھی
پتہ نہیں چلے گا۔ اتنا بڑا اٹرا آدمی آیا کہاں ہیں وہ کہیں پتہ چلتا ہے کیا حقیقت
ہے اس عالم کی۔ جب یہ ایسی شے ہے تو یہ کس چیز سے بنے گی کسی شے سے نہیں بنے
گی مجرد ارادہ سے بنے گی۔ محض اختراع ہے محض فرض ہے۔ فرض کر لیا کہ ایسا ہو
وہ ہو گیا۔ یعنی اس کے وجود کا کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ کوئی تقاضہ نہیں ہے اسکے
وجود کا۔ اگر وہ چاہتا نہ بناتا اس کو ازل سے ابد تک بس ایک ہی ذات ہے وہ
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ازل سے ابد تک یہ جتنی چیزیں ہیں وہ اختراع ہیں
اور اختراع ہو نہیں سکتا بغیر مشیت کے ورنہ اگر ذاتی چیزیں ہوتیں تو مستقل ہوتیں
ان میں استقلال ہوتا محض ذاتی اعتبار پر موقوف ہیں اور اسی اعتبار کا نام مشیت
ہے۔ ایجاد ہے۔ قدرت ہے۔ کسی مادہ سے نہیں بنے ہیں۔ دیکھئے مرکبات میں تحلیل
ہوتے ہوتے اجزاء پر آئیں گے ان اجزاء کے لئے کوئی مادہ نہ رہا۔ یہ اجزاء کاہے
بنے۔ آگے کچھ ہے نہیں جب کوئی مادہ نہ رہا تو اب وہ کاہے سے بنے وہ محض ارادہ
سے بنے مشیت سے بنے۔ پہلے ارادے سے مجردات بنے پھر انہیں سے ترتیب دیکر
مرکبات بنے۔ سب سے پہلے قلم کو بنایا اس کا نام رکھا عقل اول ما خلق اللّٰہ القلم
اسے کہا لکھ۔ اس نے کہا کیا لکھوں قَالَ اِنَّ مَا کُتِبَ کہا
اکتب ما ھو کائن الی یوم القیامہ لکھ وہ سب جو قیامت تک ہونے والا ہے۔ تو
یہ تحریر تقریر اختیاری فعل ہوا غیر اختیاری ہوا۔ اختیار ہی سے ہوا نا۔ اس کا نام افعل

نے رکھا ہے عقلِ اوّل اس سے عقلِ ثانی پیدا کی فلک اول پیدا کیا۔ یہ گھڑی بات سارے فلسفہ کی بنیاد اسی طرح پر ہے۔ سب غلط ہے وہ قادر ہے جو چاہے کرے اور قادر مطلق ہے۔ مطلق کے کیا معنی۔ مطلق کی ضد ہے مقید۔ وہ قادر مطلق ہے اور ایک قادر مقید ہے وہ ہم ہیں۔ قادر ہم بھی ہیں۔ مگر مقید وہ قید کیا ہے وہ قید یہ ہے کہ کوئی بیرونی سبب ہوگا۔ وہ ہماری قدرت کو حرکت میں لاتے گا کوئی سبب ہوگا وہ سکون کی طرف لائے گا تو قادر مطلق کے کیا معنی کہ بے سبب فعل ہوگا جو چاہے کرے اور جو چاہا وہ ہوگا۔ یہ معنی ہیں قادر مطلق کے بلا وجہ کے فعل کرے۔ بلا وجہ کے ترک فعل کرے۔ رحیم مطلق کے یہ معنی ہیں کہ وہ بغیر کسی قید کے رحیم ہے۔ ہم تو اگر رحم کریں فائدہ پہنچائیں تب رحیم کہلائیں گے۔ مگر وہ سکھ دے تب بھی رحیم ہے اور دکھ دے تب بھی رحیم ہے۔ اسی طرح وہ رحیم مطلق ہے کہ دکھ پہنچا کر بھی وہ رحیم ہے۔ اس سے انکار ہو نہیں سکتا کیونکہ یہاں دکھ اور سکھ دونوں موجود ہیں۔ اگر اس نے نہیں دکھ کسی دوسرے نے پیدا کیا ہے تو بتاؤ وہ اس دکھ پیدا کرنے والے کو روکنے پر قادر ہے یا نہیں اگر کہو نہیں تو وہ عاجز ہوا خدا بننے کے لائق نہیں رہا۔ اگر کہو ہاں وہ روک سکتا ہے۔ اور پھر نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ اسی کے اشارہ اور منشار سے ہو رہا ہے تو خیر وشر کا خالق ایک ہی رہا خیرہٖ وشرہٖ کل من اللہ تعالیٰ یہی معنی اس کے رحیم مطلق ہونے کے ہیں۔ ایک فرقہ براہمہ کا ہندوستان میں ہے وہ ماتھے پر تین ٹیکے لگاتا ہے وہ وحدانیت کا ایسا ہی قائل ہے جیسے کہ ہم۔ مگر وہ نبوت کا منکر ہے وہ کہتا ہے کہ خدا رحیم ہے اور رحیم کی شان کے یہ منافی ہے کہ رسول بھیجے کیونکہ جب رسول آئے گا تو دو فرقے ہو جائیں گے۔ ایک اس کو قبول کریگا اور ایک اس کا انکار کریگا اور جہنمی ہو جائے گا۔ تو یہ رحیم کی رحمت کے منافی ہے کہ

بندوں کو جہنم میں بھیجے۔ اگر نبی نہ آتا تو سارا جہان جہنم سے بچ جاتا۔ نبی کا آنا جہنم کا سبب بنا۔ وماکنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا ۔ ہم عذاب نہیں دیتے جبتک رسول نہیں بھیجتے۔ تو نبی بندوں کے جہنم میں جانے کا سبب بنا۔ تو جو جہنم کا سبب بنے وہ نبی ہو نہیں سکتا لہذا اللہ نبی نہیں بھیجتا اور یہ بات عقل کو اچھی لگتی ہے کہ سارا جہاں اگر جہنم سے بچ جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تھوڑی سی جماعت جنت میں جائے۔ سب اگر دکھ سے بچ جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے اس سے کہ تھوڑے سے آدمیوں کو تو سکھ ملے اور باقی کو دکھ۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ رحیم وکریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی ایسا فعل کرے جو لوگوں کے جہنم میں جانے کا سبب بنے۔ بڑا باریک مغالطہ ہے وہ اتنی سی بات نہیں سمجھے کہ جو موت دے رہا ہے کیا یہ اس کی شان سے بعید نہیں ہے۔ یہ جو زندگی میں دکھ دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ موت کی تلخی اس کو چکھنی پڑتی ہے۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ کرتا۔ تو جو موت کی تکلیف پیدا کر کے دے رہا ہے وہ عذاب کی تکلیف بھی دیدیگا اس میں کیا ڈر ہے۔ جب اس میں ڈر نہیں تو اس میں کیا ڈر ہے جو موت کی تکلیف دے سکتا ہے وہ عذاب کی تکلیف بھی دے سکتا ہے۔ تو رحمت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ پیدا ہی نہ کرتا کہ سب تلخی موت اور تلخی عذاب سے بچ جاتے۔ جس طرح اس نے یہاں موت دیدی وہاں منکرین کو عذاب دیدیا۔ اور وہ تو قادر ہے وہ یہ بھی کرسکتا تھا کہ سب کو جنت دیدیتا دنیا میں بھیجنے کی ضرورت ہی نہ تھی تو اس نے کیا تو ایسا ہی تھا یہ تو انسان کی اپنی غلطی ہوئی جس کا خمیازہ بھگت رہا ہے اس کی نیت تو فائدہ پہنچانے ہی کی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک راز کی بات آپ سمجھ لیں کہ یہاں ذرائع موجود ہیں۔ ہر شے کے ذرائع ہیں وہ ذرائع مہیا ہوتے چلے جائیں گے تو آخر وہ شے مکمل ہو جائیگی جب یہاں ذرائع سے پیدا کر دیا تو وہاں بھی نیکی و بدی ایمان و کفر کے ذریعہ جنت اور دوزخ پیدا کر دی اس میں کیا بات ہے۔ بے شک وہ اسبابات پر قادر ہے کہ

بلا ذریعہ شے مہیا کر دے۔ مگر جس طرح وہ یہاں ذریعہ سے مہیا کر رہا ہے وہاں بھی اسی طرح ذریعہ سے مہیا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

گذارش

زیرِ نظر کتاب کی افادیت کا اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہو گا حضرت علامہؒ کے بیش بہا مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ ٹیپ ریکارڈ کی شکل میں بحمد اللہ محفوظ ہے۔ اس ذخیرے میں متعدد عنوانات پر بحث کی گئی ہے اور بڑے نادر مضامین آ گئے ہیں۔ یہ ذخیرہ حاجی محمد صدیق صاحب طیبی سینٹر شاہراہ لیاقت کراچی کے پاس محفوظ ہے۔ اور اس کی مجموعی تعداد ۳۰۰ ٹیپوں پر مشتمل ہے۔ اہلِ خیر اور اہلِ نظر حضرات جن کو دینی علوم کی اشاعت کا ذوق ہو، درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان بیش بہا مضامین کی اشاعت کا انتظام اپنے ذمے لیں۔ اور ثوابِ دارین حاصل کریں۔ قوم کی بڑی بدقسمتی ہو گی کہ اگر ایسے فاضل علامہ کے افکار اور خیالات عوام الناس تک نہ پہنچ سکیں اور یہ ذخیرہ تلف ہو جائے۔ مولانا موصوف کی حیثیت مسلمانانِ عالم کے لئے فرد واحد تھی، جو اب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ صاحبِ ذوق حضرات متوجہ ہوں گے اور اس عظیم اور بیش بہا علم کی قدر کریں گے۔ (ادارہ)

کوئی شخص بھی مجھ سے کتابیں مفت حاصل کر کے فروخت کرتا ہے تو اس کا وبال اس کی گردن پر ہو گا۔ (سید شوکت علی)

نفس کو پہچاننا

اب مضمون یہاں تک آپہنچا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے نفس کو پہچانے۔

پہلا مسئلہ نفس کو پہچاننے کا یہ ہے: فلینظر الانسان مما خلق۔

انسان کو چاہیئے کہ اس پر غور کرے کہ اس کو کس شے سے پیدا کیا گیا ہے؟ اس پر دونوں گروہ غور کر رہے ہیں۔ ارباب کشف اور ارباب استدلال۔ ارباب کشف کے یہاں تو صرف یہی ایک مسئلہ ہے اور وہ روحانی لوگ زبان سے نہیں بلکہ حال سے بتلاتے ہیں اور ارباب استدلال اس کو قال سے اور زبان سے بتاتے ہیں۔ انسان مکلف حال کے ساتھ نہیں ہے بلکہ قال کے ساتھ مکلف ہے۔ کیونکہ سارا عالم مکلف ہے قرآن اور حدیث پر ایمان لانے پر۔ تو سارا عالم تو اہلِ باطن اور اہلِ حال میں سے نہیں ہو سکتا تو تعلیم جو ہوگی وہ ان کے مذاق اور شعور کے مطابق ہوگی۔ تو استدلال سے سمجھنا چاہیئے اور قرآن شریف تمام استدلال سے بھرا ہوا ہے تاکہ ہر شخص اس کو سمجھ لے اور کسی کو کوئی عذر باقی نہ رہے۔

پہلے ایک بات آپ سمجھ لیں کہ انسان کسی شے کی حقیقت کو نہیں جانتا۔ بے جانے یہ سمجھ رہا ہے کہ میں جانتا ہوں۔ ایک شے سے دوسری شے میں امتیاز تو کرتا ہے کہ پانی ہوا نہیں ہے۔ ہوا پہاڑ نہیں ہے۔ پہاڑ دریا نہیں ہے۔ یہ تمیز تو کرتا ہے اور یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ بدیہی علم ہے۔ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ جو سوال کرتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسکو جس شے کی تلاش ہے وہ اس کے علاوہ کوئی اور شے ہے۔

بچہ برابر سوال کرتا ہے "یہ کیا ہے ؟ - یہ کون ہے ؟ اس سے پتہ چل گیا کہ اس کا سوال کرنا جائز ہے اور اس کو حقیقت کا علم نہیں ہے ۔ علماء اپنی اپنی عقل کے مطابق بیان کر دیتے ہیں ۔ یہ ہے ۔ یہ ہے ۔ یہ ہے ۔" وہ جب پوچھتا ہے کہ "یہ کیا ہے"؟ تو "یہ" کو تو وہ جانتا ہے ورنہ وہ اشارہ نہ کرتا ۔ اب جو وہ "یہ کیا ہے کا سوال کر رہا ہے تو "یہ" کے اندر کوئی اور شے ہے جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اور جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اس میں سارا عالم حیران ہے ۔

کس سے میں جا کے پوچھوں تحقیق حال تیرا
چُپ ہیں یقین والے ، گم ہیں گمان والے

جن کو یقین ہو گیا وہ تو چُپ ہو گئے کچھ بولتے ہی نہیں اور جو استدلال والے ہیں وہ اپنی اپنی بکواس کرتے رہتے ہیں ۔ تو اب آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ دقت کیا ہے ۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا ۔ پانی کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ ۔ یہ کیا ہے ۔ تو آپ بتائیں گے کہ یہ دو گیسوں سے مل کر بنا ہے ۔ اب ان گیسوں کے متعلق سوال ہو گا کہ ۔ یہ کیا ہیں ؟ تو یہ سلسلہ لا انتہا ہو جائے گا یا یہ کسی جگہ ٹھہر جائے گا اور وہاں سے یہ جانے کہہ دے گا کہ ۔ ہاں میں جانتا ہوں ۔ جہاں جا کر وہ ٹھہر جاتا ہے ۔ وہی تو ہے اس کا خالق ۔ تو اصل میں تو حقیقت وہ ہے اور ان اشیاء میں کوئی حقیقت نہیں ہے اگر حقیقت ہوتی تو بتایا جاتا کہ یہ ہے حقیقت ۔

حقیقت کے معنی حکماء یہ بتاتے ہیں کہ حقیقت یا ماہیت وہ شے ہے جس کی وجہ سے وہ شئے شے ہے جس شے کی وجہ سے "وہ" شئے "وہ شے" ہے ۔ اس کا نام ماہیت اور حقیقت ہے اسی کی تو تلاش برسوں سے ہو رہی ہے ۔ بچہ شروع ہی سے انگلی اٹھا کر دریافت کرتا ہے کہ "یہ کیا ہے"؟ یہ سوال اس کی فطرت میں داخل ہے ۔ وہ اپنے رب کی تلاش

کرتا ہے۔ جب اس کو جواب نہیں ملتا تو کوئی کہتا ہے تارہ ہے۔ کسی نے سورج کو کہا۔ کسی نے انسان کے خرقِ عادت فعل کو دیکھ کر اس کو خدا سمجھا۔ کسی نے درخت کو کسی نے آگ کو خدا سمجھا کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے مٹی کا ڈھیر ہی رکھ لیا کہ اور نہیں تو چلو یہی سہی۔ تو اصل میں بُت پرستی کا رواج یوں ہی ہوا کہ سب اپنے رب کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ خدا پرستی کے طالب تھے۔ جب عام لوگوں کو کچھ نہیں ملا تو مٹی کا ڈھیر ہی سہی۔ کچھ تو ہونا ہی چاہیئے۔ تو کسی انسان کی کسی شے کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے تو اس کو پہچاننے کا کیا۔ بعض لوگوں نے انسان کی حقیقت روح بتائی ہے۔ ایک گروہ کہتا کہ روح ہمیشہ سے ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب بچہ چار ماہ کا ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تب رُوح پیدا ہوتی ہے تو روح کا کچھ پتہ نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان مر جائے گا روح باقی رہے گی۔ انسان مکلّف ہے۔ روح مکلّف نہیں ہے تو روح انسان نہ ہوئی اور نہ جسم انسان ہے۔ کیوں کہ جسم کو بھی مسالے لگا کر ہزاروں برس محفوظ رکھا جاتا ہے مگر انسان نہیں ہوتا۔ ترکیب افراد بھی انسان نہیں ہے۔ کیونکہ ترکیب بھی مسالے سے محفوظ کی ہوئی نعش میں باقی رہتی ہے اسی طرح ہر ہر شے کو دیکھتے جایئے۔ مادّیت دوسری جگہ موجود ہے۔ عقل و شعور ملائکہ میں بہت زیادہ ہے۔ حرکت، غصہ وغیرہ چیزیں دیگر جانوروں میں موجود ہیں۔ یہ انسان نہیں۔ انسان وہ شے ہوگی جو انسان میں ہو دوسری جگہ نہ ملے۔ اب جملہ مشترک اشیاء کو نکالتے چلے جایئے۔ جو شے دوسری جگہ نہیں ملتی اور صرف انسان میں ملتی ہے۔ وہ ہے اختیار ہے۔ یہ انسان کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔ یہ اختیار ہی انسان ہے۔ یہی مکلف ہے اگر اختیار جاتا رہتے تکلیف خود بخود ساقط ہو جاتی ہے۔ بیمار ہے، معذور ہے۔ پاگل ہے،

مردہ ہے۔ جس حدتک اختیار کم ہوتا جاتا ہے اس حدتک تکلیف بھی ساقط ہوتی جاتی ہے۔ مجتہدین جو اجتہاد کرتے ہیں ان کا طریقہ بھی یہی ہے۔ مثلاً شراب حرام ہے تو وجہ حرمت کیا شے ہے تو اس کے ہر ہر جیز کی تحلیل کرتے ہیں۔ اس میں پانی ہے یہ حرام نہیں ہے۔ رنگ، یہ بھی حرام نہیں ہے۔ سیّال پن یہ بھی حرام نہیں۔ انگور، جو گیہوں، یہ بھی حرام نہیں۔ اسی طرح کوئی شے حرام نہیں سوائے ایک شے کے وہ ہے نشہ جو اور حلال اشیاء میں نہیں ملتا۔ تو معلوم ہوا کہ وجہ حُرمت نشہ ہے۔ تو اب جتنی بھی نشہ آور اشیاء ہوں گی۔ مجتہد ان سب کو حرام قرار دیدیتا ہے۔ اس کے فتوے کا یہ فارمولا بن گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے "رجوع" فرمایا۔ کہ جب تم کو قرآن حدیث اور اجماع سے کسی معاملے کا فیصلہ نہ مل سکے تو تم قرآن و حدیث سے رجوع کرو۔

پہلے تو حکم دیا "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" اللہ کی اطاعت کرو۔ اس میں کوئی شرط نہیں ہے، کہ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بس اطاعت کرو۔ اللہ پاک کی اور رسول کی اطاعت کرو اس میں بھی کوئی شرط نہیں۔ پہلے کی طرح یہ بھی غیر مشروط ہے۔ اس میں یہ قید نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے مطابق ہو تو اطاعت کرو اور مطابق نہ ہو تو مت کرو۔ اطاعت ذی شعور کے ذات کی نہیں ہوتی بلکہ اسکے قول اور امر کی ہوتی ہے سورج کی روشنی سورج کی ذات کی اطاعت کر رہی ہے۔ جب تک سورج رہے گا۔ یہ بھی رہے گی۔ جب سورج چلا جائے گا یہ بھی اسکے ساتھ وہیں چلی جائیگی جہاں سورج جائیگا۔ سورج بے شعور ہے۔ تو یہ اس کی ذات کی اطاعت کر رہی ہے۔ اطاعت کے معنی ہیں امتثال امر جس طرح حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح بجا لانے کا نام اطاعت ہے۔

اطیعوا اللہ کے معنی ہیں اطیعوا کلام اللہ یعنی جو مسئلہ دریافت کرنا ہو قرآن سے

دیکھو کوئی شرط نہیں ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے و اطیعوا الرسول اور رسول کی اطاعت کرو۔ یہ بھی غیر مشروط ہے۔ اس میں کلام اللہ کے مطابق ہونے کی بھی شرط نہیں ہے۔ رسول کے کلام یعنی حدیث کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت فرض ہے اور رسول ہے نہیں تو اب اس کی اطاعت کیا ہوگی۔ اس کے قول کی، اس کے حکم کی، اس کی بات کی اطاعت ہوگی۔ غیر مشروط۔ رسول سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ بھلا حکم جو ہے کیا وہ خدا کا حکم ہے؟ یہ پوچھتے ہی کافر ہو جائے گا۔ وہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہی خدا کا حکم ہے۔ یہ طے کر دیا پہلے ہی۔ تو اطیعوا اللہ کے معنی ہوئے اطیعوا القرآن اور اطیعوا الرسول۔

اطیعوا الرسول کے معنی ہوئے۔ اطیعوا الحدیث۔ والوا الامر منکم اور اپنے میں الوالامر کی اطاعت کر۔ یہ جو اکثر لوگ کہتے رہتے ہیں کہ حاکم وقت کی اطاعت کرو۔ اور اس آیت کے یہ معنی بتاتے ہیں غلط ہے دلیل آگے بیان کر دوں گا پہلے یہ سمجھ لیں کہ اطیعوا الرسول پر اکتفا نہیں بلکہ الوالامر کا عطف کر دیا رسول اور الوالامر کی اطاعت کرو۔ الوالامر کو رسول سے ملا دیا۔ تو ان کی اطاعت بھی غیر مشروط ہے اور فرض ہے۔ ان کے علاوہ جتنی اطاعتیں ہیں سب مشروط ہیں ان میں شرط لگی ہوتی ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکام کے مطابق ہو تو اس پر عمل کرو ورنہ نہیں تو گویا یہ ان کی نہیں بلکہ خدا اور رسول ہی کی اطاعت ہوئی۔ ماں باپ کی اطاعت کرو اور اگر وہ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی بات کہیں۔ تو فلا تطعہما ان کی اطاعت مت کرو، تو خلیفہ کی امیر کی، امام کی، والدین کی، علماء کی، مجتہدین کی، بزرگانِ دین کی، قرآن و حدیث کے خلاف اطاعت نہیں ہوگی۔ اگر وہ قرآن اور

حدیث کے خلاف حکم دیں تو وہ ماننے کے قابل نہیں ہے۔ تو ان کی اطاعت کہاں رہی
مطاع وہ نہ ہوئے۔ مطاع تو قرآن و حدیث ہوئے۔ الوالامر کی اطاعت بھی اسی
طرح فرض ہے جس طرح خدا کی اور رسول کی اطاعت فرض ہے۔ اب الوالامر منکم کے
کیا معنے۔ منکم کے معنی تم میں سے۔ الوالامر۔ الو جمع ہے۔ ذوی۔ خلافِ قیاس
کیونکہ عربی زبان میں ہر چیز قیاس کے مطابق آتی ہے۔ کہیں کہیں خلافِ قیاس ہے
ایک آدھ لفظ آ گیا ہے۔ ایسی خلافِ قیاس مشتقات ہر زبان میں ہوتے ہیں جیسے
انگریزی میں GO اور WENT۔ الوالعلم معنی ذوی العلم علم والے۔ تو
الوالامر جمع کا صیغہ ہے، واحد اس میں سے خارج ہو گیا۔ یعنی الوالامر کی جو جماعت
ہے اس کی اطاعت کرو۔ امام۔ خلیفہ۔ پیر ایک ہی ہو گا وہ الوالامر نہیں ہے۔
جماعت کی اطاعت فرض ہے خواہ اس جماعت میں امام یا خلیفہ یا اور کوئی شامل
ہو یا نہ ہو۔ اب رہ گیا امر۔ تو امر کے کیا معنی۔ امرھم شوریٰ بینھم ط
مومنین کا امر کیا ہے۔ ان کا بیٹھ کر آپس میں مشورہ کرنا۔ صاحبِ عقل لوگ اور
اہلِ علم آپس میں متفق ہو کر جو فیصلہ کر لیں اس پر عمل کرو اسی کا نام اجماع ہے یعنی
اجماع کی اطاعت کرو۔ میں نے دیکھا بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ یہ کیا اللہ کیلئے
۲½ فیصد زکوٰۃ اور خود کے لئے ۹۷½ فیصد بلکہ اللہ کا ۹۷½ فیصد اور ۲½
فیصد اپنا ہونا چاہیئے۔ تو یہ بات دل کو اچھی تو لگتی ہے مگر یہ شبہ شیطانی ہے
کیونکہ اجماع کے خلاف ہے اور درست نہیں ہے۔ میں دلیل سے ثابت کر دیتا کہ
کم کرنے میں اتنی برائی نہیں ہے جتنا بڑھانے میں ہے اور مقرر حد سے بڑھنا زیادہ
ثواب کا مستحق نہیں ہے بلکہ موجب عذاب ہے۔ بہت بڑی بات ہے۔ جس دن شبہ ہو کہ

چاند نہیں ہوا اس دن کا روزہ رکھنا ایسا ہے جیسے رسول کی نافرمانی کی۔ حج میں کنکری مارنے کے بجائے پتھر یا جوتے مارے تو عذاب لیکر آئے گا۔ عبادت بھی ادا نہیں ہوگی۔ نہ زیادہ نہ کم بالکل نہیں ہوگی۔ پس جو فرمایا، جتنا فرمایا جس طرح فرمایا۔ اسی کے مطابق ہونا چاہیئے۔

حضورؐ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا۔ اس نے سوال کیا" کیا آپؐ خدا کے رسول ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا" ہاں! میں خدا کا فرستادہ رسول ہوں"

اس نے دریافت کیا" اللہ کا کیا حکم ہے؟"

حضورؐ نے شہادت، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ پانچوں ارکان تلقین فرمائے۔ وہ گدھے پر بیٹھا اور یہ کہتا روانہ ہوگیا کہ" لا یزید ولا انقص" (نہ میں زیادہ کروں گا اس سے نہ کم کروں گا) آپ صلعم نے یہ سنکر فرمایا" اگر یہ سچا ہے تو کامیاب ہوگیا۔ اپنی رائے سے نیکی نہ کم کرنی چاہیئے نہ زیادہ۔ بس جو ہے۔ وہ ہے۔ بڑی بڑی بات ہے۔ اسی کا نام بدعت ہے۔ تو اجماع کی اطاعت بھی فرض ہے اور یہ بھی غیر مشروط ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق ہونے کی بھی شرط نہیں ہے۔ دلیل اسکی اگر کوئی طلب کرے تو اگر کوئی دلیل ہوتی تو وہ قرآن وحدیث ہی کی مطابقت ہو جاتی۔ ان سے دلیل نہیں پوچھی جائے گی۔ ان کا تو صرف اتفاق حجت ہے۔ کیونکہ آپ صلعم نے فرما دیا کہ لا یجتمع من امتی علی الضلالۃ (میری امت ضلالت پر متفق نہیں ہوگی) اگر مجتمع ہوگی تو معلوم ہوگیا کہ ضلالت نہیں ہدایت ہے۔ جیسے یخٰدعون اللہ۔ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اللہ کو کیا کوئی دھوکا دے گا، تو تمام

اُمت نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اس کے معنے یخٰدعون الرسول کے ہیں۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکہ دیتے ہیں۔

"قَالَ اللّٰہ یا عیسیٰ"۔ اللہ نے کہا یا عیسیٰ اور یہ ہوگا قیامت میں تو سب نے متفق ہوکر فیصلہ کرلیا قال یہاں یقول کے معنی میں ہے جگہ جگہ قرآن میں بھرا ہوا ہے تو اجماع حجت تامہ ہے اور اس پر سب مومنین متفق ہیں۔ قیاس اور اجتہاد پر تو بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں لیکن اجماع پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ۳ اور ۲ پانچ ہوتے ہیں یا تین پنجے پندرہ ہوتے ہیں اس پر سارا عالم متفق ہے اور سارے عالم میں دو جماعتیں ہیں ایک مومن ایک کافر۔ تو مومن اور کافر کا اجماع حجت ہوگیا تو خالص مومن کا اجماع بدرجہ اولیٰ حجت ہے۔ نمازیں ۵ فرض ہیں۔ قرآن شریف میں ۵ کا لفظ کہیں نہیں ہے۔ اور پانچ نمازوں سے جو انکار کرے وہ قطعی کافر ہے۔ حکم تکفیر جو ہے وہ قطعی ہے اور قرآن میں کہیں پانچ نمازوں کا ذکر نہیں ہے اور اس پر قطعی دلیل ہونا ضروری ہے، حدیث جو ہے وہ ظنی ہے۔ ظنی دلیل قطعی حکم پر حجت نہیں تو، اب قرآن و حدیث کے علاوہ جو دلیل قطعی اس پر حجت ہے اسی کا نام اجماع ہے۔ نبی صلعم کا جسم اطہر کعبے کے جسم سے زیادہ مقدس اور افضل ہے کہ کعبے کے جسم پر پاؤں رکھ سکتے ہیں۔ نبی کے جسم پر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ بے ادبی ہے اور کفر ہے اب اتنے مقدس جسم پر مٹی اور خاک ڈالنی عقل کے بھی خلاف ہے اور شرع کے بھی خلاف ہے۔ گڑھے میں رکھ کر اوپر سے مٹی اور خاک ڈالدی۔ بہت بری بات کی اور گناہ کیا لیکن اجماع ہوگیا کہ یہی فعل ٹھیک ہے۔ تو اجماع حجت ہوگیا۔ بلا شرط۔ نہ قرآن سے ثابت نہ حدیث سے۔ اگر قرآن میں حکم ہوتا تو آپ کو اطمینان ہوجاتا۔ حدیث میں حکم ہوتا تو اطمینان ہوجاتا لیکن دونوں جگہ

نہیں ۔ تو اب بھی آپ مطمئن ہیں تو یہ اطمینان کیوں ہوا۔ اجماع پر ہوا۔ اب یہ تین باتیں بتانے کے بعد فرماتا ہے۔ کہ فان تنازعتم فی شیئی ۔ تو کیا کرو۔ قاعدہ بتایا فردوہ الی اللہ والرسول ۔ اگر تمھیں کوئی مسئلہ شرعی پیش آئے جو نہ قرآن میں ملے نہ حدیث میں ملے اور نہ اس پر اجماع ہوا یا اس کا موقع نہیں ہو کہ اجماع کیا جائے تو اب کیا کرو۔ قیامت تک کے لئے قاعدہ بتا دیا کہ اللہ اور اسکے رسولؐ کے قول کی طرف رجوع کرو۔ اِن کنتم تومنون باللہ والیوم الآخریٰ ۔ اگر تم کو اللہ اور روز جزا پر ایمان ہے ۔ ذالک خیر و احسن تاویلا ۔ یہ تمھارے لئے بہتر ہے اور اس کا بہترین انجام ہے ۔ رجوع کے یہ معنی ہیں کہ اس سے ملتا جلتا مسئلہ قرآن و حدیث میں تلاش کرو ۔ جو جواب اس مسئلے کا ہے وہی اس کا ہوگا ۔ اسی کو اجتہاد کہتے ہیں ۔ مجتہدوں کا یہی کام ہے ۔

اہلِ حدیث رجوع کے جو معنی بتاتے ہیں ۔ وہ بات سمجھے نہیں ۔ قرآن و حدیث سے حکم تلاش کرنا تو اطیعوا میں آگیا ہے ۔ رجوع جو ہے وہ اطاعت سے الگ چیز ہے ۔ اس کے علاوہ وہ کہتے ہیں کہ الیوم اکملت لکم دینکم کے یہ معنی ہیں کہ دین مکمل ہو گیا ۔ یہ بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی ۔ اس کے معنی تکمیل قرآن کے ہیں ۔ کیونکہ اس کے بہت عرصے بعد تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے اور بہت سی حدیثیں فرمائیں وہ سب قابل عمل ہیں اور دین ہیں اگر دین کو اس وقت تک تکمیل سمجھ لیا جائے تو وہ حدیثیں سب ناقابل عمل ٹھہریں گی ۔ تو چونکہ وہ احادیث بھی دین میں شامل ہیں ، تو پتہ چل گیا کہ دین کی تکمیل اس وقت نہیں ہوئی

بلکہ وہاں دین سے مُراد وحی قرآنی ہے۔

قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس یہ چاروں دین ہیں اور جو بات ان چاروں میں سے کسی دلیل سے ثابت نہ ہو اور پھر اس کو ان کی طرف منسوب کیا جائے اس کا نام بدعت ہے اور اگر منسوب نہ ہو اس کو بدعت نہیں کہیں گے مثلاً اقلیدس کی اشکال نہ ان چار دلیلوں سے ثابت ہیں۔ نہ ان کی طرف منسوب ہیں اور حق ہیں مگر وہ بدعت نہیں کہلائیں گی تو ہم نے ثابت کر دیا کہ قیاس حق ہے اور دین ہے۔

اب ہم تحقیق کریں گے کہ انسان کیا ہے۔ یہ جو ہر شخص کہتا ہے "میں" تو یہ "میں" کیا ہے۔ اس کو تلاش کرنا ہے۔ انسان کی ہر ہر شئے کو تحلیل کیجئے۔ بال اور جگہ بھی ملتے ہیں، سر، آنکھ، ناک، کان اور دیگر اعضاء تمام دیگر جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تو ان میں سے کوئی انسان نہیں ہے روح، یہ بھی اور جگہ پائی جاتی ہے۔ میں مرجاتا ہے روح باقی رہتی ہے۔ عقل ملائکہ میں ہے۔ شعور میں بھی "مَیں" نہیں ہے۔ کیونکہ جب "میں" کو بچانا ہوتا ہے تو شعور کو ڈاکٹر کلوفارم دے کر زائل کر دیتا ہے۔ یہ "میں" پر نثار کر دیا جاتا ہے۔ تو یہ 'میں' نہیں ہے۔ اب جو ہم نے غور کیا تو یہ کس شے پر نثار ہوا، تو معلوم ہوا کہ وہ شے "اختیار" ہے۔ اختیار کو باقی رکھتے یا اس کو حاصل کرنے کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے تو پتہ چل گیا کہ 'میں' جو ہے وہ اختیار ہے۔

اب اختیار کیا شے ہے کہ فاعل کو کرنے اور نہ کرنے دونوں کی طرف

نسبت برابر ہو اور انسان کیا ہے۔ وہ شے جس میں اختیار ہو وہ انسان ہے یہ اختیار ہی تو ہے جو خدا کے مقابل آرہا ہے۔ اس سے سوتا، مُردہ۔ بچہ، پاگل چاروں نکل گئے۔ ان پر کوئی حد نافذ نہیں ہوگی۔ تو یہ مدہیں " اختیار ہے۔ اب اس کو فعل کرنے یا نہ کرنے کی طرف جب نسبت برابر ہے تو اس کو فعل کرنے کی طرف لانے کے لئے باہر سے کوئی قوت آئے گی اور وہ قوتیں جو اس سے نیچے کی ہیں اور یہ ان کے اشارے پر چلا تو یہ ان سے گھٹیا ہو گیا نیچے کی تمام قوتیں اس پر نثار ہونی چاہئیں۔ روزانہ آپ دیکھتے ہیں کہ اختیار کے لئے محنت سے کمائی ہوئی دولت کو پانی کی طرح بہا دیتا ہے۔ اور جتنے اربابِ اختیار ہیں وہ اربابِ علم سے افضل ہیں۔ تمام عُلماء و فضلاء فلسفی سب غلام ہیں اربابِ اختیار کے۔ اربابِ اختیار کو تو کچھ نہیں آتا۔ ابوالفضل اور فیضی کتنے بڑے عالم تھے مگر جاہل اکبر کے غلام بنے ہوئے تھے۔ امام ابُویوسف کتنے بڑے امام تھے مگر ہارون رشید کے مُلازم تھے۔ تو معلوم ہوا کہ اصل چیز اختیار ہے۔ دُنیا میں جو لڑائیاں ہوتی ہیں سب اختیار کے لئے ہوتی ہیں۔ ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ میرا اختیار قوی رہے۔ لڑائی روٹی کے لئے نہیں ہوتی ہے کیونکہ روزی کا پہنچانا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ روٹی تو سب ہی کو مل جاتی ہے جانور کو بھی اس کی غذا مل جاتی ہے۔ فرمایا۔ وما دابۃ لا تحمل رزقہا بہت سے جانور اپنی روزی اپنے اوپر لادے نہیں پھرتے۔ یعنی اکثر جانور کمائی نہیں کرتے۔ بعض جانور کمائی کرتے ہیں۔ جیسے گدھا، گھوڑا، اونٹ، محنت کرتے ہیں۔ مالک کا کام کرتے ہیں۔ مالک ان کو کھانے کو دیدیتا ہے لیکن

یہ تھوڑے سے ہیں۔ زیادہ جانور ایسے ہیں جو کچھ کاروبار نہیں کرتے اور اللہ یرزقھا بغیر کاروبار کے ان کو روزی دیتا ہے۔ ایاکم اور تم کو بھی، اگر تم یہ سمجھو کہ اگر کاروبار نہ کرتے تو روزی نہ ملتی۔ بھوکے مرجاتے۔ تو کیا نہیں ہم اتنی کثیر جماعت حیوانات کو بغیر کاروبار روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی روزی ہم ہی دیتے ہیں۔ واللہ سمیع العلیم اور اللہ سنتا ہے اور دیکھتا بھی ہے اس کو سب معلوم ہے کہ کس کو کس شے کی ضرورت ہے اور دعاؤں کو بھی سنتا ہے اور جانتا ہے کہ دعا کو پورا کرنا چاہیئے یا نہیں۔ جس کو چاہتا ہے پورا کر دیتا ہے۔ تو اب قاعدہ یہ ہے کہ اعلیٰ جو ہے اس کے ادنیٰ تابع ہیں تو ادنیٰ کے اعلیٰ تابع نہ ہو۔ یہاں تین چیزیں ہیں عقل، غضب اور شہوت۔ تو شہوت تو وہ قوت ہے جو مطلوب کو حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے اور غضب وہ قوت ہے کہ حصولِ مطلوب میں، اگر کوئی شے مخل ہے تو اس کو دفع کر دے اور عقل ان دونوں قوتوں میں مساوات قائم رکھنے کے لئے شہوت اور غضب یہ دونل ہیں بھرنے والے۔ اور تیسرا نل جو ہے عقل، وہ ڈرم کو خالی کرنے والا ہے۔ تو یہ تین قوتیں ہیں۔ اگر اختیار ان کے تابع ہوگیا۔ یعنی اگر عقل کے تابع ہوگیا تو انسانیت سے گیا جانوروں میں شامل ہوا۔ اگر شہوت اور غضب کے تابع ہوا تو جمادات کی مانند ہوگیا۔ حیوانوں سے گیا گزرا ہوا۔ کالانعام یعنی حیوانوں کی طرح ہوگئے بَلْ ھُمْ اَضَل۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر یعنی پوری کائنات سے بدتر ہوگئے۔ اختیار جو سب سے اونچی پہلے نمبر کی چیز تھی وہ عقل غضب اور شہوت تینوں سے نیچے چوتھے نمبر پر آیا۔ عقل عقل سب کہتے ہیں بات نہیں سمجھتے۔ عقل کے تحت عمل کرنا ایسا ہی

ہے جیسے شہوت اور غضب کے تحت عمل کرتا۔ اس میں اور اس میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک
اور عجیب بات ہے کہ شہوت نے حکم دیا کہ بھوک لگی ہے، کھانا کھا ؤ۔
غضب نے حکم دیا کہ یہ دشمن ہے اس کو دفع کرو۔ ان دونوں کے حکم کی مخالفت
ہوسکتی ہے۔ آپ نہ کھائیں یا دشمن کو دفع نہ کریں بلکہ اس سے صلح کرلیں، لیکن
عقل کے حکم کی مخالفت نہیں ہوسکتی۔ اس پر مجبور ہے۔ عقل کہتی ہے۔ ایک اور
دو تین ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت نہیں ہوسکتی۔ مثلث کے دو ضلعے تیسرے
سے بڑے ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف کون بول سکتا ہے؟ تو عقل جو حکم دے
رہی ہے وہ بدیہی ہے اس کی مخالفت نہیں ہوسکتی اس پر عمل کرنے پر مجبور ہے
اگر اس کے مطابق کرے گا تو اختیار جاتا رہے گا۔ مختار ہونے سے گر گیا۔ اسی
طرح شہوت اور غضب کے تحت عمل کرنے سے بھی مختار ہونے سے گیا شہوت
اور غضب کے تحت اپنے اختیار کو کرے گا تو فاسق ہوجائے گا اور عقل کے
تحت اپنے اختیار کو کرے گا تو کافر ہوجائے گا وہ اتنی بری چیز ہے اس کو
کم فہموں نے اتنا بڑا بنا رکھا ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ تو نے
دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی عقل کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ عقل ہی کو ہوا کہتے
ہیں، عقل حاکم نہیں ہے، ساری دنیا کہتی ہے عقل کو حاکم ہونا چاہیئے۔ اگر عقل
کو حاکم بنائے گا تو مجبور ہوجائے گا۔ قدرت باقی نہیں رہے گی اور انسان' یہ
ثابت ہے کہ' مختار ہے۔ تو اختیار تو جب ہی باقی رہے گا۔ جب عقل کے خلاف
کرے تو معلوم ہوا کہ عقل حاکم نہیں ہے۔ جب یہ تینوں' عقل، شہوت اور غضب
نکل گئے تو اب جو قوت اختیار کو کام میں لائے گی وہ قوت اختیار سے بالا ہوگی،

وہ بیرونی چیز ہوگی۔ وہ اختیار کو عمل کی طرف لائے گی، اور اختیار عقل کو حکم دیگا عقل محکوم ہے حاکم نہیں ہے۔ اللہ پاک کا خطاب سننے کے قابل اجزائے انسانی میں کوئی شے نہیں سوائے عقل کے اگر عقل نہیں ہوگی۔ تو حکم نہیں ہوگا۔ پاگل ہے، بچہ ہے، اس کو خطاب نہیں ہوگا۔ اگر قتل کر دے قصاص نہیں ہوگا۔ عقل کی محکومیت کو غلطی سے حاکمیت سمجھ گئے۔ ربّ العالمین کا خطاب اسی کو ہو رہا ہے۔ اس کی فضیلت حاکم ہونے کی نہیں ہے۔ بلکہ محکوم ہونے کی فضیلت ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے حاکم کا حکم مانے۔ یعنی حسن و قبح میں تمیز کرے۔ حُسن کیا ہے؟ حکمِ الٰہی قبح کیا ہے؟ ممانعتِ الٰہی۔ ان دونوں میں جو تمیز کرے وہی عقل ہے۔ جتنے بھی اہلِ علم ہیں، فلسفی مسلم از غیر مسلم سب عقل کو حاکم بتاتے ہیں اور کہتے کہ سب نہ سہی بعض باتیں تو بالکل عقلی ہیں۔ جیسے ماں باپ کو ستانا نہیں چاہیئے۔ یہ جھوٹی بات ہے کیونکہ کوئی شئے کسی شے سے بنے یا اس شے کے اجزا سے بنے دونوں برابر ہیں تو اب اگر باپ کی تعظیم جزوِ بدن کے اعتبار سے ہے تو نطفہ جن اجزا سے بنا ہی ان کی تعظیم بھی لازم ہوگی۔ تو یہ مٹی ہوا پانی سب قابلِ تعظیم ہو کر پتھروں کا پوجنا حق ہو گیا۔ علاوہ اس کے کہ حرامی لڑکے پر حرامی باپ کی تعظیم لازم نہیں ہے۔ ماں کی تعظیم لازم ہے۔ اگر دودھ کی وجہ سے تعظیم ہو تو بکری کے دودھ سے بھی بچے پل جاتے ہیں تو بکری اور گائے بھی قابلِ تعظیم ہو جائینگے حالاں کہ وہ بچہ اگر اس بکری کو ذبح کر ڈالے اور اس کا گوشت کھالے تو کوئی بُرائی اس میں نہیں ہے، تو یہ عقلی نہیں ہے۔ بلکہ اصلی محسن اللہ پاک ہے۔ اس کا شکر واجب ہے اور اس کے علاوہ جو محسن ہیں ان کا شکر اس بنا پر

پراچھا ہے کہ اللہ پاک نے اس کا حکم دیا ہے ۔ ورنہ جو چیز اچھی ہے وہ ہر جگہ اور ہر حال میں اچھی ہونا چاہئیے ۔ مگر جانوروں میں نہ ماں باپ کی تعظیم ہے نہ محسن کا احسان ماننا ضروری ہے تو ماں باپ کی تعظیم اس کے حکم کی بنا پر ہے ۔ اگر وہ حکم نہ دیتا تو کوئی ضرورت نہ تھی ۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ کفر بُری چیز ہے تو ہر حال میں اس کو بُرا ہونا چاہئیے مگر اللہ پاک نے فرمایا ۔ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا ۔ نبی کو بھیجنے سے پہلے ہم عذاب نہیں بھیجتے " ۔ تو نبی سے سے پہلے لوگ کافر ہوتے ہیں ۔ نبی ان کو ایمان پیش کرتا ہے تو نبی کے آنے سے پہلے کفر موجبِ عذاب نہیں ہے تو کہاں بُرا ہوا ۔ وہ اگر بُرا ہوتا تو ہر حال میں موجبِ عذاب ہوتا ۔ اب ایسی چیزیں بھی ہیں جو ایک وقت ایمان تھیں ، دوسرے وقت وہ کفر ہو گئیں ۔ مثلاً جب بیت المقدس پر حکم سجدے کا ہوا تو موجود کعبہ کی طرف سجدہ کرنا کفر تھا اور اب اس طرف سجدہ کرنا ایمان اور بیت المقدس کی طرف سجدہ کرنا کفر ، تو کفر قبیح کہاں ہوا ۔ جو شے قبیح ہوگی وہ حسن کیسے ہو سکتی ہے ۔ جو شے بری ہے وہ بری ہی رہے گی اور جو شے اچھی ہے وہ اچھی ہی رہے گی ۔ تقدیر کے مسئلے میں بھی انھیں یہی دقت ہوئی ہے ۔ وہ کہتے ہیں خود حکم دے ایسا کہ اس میں تعمیل کی طاقت نہ ہو اور جب اس سے تعمیل نہ ہو تو اس کا عذاب دے ، یہ بُری بات ہے ، اللہ ایسا نہیں کرے گا ۔ وہ بات نہیں سمجھے ۔ دیکھئے وہ یہ کہتا ہے کہ " میری عبادت کرو ۔ مجھے سجدہ کرو " تو یہ بات صحیح ہے ۔ اور اگر یہ بات ہم کہیں تو غلط ہے ۔ وہ بے وجہ کسی کو تکلیف دیتا ہے ، مار ڈالتا ہے ۔ وہ صحیح ہے ۔ اگر ہم یہی فعل کریں گے تو غلط ہے ، بُرا ہے ۔ یہاں بھی ، وہاں بھی

اگر جانور کو سوئی چبھوئیں تو گناہ، اگر اس کے حکم سے اس جانور کو ذبح کر دیں اور کھا جائیں تو ثواب اور باعث اجر اطعموا منھا و اطعموا لھا لئین القفیر خود بھی کھاؤ اور خاک بسر فقیر کو بھی کھلاؤ اور مزید انعام پاؤ۔

احسان کی فضیلت اس نے بیان کی۔ کہا کہ احسان وہ ہے جسے میں احسان کہوں۔ ایک شخص ہے وہ کہتا ہے کہ چل میں تجھے رنڈی کے کوٹھے پر لے چلتا ہوں اس سے استفادہ کر، قیمت بھی میں دوں گا اور نگرانی بھی کروں گا، تو یہ احسان ہے یا نہیں، لیکن اس کو احسان نہیں مانا جائے گا بلکہ یہ قابل سزا ہے۔

اور وہ کہتے ہیں کہ عدل اچھی چیز ہے۔ نہیں۔ عدل وہ اچھا ہے جسے وہ اچھا کہے اور جس عدل کو اس نے اچھا نہیں کہا، وہ اچھا نہیں ہے۔

چار عورتوں سے شادی کی اجازت دی، اس میں عدل کی شرط لگا دی اور کہا، کہ اگر تمھیں ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی رکھو، تو بیویوں میں عدل کی تاکید کی مگر لونڈیوں کے لئے اجازت دیدی اور بے عدلی کو جائز قرار دے دیا مردوں کو حکم دیا کہ وہ باندیوں کو بیوی کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ عورتوں کو منع کر دیا کہ اپنے غلاموں کو شوہر کی طرح استعمال نہیں کر سکتیں۔ تو بظاہر یہ ظلم معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے نہیں، میں جس کو عدل کہوں وہ عدل اور میں جس کو ظلم کہوں وہ ظلم۔

کہتے ہیں خودکشی بُری چیز ہے۔ بالکل نہیں۔ خودکشی اس لئے بُری ہے کہ خدا نے اس کو بُرا کہا ہے۔ اگر وہ اچھا کہدیتا تو اچھی چیز ہوتی۔

بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ: فاقتلوا انفسکم ذالکم خیر الکم عند بارئکم ترجمہ: خودکشی کرو وہ تمھارے رب کے نزدیک تمھارے لئے اچھی ہے۔

اس وقت خودکشی اچھی چیز تھی۔ اب اس نے منع کر دیا۔ اب یہ بُری چیز ہو گئی تو عقل کا حکم کہاں رہا۔ شہوت، غضب، عقل ان میں سے کوئی حاکم نہیں ہے۔ یہ سب اضطراری چیزیں ہیں، حاکم ان سے بالا ہوگا۔ اضطرار سے بالا اختیار ہے۔ اختیار حاکم ہوگا۔ اب یہ اختیار جو ہے وہ محتاج ہے۔ کیونکہ اس کو فعل اور ترکِ فعل دونوں کی طرف نسبت برابر ہے اور اس کو فعل اور ترکِ فعل کی طرف لانے والا ایک اور اختیار ہوگا جو اس سے بالا ہوگا۔ اور اس میں احتیاج نہ ہوگی۔ اسی اختیارِ کلی کا نام خدا ہے۔

اب، خدا کی یہاں دو حالتیں ہیں — ایک اس کا ارادہ ہے — اور ایک اس کا اَمر ہے۔ بہت دور تک کے علماء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ خدا کا ارادہ بندے کے فعل کا مرجح نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر خدا کا ارادہ اس کو فعل کی طرف یا ترکِ فعل کی طرف لے آیا تو قدرت باقی نہیں رہے گی۔ اختیار باقی نہیں رہے گا۔ نماز کی طرف لے آیا تو ترکِ نماز کی قدرت جاتی رہی۔ کوئی ایسی شے نہیں ہو سکتی جو اختیار کو ختم نہ کر دے۔ خدا کا یہ عملہ کائنات انسان کو چھوڑ کر کوئی بھی یہ کہدے کہ خدا ایک ہے تو کون انکار کرے گا؟۔ مثلاً درخت، پہاڑ دریا کہہ دیں کہ خدا ایک ہے تو سب مان لیں گے کوئی انکار نہیں کر سکے گا تو اختیار کا مرجح نہ تو وہ خود ہوگا نہ اس کے عملے میں سے کوئی ہوگا۔ سوائے انسان کے۔ امر کے معنی یہ ہیں کہ کسی واسطے سے ترجیح دی جائے وہ واسطہ ایسا ہونا چاہیئے کہ قدرت باقی رہے۔ اور ایسا واسطہ صرف انسان ہے۔ کہ اس کے واسطے سے جو شے آئے گی اس کا اقرار اور انکار دونوں کر سکے گا۔ اور قدرت باقی رہے گی۔ اسی انسان کا نام نبی ہے۔ تو نبی

کے ذریعے جو حکم آئے گا وہ مرجح ہوگا۔ فعل یا ترکِ فعل کا جو انسان بتائے گا کہ یہ کرو
یہ نہ کرو۔ اسی انسان کو نبی کہتے ہیں۔ بس آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

تصدق شوم بر جمالِ حسن
نہایت ندارد کمالِ حسن

غایت فعل اور مشیت

آپ کسی مجلس میں بیٹھے لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں۔ آپ کے سامنے پہلی قطار میں فرض کریں پندرہ آدمی بیٹھے ہیں۔ اب اگر اس صف کو بڑھائیں تو چند آدمی اس قطار میں اور داخل ہو جائیں گے پھر جگہ پُر ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ نہیں بڑھ سکیں گے۔ مگر آپ اپنے خیال میں اپنی مشیت سے اس قطار میں ایک لاکھ آدمی بٹھا سکتے ہیں۔ ان کو لڑا سکتے ہیں۔ خونریزی کرا سکتے ہیں۔ پھر ایک مصلح کو کھڑا کر کے ان میں صلح کرا سکتے ہیں کہ وہ پھر راضی خوشی مل جل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور یہ سب آپ ایک آن میں کر سکتے ہیں یہی مشیت ہے۔ لیکن یہ کمزور مثل ہے۔ مثال نہیں ہے۔ خدا کے کسی فعل کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بندہ کی مشیت مثل اعلیٰ ہے۔ یہ بندہ کی مشیت بندہ سے بہت زیادہ کمزور ہے۔ بندہ کی مشیت کو خدا کی مشیت سے وہی نسبت ہے جو بندہ کو خدا سے ہے۔ اس کی مشیت کا نتیجہ یہ کارخانۂ عالم ہے۔ تمہاری مشیت کا نتیجہ وہ ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ تمہاری مشیت تمہارے باہر ہو رہی ہے۔ خدا ایسا نہیں ہے۔ ایک جگہ بیٹھا ہو اور سب کچھ اس سے باہر ہو رہا ہو اگر ایسا ہوتا تو اس کو بھی کسی کام کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا۔ مدت گزرتی امتداد خرچ ہوتا۔ اور ارادے سے مراد جدا ہوتی۔ مگر افعال اس کی مشیت سے ہو رہے ہیں لہٰذا وہ میدان یا ظرف مشیت کے اندر ہی رہتے ہیں۔ باہر نہیں آتے۔ اس لئے اس کو دیکھا

نہیں جاسکتا۔ لیکن خدا جب چاہے گا کہ ظاہر کرے ظاہر ہو جائے گی۔ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ۔ وہ چشم زدن میں کر دیتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی سرعت ہے۔ زبان ناقص ہے بیان نہیں کر سکتی۔ جو بات لاکھوں برس پرانی معلوم ہوتی ہے اور جو بات لاکھوں سال بعد ہونے والی ہے۔ وہ دونوں کو بیک آن دیکھ رہا ہے۔ (اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا)۔ ان کو وہ دور دیکھ رہے ہیں، ہم ان کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ سمجھنے کے لئے ایک حسّی مثال لیں۔ مرکز پورے دائرے کے ہر حصے کو بیک آن دیکھ رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک طرف ایک رخ ہو دوسری طرف دوسرا رخ ہو۔ اگر ایسا ہو تو نقطہ نقطہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح خدا کائنات کا مرکز ہے۔ موجودات کا مرکز ہے۔ سب کو بہ یک آن دیکھ رہا ہے اور سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہاں جو غلطی ہوتی وہ یہ ہے کہ تشقیق غلط ہے کائنات خدا کی ذات کا فعل نہیں ہے۔ اگر ذات کا فعل ہوتا تو ذات اس کی علت ہوتی۔ یہ اس کی مشیت کا فعل ہے۔ وہ اس کے خیال میں ہے وہ سامنے نہیں ہے۔ اس لئے غرض تو ضرور ہے۔ مگر وہ ظاہر نہیں ہے۔ ہم کو اس کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ اور جو چیز ہم کو معلوم ہے وہ دراصل فعل نہیں ہے، مفعول ہے۔ فعل مفعول کے معنوں میں بولا گیا ہے۔ خلق مخلوق کے معنی میں بولا گیا ہے۔ هٰذا خلق الله کا مطلب ہے ہذا مخلوق اللہ۔ خلق اور چیز ہے مخلوق اور چیز ہے۔ خلق ایجاد ہے۔ مخلوق موجود ہے۔ یہ خدا کی خلق خدا کی مخلوق ہے۔ تم جو یہ کہتے ہو کہ علت ہے یا نہیں؟ تو وہ کس چیز کی علت کہتے ہو۔ فعل کی یا مفعول کی۔ مفعول کی اگر علت نہیں ہوگی تو وہ شے ختم ہو جائے گی، کیونکہ جو شے ہوگی وہ کسی کے لئے ہوگی۔ اور اس کا یہ "لئے" نہ ہونا اس شے کے نہ ہونے کے برابر ہے۔ جیسے آگ حرارت کے لئے ہے۔ آگ پر حرارت کا اثر مرتب ہوکے رہے گا۔ یہی اس کی غایت ہے۔ اگر حرارت کا اثر اس پر مرتب نہ ہوگا تو آگ آگ نہ رہے گی۔ راکھ ہوگی۔ سورج روشنی کے لئے ہے اگر

روشنی نہ ہوگی سورج سورج نہیں رہے گا۔ تو ا ہو جائے گا۔ اگر اثر مرتب نہ ہو تو تسے محقق ہی نہ ہوگی۔ مگر مفعول کے لئے غایت کا ہونا اور بات ہے۔ اور فعل کے لئے غایت کا ہونا اور بات ہے۔ یہ ان کو شبہ ہو گیا۔ امام ابوالحسن اشعری اور ان کے ہم خیال اشاعرہ اس کے قائل ہیں کہ اس کے فعل کے لئے علت نہیں ہے۔ اور احناف۔ معتزلہ اور علماء سب یہ کہتے ہیں کہ اس کے فعل کے لئے علت ہے۔ جنہوں نے مفعول کی طرف نظر ڈالی انہوں نے غایت کو پایا اور کہا کہ خدا کے فعل کے لئے غایت ہے۔ جنہوں نے فعل پر نظر ڈالی انہوں نے غایت کو نہیں پایا اور کہا کہ خدا کے فعل کے لئے کوئی علت نہیں ہے۔ اس کے فعل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علت اس کی مشیت میں ہے ظاہر نہیں ہے۔ جو مطلع ہو سکے۔ وہ اس عالم میں نہیں آسکتی۔ یہ عالم چھوٹا ہے۔

فلسفیانہ طریقے پر سمجھ لیں :۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ اس کے فعل سے سوال نہیں ہوتا عالم کو اس وقت کیوں پیدا کیا؟ پہلے کیوں نہیں پیدا کیا۔ متقدمین نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں عالم ہی نہیں ہر شے ہر حرکت پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت معین پر کیوں ہوئی اس سے پہلے یا اس کے بعد کیوں نہیں ہوئی؟

وہاں وہ سوال نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس پیدائش سے پہلے امتداد زمانہ ہوتی اور ایک مدت اور امتداد گذرتے گذرتے وہ وقت معین آتا اور پھر یہ پیدا ہوتا تو یہ سوال کیا جا سکتا تھا۔ کہ اس وقت کیوں ہوا۔ وہاں زمانہ مدت اور امتداد ہے ہی نہیں تو یہ سوال نہیں ہوتا کہ اس وقت کیوں ہوا۔ حکماء اور متکلمین کو دھوکا لگا۔ وہاں پہل نہیں ہے۔ یہ پہلی پہل ہے۔ پہلا تقدم ہے۔ یہ پہلی فعلیت ہے۔ پہلا فعل ہے۔ اس سے پہلے کچھ نہیں پہلے کا لفظ کہنا بھی صحیح نہیں۔ مگر زبان ناقص ہے مطلب ادا نہیں کر سکتی اس لئے بولا جاتا

ہے۔اسی طرح ہمیشہ کا لفظ ہے۔ زمانے کو دوام ہے ہی نہیں تو ہمیشہ کا لفظ بے معنیٰ ہے۔عالم ظاہر میں حقیقت کا تو پتہ نہیں۔مشیت کا شعور نہیں ہے۔اس لئے کچھ پتہ نہیں چل سکتا جبتک مشیت کا شعور ظاہر نہ ہو۔مشیت سے جو چیزیں بنی ہیں وہ ظاہر ہیں اس میں غور کر سکتا ہے۔اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ہمیں خود اپنی مشیت کا پتہ نہیں۔یعنی ہماری جو قوت ہے جس سے یہ فعل ہو رہے ہیں۔یہ جسم کا تقاضہ نہیں ہے۔کیونکہ جمادات اور حیوانات میں جسم مشترک ہے۔مگر انسان میں جو علوم پیدا ہو رہے ہے۔حساب فلسفہ وغیرہ وہ جمادات اور حیوانات میں نہیں ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ افعال جسم کا تقاضہ نہیں ہیں۔جسم کے علاوہ کوئی اور قوت ہے جو یہاں کام کر رہی ہے۔اسی کو نفس ناطق کہتے ہیں۔

یہی شبہ شیطان کو لگا۔

اللہ کی معرفت کا ذکر پہلے کیا ہے کہ اس کی معرفت کا علم کیسے ہوتا ہے۔اس کائنات میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے خدا کی شناخت ہو۔کیونکہ جو ذریعہ تلاش کریں گے وہ مشترک پائیں گے۔کیونکہ جو ذریعہ خالق و مخلوق میں مشترک ہوگا۔وہ شناخت کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔مثلاً حیات ہے۔ جتنے احیاء ہیں ان میں اللہ میں حیات مشترک ہے اس لئے حیات سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ خدا کیا شے ہے۔اسی طرح۔علم ذریعہ نہیں بن سکتا موجود ہے۔کل اشیاء موجود ہیں۔موجود بھی شناخت اور معرفت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودیت سے لیکر جتنے کمالات ہیں سب مشترک ہیں۔مقدار کی کمی بیشی ہے۔چیز ایک ہی رہی مقدار کی کمی بیشی سے ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔مثلاً گلاس کا پانی اور سمندر کا پانی مقدار میں کم و بیش ہیں۔مگر ماہیت دونوں کی ایک ہی ہے۔

یہاں جو شناخت ہو رہی ہے فاعلین کی اس کے ذرائع کو دیکھئے۔مثلاً یہ دیوار بتاتی ہے کہ یہ کسی غیر انسانی طاقت کا نتیجہ نہیں ہے۔اس دیوار میں کیا چیز ہے جو آپ کو

یہ بتاتی ہے کہ انجنیئر کا فعل ہے گدھے کا نہیں۔ یہ وہی اینٹیں ہیں جو گدھے نے لا کر ڈالی تھیں اور منتشر تھیں۔ ان اینٹوں کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر آپ ان دونوں میں فرق کر رہے ہیں۔ وہ گدھے کا فعل بتلاتے ہیں۔ اس کو انجنیئر کا۔ تو اس میں کیا چیز ہے ترتیب تحدید۔ کہ اتنا ہے۔ اور اتنا نہیں۔ دیوار پانچ گز کی ہے۔ یہ اس سے کم چار گز کی بھی ہو سکتی تھی اور اس سے زیادہ چھ گز سات گز کی بھی ہو سکتی تھی۔ تو پانچ گز درمیانی مقدار ہے۔ یہاں تین چیزیں ہوئیں۔ موجود مقدار۔ موجود سے کم۔ اور موجود سے زیادہ۔ اور یہ تینوں ممکن ہیں۔ مگر باوجود ہو سکنے کے کم اور زیادہ نہیں ہوئیں۔ صرف موجود مقدار ہوئی۔ تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوئی۔ کم یا زیادہ کیوں نہیں ہوئی کیونکہ ہونے کی کمی اور بیشی کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو موجود مقدار کے ساتھ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ موجود مقدار کا ہونا اس دیوار کی ذات کا تقاضہ نہیں ہے۔ کہ اتنی ہو۔ وہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی اور اس سے کم بھی ہو سکتی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ دیوار سے باہر کوئی اور طاقت ہے۔ جس نے اس دیوار کو موجود طول کے ساتھ مسطول کر دیا ہے۔ وہ جو بیرونی قوت ہے وہی فاعل ہے صانع ہے چنانچہ سورج چاند آسمان زمین کا موجود طول و عرض اور وزن کے ساتھ مقدار اور موزوں ہونا ان کی اپنی ذات کا تقاضہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی بیرونی طاقت نے بغیر وجہ کے اس موجود وزن۔ مقدار اور طول کے ساتھ اس کو موجود کر دیا ہے۔ وہی بیرونی طاقت صانع عالم ہے۔ تو خدا کی شناخت کس چیز سے ہوتی۔ کائنات میں ایسے افعال دیکھے گئے ہیں کہ جن کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یعنی بے وجہ اتنا کر دیا۔ یہ زیادہ بھی ہو سکتا تھا اور کم بھی ہو سکتا تھا۔ تو خدا کی معرفت کس چیز سے ہوئی۔ اس فعل سے ہوئی جس کے لئے کوئی وجہ نہ ہو۔ تو اب خدا کے فعل سے یہ سوال کرنا کہ تو نے یہ فعل کیوں کیا۔ یہ معاملہ الٹا ہو گیا۔ کیونکہ خدا تو کہتے ہی اس کو ہیں جس کے فعل کے لئے کوئی علت نہ ہو۔ اب جو یہ سوال کیا کہ خدا کے فعل کی علت کیا ہے۔ تو اس

کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی شناخت نہ ہوتی۔ اسی لئے شیطان سے کہا گیا کہ تجھ کو اللہ کی معرفت نہیں ہوتی۔ اگر تو جانتا تو سوال نہ کرتا کہ یہ کیوں کیا؟ اور اسی لئے کہا گیا کہ (لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ) اس کے فعل سے سوال نہیں کیا جا سکتا مگر ان کے فعل سے سوال کیا جائے گا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس کی معرفت موقوف ہی اس بات پر ہے کہ اس کا فعل بے علت ہو۔ اس سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔ ورنہ اس کی شناخت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس عالم میں۔ مثلاً رومال میں گرم روٹی رکھیں۔ رومال کیوں گرم ہے؟ جواب ملے گا۔ کیونکہ گرم روٹی اس میں لپٹی ہے۔ تو اگر م کیوں ہے؟ تنور گرم کیوں ہے؟ جواب مل سکتا ہے۔ کہ یہ آگ کے قریب تھا۔ کیونکہ یہ فعل انسانی ہے۔ اب کہو آگ گرم کیوں ہے۔ اس کا جواب نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ خدا کا فعل ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ کوئی علت نہیں انسانی فعل میں سوال ہو گا۔ خدا کا فعل سورج چاند پہاڑ دریا کسی میں سوال نہیں ہو گا کہ یہ کیوں ہیں۔ گلاب کے پودے میں کانٹا۔ کہیں دریا اور کہیں ریگستان کیوں ہیں؟ کوئی جواب نہیں ہے۔ جواب صرف یہ ہے کہ سب بے وجہ ہے۔ اس کی مشیت ہے۔

قرآن پاک کی فضیلت

ایک اجتماع میں قرآن پر بحث ہو رہی تھی۔ قرآن کی ایک فضیلت تو یہ ہے کہ اس کے ہر حرف پر دس نیکی ملتی ہے۔ اور حضورؐ نے اس کی تشریح فرمائی کہ میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ دوسری اس کی فضیلت جو سب سے بڑی فضیلت ہے۔ وہ قرآن کریم میں شروع ہی میں ہے اور وہ یہ ہے کہ ذالک الکتاب اس کی ائمہ نے دو ترکیبیں کی ہیں ذالک الکتاب کو مبتدا بھی کہا ہے اور اس کو ایک جملہ بھی کہا ہے۔ اگر اس کو جملہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ قرآن کی مکمل تعریف ہے۔ اس سے بہتر قرآن کی تعریف نہیں ہو سکتی کہ یہ کتاب ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ صرف یہ تو کتاب ہے۔ باقی سب کتبیاں یا کتنچیاں ہیں جو نام ان کا رکھ لیں وہ کتاب نہیں ہیں۔ ایک دماغ کتاب لکھتا ہے۔ دوسرا پڑھتا ہے۔ اس کا مضمون دماغ میں لے کر ایک اور کتاب لکھتا ہے۔ اس کو اور دماغ پڑھ کر اور کتاب لکھتا ہے۔ اس طرح کتاب اور دماغ کا ایک سلسلہ ہے جو ماضی سے چلا آ رہا ہے — دماغ کتاب۔ دماغ کتاب، کہ ہر کتاب دو دماغوں کے بیچ میں ہے۔ اور ہر دماغ دو کتابوں کے بیچ میں ہے۔ مگر قرآن ایسی کتاب ہے جو کسی دماغ سے نہیں نکلی اور نئی

کے دماغ نے کسی کتاب سے اخذ نہیں کیا۔ لہٰذا نبیؐ کا دماغ پہلا دماغ ہے اور قرآن پہلی کتاب ہے۔ سلسلہ ان سے شروع ہوتا ہے۔ معلمِ اوّل ارسطو نے ایک کتاب لکھی اس کا نام رکھا۔ تعلیمِ اوّل' اس کا ترجمہ معلمِ ثانی فارابی نے عربی میں کیا۔ پھر اس کا خلاصہ شیخ الرئیس نے کر دیا۔ اس کا نام رکھا "شفا" اس کو بہت سے حکماء نے پڑھا۔ اور اپنے دماغ سے بہت سی کتابیں لکھیں۔ تو دنیا کے جتنے معلم ہیں' سب کا قاعدہ یہی ہے۔ کہ وہ پہلے کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان کا مضمون اپنے دماغوں میں لے جاتے ہیں۔ پھر ایک کتاب تصنیف کر دیتے ہیں۔ پھر دوسرے لوگ ان تصنیفات کو پڑھ کر مضمون اخذ کر کے دماغوں میں لے جاتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی ایک کتاب تصنیف کر دیتے ہیں تو حاصل یہ نکل آیا کہ ہر دماغ دو کتابوں کے بیچ میں ہے اور ہر کتاب دو دماغوں کے بیچ میں ہے۔ اور بیچ کا تصور ممکن نہیں ہے۔ جب تک ابتدا اور اوّل نہ ہو۔ محال ہے۔ یعنی یہ محال ہے کہ دماغ میں یہ بات آئے کہ حرکت ہو اور متحرک نہ ہو۔ محال کس کو کہتے ہیں۔ یہ حکمت کی بات ہے۔ اسے یاد رکھیں۔ محال اس کو کہتے ہیں جو تخیلہ میں نہ آئے اور جو چیز خیال میں آ رہی ہے۔ وہ ممکن ہے۔ تو بیچ کا تصور بغیر اوّل کے محال ہے۔ خیال میں نہیں آ سکتا۔ لہٰذا پہلا دماغ ہونا چاہیئے اور پہلی کتاب ہونی چاہیئے۔ پہلا دماغ رسولؐ اور پہلی کتاب قرآن ہے۔ یعنی رسول اللہؐ کے دماغ میں کسی کتاب سے مضمون نہیں آیا۔ اور کتاب اللہ میں کسی دماغ سے مضمون نہیں آیا۔ تو قرآن کی اس سے بڑی تعریف نہیں ہو سکتی جو اللہ پاک نے ذالک الکتاب کہہ کر ختم کر دی۔ آگے بھی دوسرا ٹکڑا ہے۔ لاریب فیہ مگر وہ بھی تفصیل چاہتا ہے۔ آج کا سبق رہ جائے گا۔ اس لئے کسی اور موقع پر اس کو بیان کیا جائے گا کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ اس میں کُل کی کُل باتیں یقینی ہوں۔ ہر کتاب میں کچھ حق ہوگا

کچھ باطل ہوگا۔ ہر کتاب میں شک ہوگا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ بتائی کہ اس میں کوئی بات شک کی نہیں ہے۔ کُل کی کُل حق ہے۔ اس میں دو قسم کی باتیں ہیں ۔ یا تو شیطانی مضامین کا رد ہے۔ یا رحمانی مضامین کا اثبات ہے جس چیز کو ثابت کیا ہے۔

اِس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے جس چیز کو باطل کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ وہ عقل کے بھی مطابق ہے اور جذبے کے۔ دل کے۔ قرینہ کے بھی مطابق ہے جس کو عام لوگ کہتے ہیں کہ گلے نہیں اترا۔ تو یہ گلے اتر بھی جاتا ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ حق تو ہوتی ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتیں۔ گلے نہیں اترتیں۔ مگر یہ باتیں ایسی ہیں کہ گلے بھی اترتی ہیں۔ اور نبیؐ سے لے کر ایک عام آدمی تک سب کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کے دونوں مکلف ہیں۔ نبیؐ بھی اور کم سے کم عقل کا آدمی بھی۔ تو بات ایسی ہونی چاہیئے کہ دونوں سمجھ لیں تاکہ دونوں قرآن پر ایمان لائیں اور قرآن پر عمل کریں۔ ایسے مضامین باریک نہیں ہیں کہ ان کو ارسطو اور فارابی جیسے لوگ ہی سمجھ سکیں۔ ورنہ کم عقل آدمی یہ عذر کرسکتا ہے کہ میں ایسی باریک بات نہیں سمجھ سکتا تو عمل کیسے کرتا۔ نبیؐ اور کم عقل آدمی میں جو شے مشترک ہے وہ حس ہے۔ نبیؐ تو عاقل العقلاء ہوتا ہے۔ نبوت سے قبل اور اس کے صحابہ اس سے کم عقل رکھتے تھے اور ان کے شاگرد ان سے کم۔ یہاں تک کہ پونے پندرہ سو برس کے بعد آج ہم سب اگلوں سے کم عقل رکھتے ہیں۔ عقلمند آدمی وہ ہوتا ہے۔ جو اپنے فائدہ کا کام کرے اور ایسے کام نہ کرے جس میں مضرت ہو۔ یہ بات غلط مشہور ہوگئی ہے کہ اگلے لوگ بہت بھولے اور کم عقل تھے اور آج کا انسان عقلمند ہے۔ اگر ایک شخص سانپ کو دیکھے تو عقلمند وہ ہے جو اس سے بچے نہ کہ وہ جو اس سے کھیلنے لگے اور

اپنی باریکیاں دکھانے لگے۔ ایک بنیا تھا وہ رتھ میں بٹھا کر اپنے خاندان کو لے کر کہیں جا رہا تھا راستہ میں دریا آ گیا تو اس نے دریا کی مختلف گہرائیاں ناپیں اور اس کا اوسط نکالا تو ایسا نکلا کہ پہیے ڈوبیں رتھ نہ ڈوبے تو اس نے کہا کہ چلو پار ہو جائیں گے رتھ جب گہرائی میں پہنچا اور ڈوبنے لگا تو اس نے اپنا حساب پھر دیکھا حساب ٹھیک تھا۔ کہنے لگا کہ حساب جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ یہ کہتے کہتے ڈوب گیا تو یہ حکماء اور فلاسفہ جو مسلمانوں کو سادہ اور بے وقوف کہتے ہیں ان کی مثال اس بنیئے کی سی ہے۔ عام مسلمان حساب نہیں جانتا مگر وہ جانتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈوب گیا۔
یہ بات یاد رکھیں کہ عقلمند وہ لوگ ہیں جو اپنے نفع کی کوشش کریں اور نفع کی دو قسمیں ہیں ایک وہ نفع ہے جس میں نقصان کی آمیزش ہے اور ایک وہ نفع ہے جو نقصان سے بری اور پاک ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نفع جس میں نفع ہی نفع ہو نقصان کی آمیزش نہ ہو وہ بڑھیا ہے اور وہ نفع جس میں نقصان کی آمیزش ہو وہ گھٹیا ہے۔ مسلمانوں کی توجہ ایسے نفع کی طرف رہی جس میں نفع ہی نفع ہے۔ مضرت کی آمیزش کا کوئی شائبہ نہیں ہے تو عقلمند کون ہے وہ جس نے نفع ہی نفع حاصل کیا یا وہ جس نے ایسا نفع حاصل کیا جس میں مضرت کی آمیزش ہو مسلمانوں کی توجہ ہمیشہ اعلیٰ اور اہم شے کی طرف رہی۔ البتہ یہ بات ضرور ہوئی کہ تھوڑا سا وقت تکلیف سے گذر گیا وہ بھی کسی کسی کا ہر شخص کا نہیں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین نامردمت بنو۔ رنج مت کرو۔ تم ہی اعلیٰ رہو گے اگر تم مومن رہے۔ ایمان کی کمزوری سے دکھ پہنچتا ہے۔ ورنہ اب بھی کوئی تکلیف نہ ہو اگر قرآن پر صحیح عمل ہو۔ بات یہ بتانی تھی کہ نبیؐ میں اور کم عقل

آدمی میں حسِ مشترک ہے اور کوئی شے مشترک نہیں ہے۔ اس وقت اگر نبیؐ ہو تو وہ بھی یہی بتائے گا کہ سورج نکلا ہوا ہے۔ اس وقت ۱/۲ ۳ بجے ہیں۔ ایک انگلی کو نبیؐ بھی دیکھے گا۔ تو ایک ہی انگلی بتائے گا۔ دو نہیں بتلائے گا۔ قرآن کے دلائل ایسے ہی حسی ہیں کہ بڑا سے بڑا عقلمند آدمی بھی جانتا ہے اور کم سے کم درجہ کی عقل والا انسان بھی جانتا ہے۔ یہ طریقہ قرآن نے اختیار کیا ہے۔ اسی لئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور شک کی نفی یوں کر دی کہ شک اس چیز کو کہتے ہیں کہ اس میں ہونے نہ ہونے سچ اور جھوٹ میں التفات برابر ہو۔ کچھ سچی معلوم ہوتی ہے اور کچھ جھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ تو ایسی کوئی بات قرآن میں نہیں ہے۔ جو بات کہی گئی ہے۔ وہ بالکل سچی ہے۔ اور جو شیاطین نے کہی وہ قطعی جھوٹی ہے۔ اس کا رد کر دیا۔ قرآن کے مقدمات حسی ہیں عقلی نہیں ہیں۔ کیونکہ کم عقلوں پر خدا کی حجت پوری ہو چکی اگر عقلی باتیں ہوتیں تو ان کی حجت خدا پر ہو جاتی۔

مادہ قدیم ہے

حکمار کا یہ مذہب ہے کہ مادہ قدیم ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے انھوں نے
یہ ثابت کیا کہ جسم مرکب نہیں ہے۔ جس شے میں لمبائی چوڑائی اور عمق پایا جائے
اس کو جسم کہتے ہیں اور جن اجزار سے جسم کی ترکیب ہوتی ہے ان کو اجزائے مقدارِیہ
کہتے ہیں۔ علمائے متکلمین یہ کہتے ہیں کہ جسم مرکب ہے۔ اجزائے لاتتجزا سے۔ اجزا
لاتتجزا ان کو کہتے ہیں جن کے ٹکڑے نہ ہو سکیں۔ یہ ننھے ننھے اجزار ہوتے ہیں۔
جن کی نہ حسّی تقسیم ہو سکتی ہے نہ آلہ سے تقسیم ہو سکتی ہے، نہ وہم میں تقسیم ہو سکتی ہے
نہ عقل تقسیم کر سکتی ہے۔ عقل کے تقسیم نہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس تقسیم پر کوئی
دلیل بیان نہیں کر سکتے یعنی نہ خارجی تقسیم ہو سکتی ہے نہ وہمی تقسیم ہو سکتی ہے۔ یہ بنیاد ہے
کہ جسم ایسے اجزا سے مرکب نہیں ہے اور متکلمین کہتے ہیں کہ جسم ایسے اجزا سے مرکب
ہے۔ حکمار کی دلیل یہ ہے کہ اگر جسم کی ترکیب ایسے اجزار سے ہوگی تو خطِ مستقیم کی تنصیف
نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ خط کی تنصیف کو مہندس نے ثابت کیا ہے اور ترکیب طاق اجزا
سے بھی ہو سکتی ہے اور جُفت اجزار سے بھی ہو سکتی ہے۔ اگر طاق اجزا سے ترکیب ہوگی
تو تنصیف نہیں ہو سکتی کیونکہ تقسیم ہوتے ہی ایک جز کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور جسم
مرکب ہے سطح سے، سطح مرکب ہے خط سے۔ یہ مہندس نے ثابت کیا ہے کہ خط کی تنصیف
ہو سکتی ہے لہٰذا جسم مرکب نہیں ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ سمجھے نہیں۔ یہ تو جب ثابت ہوگا کہ
جب سطح غیر مرکب ثابت ہو جائے لیکن تم سطح کو مرکب تسلیم کرتے ہو تو جسم غیر مرکب کہاں

دوسری بات یہ ہے کہ ہندسے کی جتنی دلیلیں حکمائے بیان کی ہیں سب غلط ہیں
کیونکہ ہر شکل ہندسیہ اس بات پر منحصر ہے کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم کھینچ سکتے ہیں
اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خط نہیں کھینچ سکتے تو شکل ہی غلط ہو جاتے گی اور اس پر جو
دلیل قائم کی جائے گی وہ خود بخود غلط ہو جائے گی۔

ہندسے کے تین اصل موضوع ہیں

۱۔ دو نقطوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں (۲) خطِ مستقیم کو دونوں طرف جتنی دور کا
تک چاہیں۔ بڑھا سکتے ہیں
(۳) ایک نقطے کو دائرہ فرض کر کے جتنی دوری سے چاہیں دائرہ بنا سکتے ہیں۔

اصل موضوع اس بات کو کہتے ہیں جو نہ بدیہی یا ظاہر ہو اور
نہ وہ دلیل سے ثابت ہو۔ یعنی نظری بھی نہ ہو۔ یہ تینوں باتیں ایسی ہیں کہ دلیل سے ثابت نہیں
ہیں۔ کیونکہ جس طرح اور شکلوں کو ثابت کیا ہے۔ ہندس نے ان کو ثابت نہیں
کیا۔ اور بدیہی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر بدیہی ہوئیں تو علوم متعارفہ
میں ان کو شامل کیا جاتا مگر نہیں شامل کیا۔

علوم متعارفہ بارہ ہیں۔ یعنی برابر مقداروں میں برابر مقدار میں
جمع کریں تو مجموعے برابر ہوں گے، اس طرح اگر گھٹائیں، ضرب یا تقسیم کریں تو نتائج
برابر آئیں گے وغیرہ۔ ان کو تو محض استاذ کے حُسنِ ظن پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایسی باتوں
کو مُسلّمات کہتے ہیں۔ مسلمہ کے معنی یہ ہیں کہ ثابت نہیں ہے۔ یعنی اس کو مفادِ عامّہ کے پیشِ
نظر بغیر دلیل کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ مسلمات ہیں کہ سچ اچھی چیز ہے، جھوٹ بُری چیز
ہے۔ والدین کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ یہ باتیں مفادِ عامّہ کے پیشِ نظر تسلیم کر لی گئی

ہیں۔ دلیل سے ثابت نہیں ہیں۔ دلیل تو اس کے خلاف جا رہی ہے۔ یہاں بحث عقلی ہو رہی
ہے۔ مذہبی بات سے بحث نہیں ہے۔ عقل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ والدین کی اطاعت
فرض ہے بلکہ نظام عالم کی بہبود کے پیش نظر جو چیز مفید معلوم ہوئی اس کو تسلیم کرلیا اور جو
چیز غیر مفید یا خلل انداز تھی اس کو ممنوع قرار دے دیا۔ آگ گرم ہے تو آگ کے
ساتھ ہی گرمی کا تصور آئے گا۔ سورج کے ساتھ روشنی کا تصور آئے گا۔ اور اسی طرح
اگر صدق اچھی چیز ہوتا تو اسے سنتا بھی اچھائی کا تصور ذہن میں آتا۔ مگر کسی نقصان کی سچی
خبر سن کر دل اسکو قبول نہیں کرتا بلکہ خواہش ہوتی ہے کہ خبر غلط ہو۔ جھوٹ کے خیال
کرتے ہی جو تمانی کا تصور آتا ہے۔ صدق اچھی چیز ہوتی تو دل اس کو قبول کرتا مگر
چونکہ نظام عالم کا بیشتر مفاد سچ پر موقوف ہے اس لئے اس کی اچھائی کو قبول کرلیا
یہ دلیل یا عقل کا تقاضہ نہیں ہے۔ اگر کذب طبیعت کے مناسب ہے تو اس میں کیا
برائی ہے؟۔ شریعت میں بھی اگر نبی کے دشمن دریافت کریں نبی کہاں ہے؟ نبی کو ان
کی ایذا سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا فرض ہے۔ نبی کی جان بچانے کے لئے جھوٹ
بولنا مومن کی طبیعت کے عین مناسب ہے۔ یا بے گناہ کی جان بچانے کی قدرت ہو اگر
تو جھوٹ بول کر بے گناہ کی جان بچانا صدق سے بہتر ہے یعنی وہ عقلی چیز نہیں ہے۔ بغیر
جُرم سابق کے کسی کو دکھ دینا بُری چیز ہے۔ یہ مسلمات میں سے ہے عقل کا تقاضہ نہیں ہے
اگر یہ بُری چیز ہوتی تو ہر جگہ بُری ہوتی۔ مگر تمام نابالغوں میں، تمام مجانین، تمام جانوروں
میں کہیں بھی بُری نہیں ہے۔ اگر یہ ایسا کریں تو کوئی جُرم نہیں، کوئی سزا نہیں۔ عاقل بالغ
کے علاوہ کہیں بُرا نہیں۔ خالق کائنات میں بھی نہیں۔ بغیر جرم سابق کے خالق برابر دکھ
دے رہا ہے۔ تمام بچوں کو بیماریاں دے رہا ہے۔ مار رہا ہے۔ جانوروں کے متعلق کہہ رہا ہے

کہ ان کو ذبح کرو، پکاؤ، کھلاؤ اور کھاؤ اور مزید انعام پاؤ۔ خالق نکل گیا۔ پوری کائنات سوائے انسان کے نکل گئی۔ انسان میں بھی بچہ اور مجنون نکل گیا۔ صرف عاقل بالغ انسان بغیر جرم سابق کے دکھ دے گا وہ بُرا ہوگا۔ اگر ایذا رسانی بُری چیز ہوتی تو جہاں ایذا رسانی ہوتی وہاں برائی آجاتی۔ اکثریت میں بُرا نہیں ہے۔ پوری کائنات میں انسان تو اقلیت میں ہے نا۔ عقلی ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ ہر جگہ بُرا ہو۔ تو یہ سب مسلّمات میں سے ہے۔ کیونکہ نظامِ عالم اس پر موقوف تھا۔ پوری قوم انسان نے اس کو تسلیم کیا۔ ہر فن، ہر جزئیات میں مسلّمات ہیں۔ یہ مسلمات عامّہ کہلاتے ہیں۔ ہر جماعت کے مسلمات ہیں، جیسے گائے کا کھانا ہمارے یہاں اچھی چیز ہے، ہندوؤں کے یہاں بہت بری بات ہے، جرم ہے۔ اسی طرح اہلِ ہندسہ نے چونکہ تمام اشکال کا دار و مدار ان تین اصولوں پر رکھا تھا اس لئے ان کو بغیر دلیل کے تسلیم کر لیا ہے۔ اب اصل بحث پر آتے ہیں۔

بڑی سخت غلطیاں کی ہیں ان علمانے۔ یہ فلسفی جتنے ہیں بڑے عالم ہیں اور جہنمی ہیں۔ اسی لئے تو کہا "قاتلوا ائمہ الکفر" کافروں کے بڑے بڑے اماموں کو قتل کرو۔ جب یہ دب جائیں گے تو عوام تو خود بخود دب جائیں گے۔

اب غور کریں اس میں کیا خرابی ہے؟

اِس میں خرابی یہ ہے کہ اگر سطح اجزاء سے مرکب ہوگی۔ تو اس وقت ہر دو نقطوں کے درمیان خط نہیں ملے گا۔ بلکہ خط اس وقت ملے گا کہ سطح کے دو نقطے ایک دوسرے کے محاذ اور مقابل میں ہوں۔ مثلاً شطرنج کے خانے ہیں۔ فیل اور وزیر یا اونٹ کی چال کے خانے آڑے اور سیدھے سب ایک دوسرے کے محاذ میں ہیں آن

میں خط بن جائے گا۔مگر گھوڑے کے ڈھائی گھروں میں خطِ مستقیم نہیں بنے گا۔
دو خانوں میں تو بن جائے گا۔مگر تیسرا چونکہ ہٹا ہوا ہے وہاں خطِ مستقیم نہیں بنے گا۔
یعنی نقطوں کے درمیان خط اس وقت بنے گا جب دونوں محاذ میں ہوں تو یہ ثابت
نہیں ہوا کہ سطح کے دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم کھینچ سکتا ہے۔ اس لئے سطح کی
ترکیب اجزا سے ہے۔ یہ ثابت نہیں ہوا۔ اب تمام شکلیں جو اس اصول پر بنی ہیں،
باطل ہو گئیں۔ تو پھر ان شکلوں پر استدلال کرنا کہ ترکیب سطح کی اجزا سے نہیں ہے
یہ باطل ہو گئی۔ تو جتنے استدلال فلاسفہ نے اشکال ہندسیہ سے کئے ہیں۔ سب غلط
ہیں۔ کیونکہ شکل تو ثابت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ متصل نہ ہو ــــــ سطح بسیط
ہو متصل۔ شکل بن نہیں سکتی۔ اجزا سے تو ان سے استدلال کرنا یہ الٹا ہو جائے گا
یہ غلطی ہوئی۔ متصل ہو جائے گی۔ یہ جز یہ جز۔ یہ جز سب الگ الگ۔

بحر العلوم نے یہ بیان کیا کہ میرے پاس ایک بے مشقت کی (سہل) برہان ہے
ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر اجزا سے ترکیب ہو گی تو جتنے اجزا ہوں گے،
اتنا عدد ہو گا۔ اگر ۱۰۰ اجزا ہوں گے تو ۱۰۰ کا عدد متحقق ہو جائے گا۔ تو جو حکم
اعداد کا ہے وہی مقدار کا ہو جائے گا۔ اور عدد میں مربع کا دو چند مربع ہوتا نہیں۔
اشکال ہندسیہ میں یہ ثابت ہے کہ مربع کا دو چند مربع ہوتا ہے۔

ثابت یہ ہے کہ مثلث قائم الزاویہ میں وتر کا مربع بقیہ دو ضلعوں کے
مجموعے کے برابر ہو گا اور اگر یہ ضلع برابر ہوں تو گویا دو چند ہو گیا۔ تو علم ہندسہ
میں یہ ثابت ہو گیا کہ۔ مربع کا دو چند مربع ہوتا ہے اور علم عدد میں یہ ثابت ہے کہ
مربع کا دو چند کبھی مربع نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہو گیا کہ یہ جو شکل ہے (اس میں یہ اجزا

سے مرکب نہیں ہے تو معلوم ہوگیا کہ جسم کی ترکیب اجزا سے نہیں ہے کیونکہ) عدد موجود نہیں ہے۔ جب عدد نہیں تو معدود نہیں یعنی اجزا نہیں ہیں۔ غیر مرکب ہے۔ ایک شخص بحرالعلوم گزرا ہے۔ بڑی لمبی لمبی عبارتیں مشکل لکھا کرتا تھا۔ اس لئے اس کا لقب بھی بحرالعلوم ہوگیا۔ اس کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ اس کی ایک اور غلطی بھی میں نے پکڑی ہے

مہندس نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر تین عدد متناسب ہوں اور اس میں پہلا مربع ہو تو تیسرا عدد بھی مربع ہوگا۔ مثلاً

۱:۲:۴ یا ۲:۴:۸ یا ۴:۸:۱۶

میں نے خود حاشیہ پر لکھا ہوا دیکھا ہے۔

اس سے بحرالعلوم نے یہ استدلال کیا کہ دوسرا عدد چونکہ دوچند ہے پہلے کا اس لئے یہ مربع نہیں ہوگا۔ سب اس کو سچ سمجھ رہے تھے۔ میں نے کہا یہ غلط ہے اس نے تیسرے کو مربع کہا ہے۔ دوسرے سے بحث نہیں وہ کبھی ہوگا کبھی نہیں ہوگا۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ بات بھی غلط ہے۔ مہندس نے یہ ثابت نہیں کیا کہ مربع کا دوچند مربع ہوتا ہے بلکہ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دو مستطیل کا مجموعہ مربع کے برابر ہے۔ اس نے بھی وہاں مربع کا دوچند ثابت نہیں کیا ہے۔ کیونکہ مربع کو جب آپ دو حصوں میں تقسیم کریں گے تو مستطیل بنے گا۔ مربع وہاں بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو یہ ثابت کر رہا ہے کہ ایک مربع ایک مستطیل کے برابر ہے تو فلاسفہ کا مذہب خاک میں مل گیا۔ یہ بات میں نے ہی کہی ہے۔ پہلے کسی نے نہیں کہی کہ جس طرف سے بھی مربع کو مربع پر رکھیں گے مستطیل بنے گا مربع نہیں بنے گا اس لئے کہ مربع کو عدد لاحق ہوچکا اس کی الگ شخصیت ہوگئی مضمون نگاری اور لٹریچر یہ الگ چیز ہے اس کا علم سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے

عقائد فرقہ ہائے اسلامیہ

غیر مسلمین کے عقائد کے مسائل تو حضور اکرم صلعم کی نبوت ثابت ہونے کے بعد ختم ہو چکے۔ اب مسلمانوں کے جو فرقے ہیں اور اُن کے جو عقائد باطلہ ہیں اُن پر بحث ہوگی۔

اب ایک اصولی بات ہے پہلے اس کو بیان کر دوں جو میں نے حکیم اجمل خان کی مجلس میں بھی بیان کی تھی۔ ان کو ان باتوں کا بڑا شوق تھا اور اہلِ علم حضرات ان کی مجلس میں آتے تھے اور وہ علم کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی بہت بڑے عالم تھے۔ اکثر خاموش رہتے، بولتے بہت کم تھے۔ ان کی مجلس میں مَیں بیان کر چکا ہوں

ایک نصرانی آیا۔ اس کے متعلق یہ شہرت ہوئی کہ وہ اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم ہے۔ اور حضرت امام رازیؒ سے مناظرہ ہوا۔ امام صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ ہر عالم میں کوئی نہ کوئی خوبی اور کمال ہوتا ہے۔ یہ اتنے بڑے عالم ہیں کہ ہر علم میں ان کی مثال نہیں ہے۔ متقدمین کے مضامین کو جتنا یہ سمجھے ہیں کوئی نہیں سمجھا — امام غزالیؒ کے بیان میں ژولیدگی ہے۔ ان کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ امام رازی کا بیان بہت صاف ہے۔ اتنا صاف کہ ان سے واضح بیان میری نظر سے نہیں گزرا۔ استدلال کا فن

اُن پر ختم ہوگیا۔ انھوں نے معتزلہ اور حکماء کو دونوں کو ختم کر دیا۔ ان کے بعد یہ فرقہ باقی نہیں رہا۔ معتزلہ فرقہ اب کہیں نظر نہیں آتا۔ گو وہ جراثیم سب میں پھیل گئے ہیں۔ مگر فرقے کی حیثیت سے وہ ختم ہوگیا۔

معتزلی وہ فرقہ ہے جو مذہب کو عقل کے مطابق کرتا ہے۔ فلسفیوں کی ایک جماعت وہ ہے جو اسلام نہیں لائی غیر مسلم ہے اور دوسری جماعت وہ ہے جو مسلمان تو ہیں۔ مگر ان کے تمام علوم فلسفی ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ جو بات قطعی الثبوت ہے، تو اگر وہ عقل کے خلاف ہوگا تو اس کی تاویل کریں گے کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے، یہ ہے۔ اور جو بات قطعی الثبوت نہیں ہے ظنی الثبوت ہے اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ یعنی ایسی حدیث جو عقل میں نہ آئے اس سے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔ یہ ہے ان کا کام۔ گویا تمام مذہب کو عقل ہی سے دیکھتے ہیں۔ اس فرقے کو امام رازی نے بالکل ختم کر دیا۔ تو عیسٰی علیہ السلام کے متعلق انھوں نے رسالت ثابت کی۔ تو اس نے کہا کہ، میں ان کو رسول نہیں مانتا۔ بلکہ ابن اللہ جانتا ہوں۔ کیونکہ احیاء خداوندی صفت ہے۔ مردے کو زندہ کر دینا۔ اندھے کو بینا کر دینا۔ یہ خدا کے فعل ہیں۔ اس لئے میں ان کو خدا مانتا ہوں انھوں نے اس کا رد کیا کہ اعجاز احیاء موتیٰ دلیل ہے الوہیت کی۔ یہ بتاؤ کہ دلیل کے نہ ہونے کو مدلول کا نہ ہونا لازم ہے یا نہیں؟ عدم دلیل کو عدم مدلول لازم ہے یا نہیں؟ اگر تم اس دلیل کو مانتے ہو کہ عدم دلیل کو عدم مدلول لازم ہے۔ یہ عالم دلیل ہے صانع عالم کی اور ازل میں عالم کا عدم ہے اور نفی ہے۔ عالم دلیل ہے خدا کے وجود کی۔ اور ازل میں عالم کی نفی ہے اور عدم دلیل کو عدم مدلول لازم ہے، تو عدم عالم سے عدم خالقِ عالم لازم آیا۔ یہ صریحًا غلط ہے اور اگر تم اس کو مانتے ہو تو عدم دلیل کو عدم مدلول

لازم نہیں ہے۔ یعنی اگر دلیل نہ ہو تو یہ لازم نہیں آتا کہ مدلول بھی نہ ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ مدلول ہو۔ یہ اعجاز موتیٰ کا عدم انسان میں، جانور میں اور سب جگہ موجود ہے یعنی ان میں سے کوئی خارق عادت نہیں ہے۔ کوئی بھی صاحبِ معجزہ نہیں ہے اور معجزہ دلیل ہے الوہیت کی اور عدم دلیل کو عدم مدلول لازم نہیں ہے اور تمام اشیائے کائنات میں معجزہ کا نہ ہونا ثابت ہے۔ تو اس کا امکان ہے کہ یہ سب خدا ہو جائیں عدم اعجاز کہتے ہیں متحقق ہے اور اعجاز دلیل ہے الوہیت کی تو عدم اعجاز عدم دلیل ہوا۔ الوہیت کو عدم مدلول ہونا لازم نہیں ہے تو کتا مدلول ہو سکتا ہے۔ یعنی الوہیت ہو سکتی ہے تو کتے میں الہیت ہو سکتی ہے۔ فقطع النصرانی۔ یہ ان کے لفظ ہیں کہ نصرانی ساقط ہو گیا بند ہو گیا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ جس شخص سے غلطی ہو اس کو تو سمجھیں بڑا عالم ہے اور جس شخص سے غلطی نہ ہو وہ نبی ہے۔ نبی سے غلطی نہیں ہو گی۔

اللہ کے جو خاص بندے ہیں ان کے لئے فرمایا: رَبَّنَا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا۔ یہ رؤسائے صدیقین ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ امام وغیرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ جب ان لوگوں سے غلطی ہو سکتی ہے تو یہ لوگ تو ان سے بہت پیچھے ھیں۔ حکیم اجمل خان کے یہاں تو بڑے بڑے علماء جمع رہتے تھے۔

میں نے کہا "یہ صحیح نہیں ہے غلط ہے جو امام رازی نے کہا" تو ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ ان کو ایسی علمی باتوں کا بہت شوق تھا۔ ایسے بڑے عالم کے متعلق یہ کہدینا، کہ "وہ نہیں سمجھے، غلط کہا" یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔

میں نے کہا "یہ جو انھوں نے فرمایا کہ اگر عدم دلیل کو عدم مدلول لازم ہے تو خالقِ عالم کی ازل میں نفی ہو جاتی ہے کیونکہ ازل میں عالم کی نفی ہے۔ اور عالم دلیلِ وجود باری ہے۔ یہ بات

غلط ہے۔ عالم وجودِ باری کی دلیل نہیں۔ عالم اللہ پاک کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔
دلالت تو جب کرے گا جب کوئی علاقہ ہوگا اور وہ پیدا ہوا ہے اس کی مشیت اور قدرت
سے اور اختیار سے، ذات سے پیدا نہیں ہوا۔ سورج کی چمک سورج کی ذات سے پیدا
ہوئی ہے۔ تو اس کی نفی سے سورج کی نفی ہو جائے گی۔ جو چیز اختیار سے بنے گی اس کی نفی
سے صانع کی نفی نہیں ہوگی۔ مثلاً مکان معمار نے بنایا۔ اگر اس کو منہدم کر دیا جائے تو معمار کی
نفی نہیں ہوگی۔

عالم دلیل صانع عالم کی ہے۔ ذاتِ خداوندی کی نہیں ہے۔ اس کی صانعیت کی دلیل
ہے تو ازل میں صانعیت کی نفی لازم آتی ہے۔ یہ حق ہے اور عین توحید ہے۔ بہت باریک بات ہے۔
یہ بات میں نے ہی کہی ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔

اب دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ اگر عدم دلیل کو عدم مدلول لازم نہیں ہے تو جتنے جانور
ہیں سب خدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح تم اس کا ذکر کر رہے ہو کہ احیا موتیٰ کا
معجزہ دلیل ہے دلیل ہے نصرانی کے نزدیک۔ مگر تمہارے نزدیک معجزہ دلیل نبوت تو ہے تو یہی
دلیل وہاں بھی جاری ہوگی کہ اگر عدم دلیل کو عدم مدلول لازم نہیں ہے تو ساری کائنات رسول ہو گئی۔
کیونکہ ان سب میں معجزہ نہیں ہے۔ تو اس میں یہ غلطی ہے۔ اب یہاں ایک بھید ہے جو سمجھ لینا ضروری ہے

اعجاز دلیلِ الوہیت اس وقت ہوگا جب صاحبِ اعجاز کا معجزہ اس کا عادی فعل ہو۔ اگر
اس کا یہ فعل عادی نہیں ہے کبھی اتفاق سے ہو جاتا ہے تو وہ رسول ہے۔ فعل کرنے والے کا فعل اگر
یہ فعل عادی ہے تب تو وہ خدا ہے اور اگر اس کا یہ فعل عادی نہیں غیر عادی ہے تو وہ رسول
ہے۔ کیونکہ عیسیٰ کی عادت کھانے پینے کی تھی چلنے پھرنے کی۔ بولنے کی اور مرنے کا پیدا کر دینا
اور زندہ کر دینا یہ ان کی عادت نہیں تھی۔ عادی فعل محض اپنے ارادے سے انسان کرتا ہے۔ احیاءً

موقی ان کا ایسا فعل نہیں تھا جیسے کھانا پینا چلنا ان کا فعل تھا۔ اگر وہ اعجاز اپنے اختیار سے برابر کرتے رہتے تو وہ بلاشک خدا ہو جاتے لیکن ان کا یہ فعل خلافِ عادت تھا اور خدا اس فعل کا عادی ہے۔ وہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کی یہ عادت ہے کہ وہ بے مکان معجزہ کرتا رہتا ہے۔ نبی کی یہ عادت نہیں ہے۔ یعنی وہ اپنے اختیار سے نہیں کر رہا ہے بلکہ کسی اور کے اختیار سے یہ ہو رہا ہے۔ جس کے اختیار سے ہو رہا ہے وہی خدا ہے اور یہ اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کا مردے کو زندہ کرنے کا معجزہ دلیل الوہیت نہیں ہے۔ بلکہ دلیل رسالت ہے۔ معجزہ نبی کی عادت نہیں ہوتا۔ اپنے ارادے اور اختیار سے نہیں کرتا۔ قوم مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا کرو تو بحکم الٰہی ایسا کرتا ہے۔

اگر ولی سے کہو کہ کرامت کرو تو وہ کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی بیمار ہوا اس نے دعا کی اور اتفاق سے وہ قبول ہو گئی تو ایسا اتفاق ہو جاتا ہے۔

نبی اور ولی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ نبی کے معجزے میں دعویٰ ہوتا ہے۔ ولی کی کرامت میں دعویٰ نہیں ہوتا۔

میں نے آپ کو ایک طریقہ بتایا کہ مضمون کیوں کر کھینچا کرتے ہیں۔ مجھے اس کا پورا طریقہ معلوم ہے لیکن نہ کسی نے مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے کسی کو بتایا۔ مجھے اس کا شائق کوئی نہیں ملا کچھ کچھ یہ بات فارابی کو معلوم تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کا سب سے بڑا آدمی تھا۔ مگر میری نظر سے اس کی کوئی کتاب نہیں گذری۔ ایک رسالہ میں نے دیکھا ہے اس میں چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں معمولی معمولی کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں جس طریقے کو پسند کرتا ہوں اگر وہ چل پڑے۔ مجھے اس کا بہت شوق تھا۔ اب شوق ختم ہو گیا۔ بڈھا ہو گیا۔ مگر مجھے اس کا طالب اور شوقین کوئی نہیں ملا۔ حکیم اجمل خان صاحب کو میں نے اس قسم کی بہت سی باتیں سنائی وہ اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ غیر مسلم قوموں کی بحثیں تو آپ سن چکے۔ اب مسلم فرقوں کی گمراہیاں آپ

کے سامنے میں بیان کرتا ہوں۔

۱۔ پہلا فرقہ مجسمہ کا ہے۔ جو کہتا ہے اللہ کے جسم ہے۔ ہم توحید کے قائل ہیں وہ تشبیہ کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ دو چیزوں کے بارے میں تو ہم سے پوچھو نہیں:۔

ایک اللہ کی ڈاڑھی ہے یا نہیں؟ اور دوسرا مخصوص عضو، باقی چیزیں۔ ہاتھ کان آنکھ وغیرہ سب خدا کے ہیں۔ انھوں نے خدا کے جسم ہونے کی دو دلیلیں بیان کی ہیں۔

ایک بات انھوں نے یہ کہی کہ معقولات میں دو چیزیں ہیں:۔

ایک جوھر، دوسرا عرض۔

جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہو۔ لیکن یہ تعریف غلط ہے۔ کیونکہ ایک چیز وہ ہے جو قائم ہے اور ایک وہ ہے جو ما قام ہے۔ تو دو چیزیں ہوئیں وہ ایک چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ حدود کلام ہے۔ تعریف صحیح ہونی چاہیئے۔

حدود کلام پر ایک رسالہ حکیم ارسطو نے لکھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ فارابی نے کیا اس کا خلاصہ شیخ الرئیس نے کیا۔ اس کا نام شفا رکھا مگر وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ کہتے ہیں کہ امام نے فارابی کا رسالہ خود ہی جلا ڈالا۔ علم الحساب اتنا بیّن علم ہے اس میں بھی کئی غلطیاں ہیں جو میں نے پکڑی ہیں کسی وقت بتاؤں گا۔ مثلاً ایک خطِ مستقیم کے دوسرے خطِ مستقیم پر واقع ہونے سے اگر دونوں طرف زاوئے برابر کے پیدا ہوں تو ان میں سے ہر ایک زاوئے کو قائمہ کہتے ہیں۔ یہ حد صحیح نہیں ہے کیونکہ کرہ کے اوپر کے جو دو کرتے ہیں اگر ایک کرہ کو دوسرے کرے سے قطع کریں تو بھی زاویہ قائمہ چار پیدا ہوں گے تو صحیح تعریف یہ ہوگی کہ تقاطع خطین سے اگر چاروں برابر کے زاوئے پیدا ہوں تو ان میں ہر ایک زاویہ قائمہ ہوگا۔ اگر میری طبیعت ٹھیک ہوگئی تو ایسی بہت سی باتیں آپ کو بتاؤں گا۔ حکیم اجمل خان کو ایسی بہت

سلہ اس کی وضاحت صفحہ پر ہے۔

سی باتیں میں نے سنائی ہیں۔ آپ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے رحم کی درخواست کریں۔ یہاں بھی تو بادشاہ سے رحم کی درخواست کی جاتی ہے۔ بادشاہ مجرم کو تو چھوڑ سکتا ہے مگر بے گناہ کو پھانسی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ مجرم کو چھوڑ دینا بہتر ہے بے گناہ کو پھانسنے سے۔ یہ امام ابو یوسف کا فتویٰ ہے اور انگریزوں نے وہیں سے لیا ہے۔ اگر وقت ملا تو آپ کو بتاؤں گا کہ جتنا یورپ کا قانون فوجداری اور دیوانی ہے اگر وہ سب صحیح ہے امام ابو یوسف ہی سے اخذ کیا ہے۔ میں، جو چیز معلوم نہیں ہوتی، بیان نہیں کرتا جس میں شک ہو وہ بیان نہیں کرتا۔ صرف وہی بات بیان کرتا ہوں جس پر مجھے پورا اطمینان ہو یہ بات الگ ہے کہ میرا اطمینان ہی غلط ہو۔ مگر جب تک مجھے اطمینان نہیں ہوتا کوئی چیز بیان نہیں کرتا۔ بڑے بڑے اماموں سے غلطی ہوتی ہے۔ میں ان کے مقابلے میں کیا ہوں؟۔

انھوں نے دلیل یہ بیان کی کہ دو چیزیں معقولات میں سے ہیں۔ ایک جوہر ایک عرض عرض چونکہ قائم ہوتا ہے دوسرے کے ساتھ لہٰذا وہ دوسرے کا محتاج ہے۔ اور خدا محتاج ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا وہ عرض نہیں ہو سکتا تو لابد وہ جسم ہے۔ اس پر امام حزم نے یہ اعتراض کیا کہ یہ تقسیم غلط ہے معقولات میں نہیں بلکہ عالم میں دو شے (اشیا) ہیں۔ جسم یا عرض مگر یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ عالم میں روح موجود ہے۔ روح نہ جسم ہے نہ عرض ہے صحیح تقسیم یہ ہونی چاہیئے کہ محسوسات میں جو چیزیں ہیں وہ یا عرض ہوں گی یا جسم ہوں گی۔ اصولی غلطی ہے۔ خود حس غیر محسوس ہے۔ حالانکہ تمام دوسری اشیاء کو وہ محسوس کرتی ہے۔ جب خود حس حس سے خارج ہو گئی تو خدا کا کہاں پتہ ہوگا۔ غیر محسوس چیز ہی محسوس ہی میں تفتیش کرنے سے نکل آتی ہے۔ میں اور آپ اور دوسرے لوگ سب انسان ہیں۔ انسانیت میں سب برابر کے شریک ہیں لیکن میری ذات سولہ آنے آپ سے مختلف ہے۔ ہر انسان کی ذات ہر دوسرے

انسان کی ذات سے سولہ آنے مختلف ہے۔ نہ انگلی انگلی سے ملے گی نہ ناخن ناخون سے ملے گا۔ اتنے بین فرق کی موجودگی میں ذات غیر محسوس ہے اس کا پتہ نہیں تو خدا کا کہاں پتہ چلے گا تو گویا ان لوگوں نے خدا کی "تلاش" کا مدار حس پر ہی رکھا۔ پھر اگر اللہ جسم ہوگا تو جسم شش جہات سے گھرا ہوا ہوتا اور مرکب ہوتا ہے اور مرکب اپنی ہر چیز سے پیچھے ہوتا ہے اور جو شے اپنے جزء سے پیچھے ہوگی وہ خالق بننے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جسم میں تذکیر و تانیث نہیں ہے جو مشاہدہ کے خلاف ہے اور حس کے بھی خلاف ہے۔ اگر جسم سے تذکیر و تانیث اٹھ گئی تو کل عالم سے تذکیر و تانیث اٹھ گئی۔ پھر انھوں نے یہ کہا کہ یہ ایسا جسم ہے کہ اس جیسا کوئی دوسرا جسم نہیں ہے اس میں اصولی غلطی یہ ہے کہ نام رکھنے کا حق صرف خدا کو ہے۔ خدا نے اپنے لئے جو نام بتلا دیئے ہیں وہ الفاظ تو اس کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ہم کو اس کے لئے کوئی لفظ گھڑنے کا اختیار نہیں۔ اپنے ثبوت میں وہ امام ابوحنیفہ کو لاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے یہ فرمایا خدا کی تعریف میں کہ وہ شے ایسی شے   جو دوسری اشیا جیسی نہیں ہے۔ شی لا کالاشیاء اسی طرح انھوں نے کہا کہ وہ جسم ہے۔ جسم لا کالاجسام مگر شے کا لفظ خدا نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ کل شی ھالک الا وجہہ۔ مگر جسم کا لفظ خدا نے اپنے لئے استعمال نہیں کیا لہٰذا جسم کا لفظ اس کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ الحاد ہے۔ غلط ہے۔

دوسری بات انھوں نے یہ بیان کی کہ جسم فاعل ہے۔ اور اللہ فاعل ہے۔ لہٰذا اللہ جسم ہے اور فاعلیت جسم کے اندر موجود ہے اور فاعلیت خاصہ الوہیت۔ فعال لما یرید جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ فاعل اللہ کے لئے بھی ثابت ہے۔ یعنی اللہ کیلئے فاعل ہونے سے استدلال کیا ہے۔ اس دلیل کا رد یہ ہے کہ جسم فاعل ہے۔ اللہ فاعل ہے۔ یہاں فاعل ہونا دو چیزوں کے لئے ثابت ہے۔

اگر کوئی شے دوسری شئیوں کے لئے ثابت ہو تو دونوں شے آپس میں ایک دوسرے کے لئے ثابت نہیں ہوں گی مثلاً حرارت، آگ اور سورج دونوں کے لئے ثابت ہے تو آگ سورج نہیں ہوگی۔ یہ حدوثِ کلام کی غلطی ہے۔ اس کا علم ان کو نہیں تھا اس وجہ سے یہ غلطی ہوئی۔ اصول صحیح یہ ہے کہ اگر ایک شے ایک شے کے لئے ثابت ہو اور دوسری شے سے منفی ہو تو وہ دونوں ایک دوسرے سے منفی ہو جائیں گی۔ مثلاً آگ گرم ہے۔ برف گرم نہیں ہے۔ لہٰذا آگ برف نہیں ہے۔ حرارت آگ کے لئے ثابت ہے اور برف سے منفی ہے۔ لہٰذا برف آگ سے منفی ہوگئی۔ یہ منطق کی شکلِ ثانی ہے۔ اس کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ یہ حکم خداوندی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شکل سے استدلال کیا ہے

ما قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔ اللہ کی یہود نے ایسی قدر نہیں کی جیسی ہونی چاہیئے تھی۔ اذ قالوا ما انزل اللّٰہ علی بشر من کل شیئ۔ جب یہ کہنے لگے کہ اللہ نے انسان پر کوئی چیز نہیں اُتاری۔ ارسطو عیسیٰؑ سے ۳۳۹ سال قبل تھا۔ اس زمانے میں توریت موجود تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور یونانیوں نے توریت ہی سے یہ سارے علوم نکال کر مُدّون کئے ہیں۔ کیونکہ توریت میں یہی علوم تھے جو قرآن کریم میں ہیں اور طریق استدلال بھی اس کا یہی ہونا چاہیئے جو قرآن کریم کا ہے۔ جس طرح قرآن میں یہ سارے علوم موجود ہیں اسی طرح توریت میں بھی موجود تھے تو انھوں نے ناقدری یہ کی کہ انھوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر نہیں آتارا کچھ، یعنی قرآن اور نبی کا انکار کیا۔ ان کا عقیدہ یہ کہ موسیٰ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور ان کی شریعت دائمی ہے جو آئے گا ان کی شریعت کا پیرو ہوگا۔ یہودی نسخ کے قائل نہیں ہیں۔

قل ان انزل الکتاب الذی جاء بہ الموسیٰ یہودیوں کی بات کا رد کیا
کہ اے رسولؐ اللہ ان سے کہہ کہ موسیٰ جو کتاب لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی؟۔ اگر
انکار کرتے ہیں تو یہودیت سب ختم ہو تی ہے تورات کا انکار ہوتا ہے۔ تو پہلی بات انھوں نے
یہ کہی کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا۔ یعنی کوئی بشر منزل من اللہ نہیں ہے اور موسیٰ
منزل من اللہ ہیں۔ سالبہ کلیہ کا موجبہ جزئیہ سے رد کر دیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ موسیٰ کا
منزل من اللہ ہونا تو ثابت اور ہر بشر سے منفی تو موسیٰ بشر سے منفی ہو گئے
۔ مگر موسیٰ بشر ہیں تو یا تو دونوں مقدمے غلط ہیں یا ان میں سے ایک غلط ہے۔ دونوں
غلط نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ مقدمہ صحیح ہے کہ موسیٰ منزل من اللہ ہیں۔ لہٰذا مقدمہ کہ کوئی بشر
منزل من اللہ نہیں ہے، غلط ہے۔ تو یہ آیت قرآنی شکل دوسری منطقی پر مشتمل ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ "اللہ فاعل ہے" کے یہ معنی ہیں کہ اللہ موجب ہے ایجاد کرتا
ہے۔ پیدا کرتا ہے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اور جسم کے فاعل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جسم
میں اثر پیدا کرتا ہے۔ اثر چھوڑتا ہے۔ جسم کو پیدا نہیں کرتا۔ پتھر پر لوہے کو ماریں تو پتھر
ٹوٹ جائے گا مگر پتھر پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ موجد ہے اور جسم موثر ہے موجد نہیں ہے۔ تو اللہ
جسم نہیں رہا۔ تو انھوں نے جو دلائل بیان کئے اللہ کے جسم ہونے پر سب غلط ہیں۔

عذاب ہے یا نہیں

مسلمانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک بڑا گروہ یہ کہتا ہے کہ عذاب دوامی ہے اور چھوٹی جماعت یہ کہتی ہے کہ نہیں عذاب نہیں ہوگا۔ جو گروہ یہ کہتا ہے کہ عذاب نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ عذاب جو ہے وہ خالص ضرر ہے۔ اور کسی قسم کی منفعت اس میں نہیں ہے۔ تو یہ بات تو قطعی حق ہے کہ وہ خالص ضرر اور دکھ ہے۔ اور یہ بات کہ اس میں کسی قسم کی منفعت نہیں ہے یہ بھی حق ہے اس لئے کہ اگر منفعت ہوگی تو یا اللہ کی طرف رجوع ہوگی یا بندہ کی طرف رجوع ہوگی۔ اگر منفعت خدا کی طرف رجوع ہوگی تو خدا منفعت سے پاک ہے وہ ان دونوں کا خالق ہے۔ اس سے وہ بری ہے۔ اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ کافر کو جہنم میں جلا کر اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو دکھ دینے میں لذت آتی ہے۔ مسرت ہوتی ہے۔ مگر خدا کو ایسی کوئی راحت نہیں ہوگی۔ کافر کو جلا کر۔ تو خدا کو تو منفعت ہو نہیں سکتی۔ رہا بندہ کا فائدہ۔ تو بندہ کو جلانا اور دکھ دینا اس سے اس کو کوئی راحت نہیں پہنچتی۔ برابر دکھ ہے۔ اب رہا یہ کہ ایک کو جلا کر دوسرے کو خوش کرے۔ تو دوسرے کو فائدہ پہنچانا یہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ اس کو دکھ دینا۔ دکھ سے نجات حاصل کرنا یہ زیادہ اہم ہے اس بات سے کہ راحت کو حاصل کرے۔ یہ بات بالکل عقل کے خلاف ہے کہ ایک کو خوش کرنے کے لئے دوسرے کو ابدی جہنم میں ڈال دے۔ لہٰذا کوئی منفعت عذاب دینے میں نہیں ہے نہ خدا کو نہ بندہ کو۔ نہ جس کو عذاب ہو رہا ہے اس کو نہ غیر کو۔ بلکہ خالص مضرت ہے۔ جب خالص ضرر ہو گیا تو بندہ کو خالص ضرر

پہنچانا اور اس کا ایجاد کرنا یہ فعل قبیح ہے۔ اور خدا قبیح فعل کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خدا مضرت کے فعل کا خالق نہیں ہے تو وہ عذاب نہیں پہنچاتا۔

پھر جب ان سے یہ کہا گیا کہ قرآن میں صاف وعید عذاب کی ہے تو اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اس کو خدا معاف کر دے گا۔ کیونکہ مضرت کی خبر دے کر مضرت نہ دینا یہ اتنا قبیح نہیں ہے۔ جتنا نفع کی خبر دے کر نفع نہ پہنچانا۔ اگر وہ سکھ اور نفع کی خبر دے کر سکھ نہ پہنچاتے تو یہ قابل مذمت ہے مگر دکھ کی خبر دے کر دکھ نہ پہنچانا یہ قابل مذمت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی عنایت ہے اور قابل حمد ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ کہتے ہیں کہ کذب دو قسم کا ہے ایک کذب ضار ہے اور ایک کذب نافع ہے۔ تو کذب بُرا وہ ہے جو کذب ضار ہے۔ جو کذب نافع ہے وہ بُرا نہیں ہے۔ اچھا ہے۔ تو اللہ پاک اگر یہ کہے کہ میں عذاب دوں گا اور عذاب نہ دے تو یہ کذب نافع ہے یہ اچھا ہے۔ انھوں نے ایک باریک بات اور کہی کہ کذب ضار جو ہے وہ بھی اتنی بُری چیز نہیں ہے جتنا کہ ضرر۔ کیونکہ کذب ضار جو ہے وہ ذریعہ ہے یہ اس دوسری شے سے ہلکا ہوتا ہے۔ کذب ذریعہ ہے مضرت کا تو یہ اتنا بُرا نہیں ہے جتنا کہ نفس مضرت۔ اگر کذب ضار بھی ہو تب بھی پرواہ نہیں۔ مضرت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ دلیل انھوں نے بیان کی اور دوسری جماعت نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ عقلی بات ہے نا۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ نبی صلعم سے بالتواتر فجور دوام عذاب کے ساتھ منقول ہے۔ اس لئے ہم نے مان لیا کہ آپ نے یہ فرمایا مگر دلیل کا جواب نہیں دیا۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مضرت کی ایجاد فعل قبیح ہے اور قبیح خدا کا فعل ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا عذاب جہنم خدا کا فعل نہیں ہو سکتا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اس پر دونوں متفق ہیں کہ خدا جو فعل کرے گا وہ قبیح نہیں ہوگا لہٰذا

عذاب جہنم نہیں ہوگا اور یہ جو کہا ہے کہ عذاب ہوگا وہ صرف اس مصلحت سے کہا ہے کہ ڈر باقی رہے اور ڈر کر ممنوع باتوں سے باز رہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن پر ایمان لے آتے۔ اور فلسفی جن کا قرآن پر ایمان نہیں ہے انھوں نے سرے سے انکار کر دیا اور جو فلسفی مسلمان تھے۔ انھوں نے اس کی تاویل کر دی جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے یہ کہا کہ عذاب دوں گا تو یہ جھوٹ بولا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس جھوٹ میں تمام قوم کا فائدہ ہے تو ایسا جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اور ایسا جھوٹ جو نقصان پہنچائے وہ بھی تکلیف دینے سے بہرا چھا ہے۔ مخالف جماعت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر یہ دلیل غلط ہے۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دکھ پہنچانا اور دکھ کا ایجاد کرنا فعل قبیح ہے اور خدا فعل قبیح نہیں کرتا اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہو جائیں تو بے شک دار جہنم کی نفی ہو جائے گی۔ عقلاً اس میں سے ایک بات تو ٹھیک ہے کہ یہ دکھ ہے۔ مگر مضرت اور دکھ کو پیدا کرنا یہ فعل قبیح ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہاں دھوکا ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں برابر پیدا کر کے مار رہا ہے۔ کینسر، ٹی بی اور درد سر دے رہا ہے طرح طرح کی بیماریاں دے رہا ہے اور پھر ان کے بعد وہ موت دے رہا ہے جب وہ یہاں یہ فعل مضرت پیدا کر کے رحیم ہی ہے۔ تو جس طرح وہ یہاں رحیم ہے وہاں بھی وہ عذاب جہنم دے کر رحیم ہی رہے گا۔ اور جس طرح یہاں وہ فعل قبیح نہیں ہے اسی طرح وہ فعل وہاں بھی قبیح نہیں ہوگا۔ جس طرح یہاں دن جا رہے ہیں۔ وہاں بھی جائیں گے۔ یہ موت پر ختم ہو جاتے ہیں وہاں موت نہیں ہے جاری اور ابدی رہیں گے۔ یہاں دکھ موت پر ختم ہو جاتا ہے وہاں موت نہیں ہے جاری رہے گا۔ اب انھوں نے یہ کہا کہ کافر مجبور ہے اور مجبور کو دکھ دینا غیر معقول ہے اور قبیح ہے۔ کافر مجبور ہے کفر پر اس لئے کہ اللہ پاک جانتا ہے کہ یہ کفر کرے گا۔

اس کا علم صحیح ہے۔ اب اگر وہ ایمان لے آئے گا۔ تو اس کا علم جہل سے بدل جائے گا۔ اس کا علم جہل سے بدل نہیں سکتا اس لئے کافر کو کفر کرنا لازم ہے وہ کفر پر مجبور ہے اور مجبور کو عذاب دینا غیر معقول ہے اور اللہ پاک غیر معقول فعل نہیں کرتا اس لئے عذاب جہنم نہیں ہوگا۔ یہ دلیل بیان کی۔ یہ دلیل بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہ غلط ہے کہ کافر مجبور ہے اگر اس کو مجبور تسلیم کر بھی لیا جائے تو کسی مجبور کو تکلیف دینی غیر معقول ہے؟ وہ مجبور ہے کہ جس کی مجبوری شعور میں آگئی ہو۔ اور جس مجبور کی تکلیف شعور میں نہیں آئی اس کو تکلیف دینی غیر معقول نہیں ہے کیونکہ اگر اس مجبور کو تکلیف دینی غیر معقول ہوگی۔ تو یہاں جتنے جرائم ہیں ان کی سزا کیوں دیتے ہو۔ یہاں چور کو، قاتل کو، اور دوسرے مجرموں کو سزائیں دیتے ہو یا نہیں؟ وہ سب مجبور ہیں۔ وہ سارے کام جبری ہیں۔ چور چوری پر مجبور ہے۔ قاتل قتل پر مجبور ہے مگر سارے مذاہب والے ان کو سزا دیتے ہیں۔ جس طرح یہاں مجبور کی تکلیف صحیح اور حق ہے۔ اسی طرح وہاں بھی اس مجبور کی تکلیف صحیح اور حق ہے۔ وہ مجبوری جو مجرم کو سزا سے روکتی ہے۔ وہ مجبوری ہے جو شعور میں آجائے۔ بس یہی راز کی بات ہے۔ جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ بچہ ہے۔ اس سے کوئی جرم ہو گیا۔ اس کو سزا نہیں ہوگی کوئی مردہ ہے وہ کسی صورت سے پلٹی کھا گیا اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا تو مردہ کو سزا نہیں ہوگی۔ کسی نے ہرن کے گولی ماری اور اتفاق سے کسی انسان کے لگ گئی اور وہ مر گیا تو گولی مارنے والے کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔ یا اگر کوئی تلوار لے کر کھڑا ہو گیا کہ عیسائی بن نہیں تو تجھے مار ڈالوں گا تو یہ کھلا جبر ہے۔ اور شعور میں مجبوری آگئی۔ اس لئے کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح اگر کافر حاکم کفر پر کسی کو مجبور کرے اور

یہ کفریہ کلمات کہہ دے تو اس سے اس کو مرتد قرار نہیں دیا جائے گا۔ تو اگر خدائے تعالیٰ نے کافر کے اوپر اسی طرح تلوار لٹکادی ہوتی کہ کفر کر ورنہ مار ڈالوں گا۔ تب تو البتہ اس کو کفر کی سزا دینی غیر معقول تھی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ایسی کوئی تلوار اللہ پاک نے کافر کے سر پر نہیں لٹکائی ہوئی ہے کہ مجبوری ہے۔ کفر پر تو عذاب بھی غیر معقول نہیں ہوگا۔ لہٰذا کافر کو عذاب دینا قطعاً معقول ہے۔ وہ مجبوری جو مانع سزا ہے وہ وہی مجبوری ہے جو یہاں مانع سزا ہے جو مجبوری یہاں کی سزا کی مانع ہے وہی مجبوری وہاں کی سزا کی مانع ہے۔ اور یہ جو کفر و ایمان وغیرہ ہیں وہ ان مجبوریوں میں شامل نہیں ہیں۔ کفر جو تلوار سر پہ رکھ کر سرزد ہوا ہے اور جو کفر اختیار سے ہوا ہے دونوں میں فرق ہے۔ یہ مجبوری سے کر رہا ہے یہ مستحق سزا نہیں ہے اور وہ اپنے اختیار سے کر رہا ہے وہ موجب سزا ہے۔ پھر انھوں نے یہ کہا کہ خالق نے جو مخلوق کو پیدا کی ہے یہ کیوں پیدا کی ہے۔ نفع پہنچانا مقصود ہے یا نقصان پہنچانا مقصود ہے یا نہ نفع پہنچانا اور نہ نقصان پہنچانا مقصود ہے۔ اگر نفع نہ پہنچانا مقصود ہوتا یا نقصان نہ پہنچانا مقصود ہوتا تو یہ تو پیدا نہ کرتا تو حاصل ہو جاتی کیونکہ اگر پیدا نہ ہوتی مخلوق، تو نہ اس کو فائدہ پہنچتا اور نہ نقصان پہنچتا تو پیدا کرنا عبث ہوگیا۔ اور خدا عبث فعل کرنے سے پاک ہے لہٰذا یا فائدہ یا نقصان پہنچانا مقصود ہے۔ اگر یہ کہو کہ مقصد نقصان پہنچانا ہے تو یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ خدا رحیم بھی ہے کریم بھی ہے وہ نقصان پہنچانے کے لئے پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر فائدہ پہنچانے کے لئے پیدا کیا ہے تو عذاب سراسر نقصان ہے اس لئے عذاب نہیں ہوگا۔ یہ دلیل بھی غلط ہے جواب وہی ہے کہ اگر رحم و کرم نفع کا متقاضی ہوگا تو نقصان کا وجود عالم سے مٹ جائے گا مگر یہاں نفع اور نقصان رنج و راحت دکھ اور سکھ دونوں

موجود ہیں اور دونوں کا خالق ایک ہے۔ اس وقت سے بچنے کے لئے مشرک لوگ جو ہیں وہ دو خداؤں کے قائل ہوگئے۔ ایک نیکی راحت اور سکھ پیدا کرتا ہے اور دوسرا بدی رنج الم اور دکھ پیدا کرتا ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ وہ جو نیکی پیدا کرنے والا خدا ہے وہ بدی پیدا کرنے والے خدا کو بدی پیدا کرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں روک سکتا۔ اگر کہو کہ نہیں روک سکتا تو وہ مجبور ہوگیا۔ خدا بننے کے قابل نہیں رہا۔ اگر وہ روک سکتا ہے اور نہیں روکتا تو معلوم ہوا کہ سب اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے تو پھر ایک ہی خالق رہا دو خداؤں کی تقدیر پر بھی ایک ہی رہا۔ تو خالق خیر و شر ایک ہی ہے اور ان دونوں کی موجودگی یہ پتہ دے رہی ہے کہ مصلحت ایجاد دونوں ہیں۔ خیر بھی اور شر بھی۔ جس طرح یہاں دکھ اور سکھ پیدا کرنا اس کے رحم و کرم کے منافی نہیں ہے اسی طرح وہاں سکھ اور دکھ پیدا کرنا اس کے رحم و کرم کے منافی نہیں ہے۔

انھوں نے کئی دلیلیں بیان کی ہیں جو یاد آتی جائیں گی میں بتاتا جاؤں گا سب غلط ہیں یہ ساری خرابیاں اصل میں صحیح غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ اگر غور بہ قاعدہ میں کیا جاتا تو اتنی پریشانیاں اور تکلیفیں نہ ہوتیں۔

بعض باتیں شروع سے دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔ ہندو کہتے ہیں ناکہ خدا بڑا دیالو ہے۔ یا لو کہتے ہیں رحیم و کریم کو اب جو اس کے خلاف دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ اس کا فعل ہی نہیں ہے۔ اسی سے مذاہب باطلہ پیدا ہوتے ہیں اور کفر اور برائیاں شروع ہوتی ہیں۔

اب وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے کہ یہ کفر کرے گا اور گناہ کرے گا اب جو اس کو ایمان لانے کی تکلیف دی تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے گا۔

نافرمانی کرے گا اور نافرمانی کی سزا دائمی عذاب ہے تو عذاب جہنم کی اصل علت اور وجہ تکلیف اور امر و نہی ہوئی۔ یہ جو حکم دیا کہ تو ایمان لا یہ علت ہے۔ اصل میں جہنم میں جانے کی۔ اس کو معلوم ہے کہ یہ حکم کی نافرمانی کرے گا اور اس پر میں اس کو عذاب جہنم دوں گا تو یہ حکم دینا جو ہے یہ علت ہو گیا دائمی عذاب کا اور حکم دینے ہی کو تکلیف کہتے ہیں ایک تکلیف تو وہ ہے جس کے معنی دکھ کے ہیں اور ایک شرعی تکلیف ہے۔ اس کے معنی امر و نہی کے ہوتے ہیں۔ تو خدا نے جو حکم دیا کہ ایمان لا اور پھر وہ ایمان نہیں لایا اور ایمان نہ لانے کی سزا میں اس کو ابدی جہنم ملا۔ تو جہنم میں داخلے کی اصل علت خدا کا حکم ہوا جب اس کو معلوم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائے گا۔ اس کے باوجود اس کو حکم دیا تو یہ حکم غیر معقول اور عقل کے خلاف ہے۔ لہٰذا یا تو اس نے حکم ہی نہیں دیا یا اگر حکم دیا تو عذاب نہیں دے گا۔ تو جو جماعت ایمان نہیں لائی وہ تو کہتی ہے کہ تکلیف ہی نہیں دی اور جو ایمان والوں کی جماعت ہے وہ کہتی ہے کہ امر و نہی تو کیا مگر عذاب نہیں دے گا۔ تو اس کا جواب وہی ہوگا کہ یہاں وہ پیدا کر رہا ہے بیماریاں اور دکھ دے رہا ہے پھر موت دے رہا ہے تو موت اور دکھ کی علت خود اس کی ذات ہو گئی۔ مگر یہاں جس طرح موت اور دکھ دینا اور غیر معقول نہیں ہے بلکہ اس میں اس کی مصلحت ہے تو اسی طرح اس جہاں میں بھی عذاب میں اس کی مصلحت ہے جس طرح یہاں دکھ دینے کے باوجود وہ رحیم و کریم ہے اسی طرح وہاں بھی وہ عذاب دینے کے باوجود رحیم و کریم ہے۔

اب وہ یہ کہتے ہیں کہ اس زندگی میں ۱۰، ۲۰، ۵۰ یا سو برس اس نے گناہ کیا اور پھر اس کو دائمی جہنم دیا یہ بالکل عقل کے خلاف ہے۔ اس کی عنایت اور

رحم وکرم کے خلاف ہے۔ اگر ۱۰ برس کفر کیا ہے تو ۱۰ برس دکھ دیتا۔ یہ دلیل بھی نامعقول ہے غلط ہے۔ صحیح غور نہیں کیا۔ یہاں بھی تو عمر قید ہوتی ہے۔ اب اگر وہ ۱۰ برس زندہ رہا تو ۱۰ برس میں سزا ختم ہو گئی۔ ۱۰۰ برس زندہ رہا تو ۱۰۰ سال قائم رہے گی یعنی جتنے دن جئے گا سزا میں رہے گا اور یہ سب کے نزدیک معقول ہے تو اسی طرح وہاں بھی جب تک جئے گا سزا پاتا رہے گا۔ جس طرح یہاں یہ بات معقول ہے اسی طرح وہاں بھی معقول ہے۔ سزا حیات کے تابع ہے۔ حیات دائم ہوئی تو سزا بھی دائم ہو گئی۔ اس میں جھگڑا کیا ہے۔ پھر انھوں نے یہ کہا کہ ان احسنتم احسنتم لانفسکم جو نیکی تم کروگے وہ تمہارے لئے ہے اللہ پاک کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ اللہ پاک کا اعلان ہے اب جو اللہ پاک نے حکم دیا کہ ایمان لا اور نیکی کر اور اس نے نیکی نہیں کی ایمان نہیں لایا کفر کیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے اپنے لئے بھلائی اور نیکی نہیں کی۔ اب اس پر عذاب دینا غیر معقول ہے۔ جیسے یہاں کوئی کہے کہ تو یہ کام کر اور اپنے لئے روپیہ کما اور فائدہ اٹھا ورنہ تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اب اس نے وہ کام نہیں کیا اور اپنے لئے روپیہ نہیں کمایا اور فائدہ نہیں اٹھایا تو اس پر اس کو سزا دینا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا غیر معقول ہے۔ تو فائدہ اٹھانے پر ثواب اور جنت دینا اور فائدہ نہ اٹھانے پر ابدی جہنم دینا غیر معقول ہے۔ ثواب دینے سے یہ بہتر تھا کہ عذاب نہ دیتا۔ تو اس سے پتہ چل گیا کہ وہ عذاب نہیں دے گا۔ یہ بھی غلط ہے۔ یہاں اصولی غلطی ہے یہاں اس بات پر عذاب نہیں ہے کہ تو نے اپنے لئے بھلائی پیدا نہیں کی۔ غور کریں اگر یہ امر نہ ہوتا کہ تو ایمان لا اور پھر وہ ایمان نہ لاتا تو کوئی عذاب نہ ہوتا۔ عذاب اس وقت غیر معقول ہوتا جب وہ حکم نہ دیتا۔ جب اس نے حکم دے دیا اور اس نے اطاعت نہیں کی تو یہ سزا

جواس کی دی جارہی ہے وہ اطاعت نہ کرنے کی ہے۔ اس کی نہیں ہے۔ کہ اس نے اپنے لئے نیکی حاصل نہیں کی بلکہ امر کی مخالفت کی۔ یہ صحیح عقلی جواب ہوگیا۔ اہل سنت اور دوسرے علماء نے عقلی جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہہ دیا کہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کفر کرنے پر عذاب ہوگا ہم ایمان لے آئے اور ہم نے اس کو تسلیم کرلیا۔ اب رہا مسئلہ جھوٹ اور کذب کا۔ اس میں بڑی لغزش ہوئی ہے۔ اس میں ایک بڑی باریک بات ہے۔ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ وعدہ جو کیا ہے نیکی کا اس میں اگر وہ خلاف کرے تو البتہ وہ بُرا ہے۔ خلف فی الوعید۔ وعید میں اگر خلاف کرے کہ میں عذاب دوں گا اور پھر نہ دے۔ تو یہ جو ہے اچھی بات ہے۔ خوشی کی بات ہے۔ سزا کا ارادہ کرے پھر سزا نہ دے۔ تو یہ بڑے لوگوں سے چلی آرہی ہے۔ اس ٹکڑے میں چھوٹی سی جماعت بڑے لوگوں کی بھی شامل ہے۔ میں نے راز کی بات پائی ہے۔ بات پھر سمجھ لیں جھوٹ بولنا اس معاملہ میں اچھا ہے کہ سزا کا اعلان کرے پھر سزا نہ دے۔ تو یہ جھوٹ تو ہوا لیکن یہ اچھا ہے۔ اور انعام کا وعدہ کرکے اگر انعام نہ دے تو بُرا ہے اس پر ملامت ہوگی۔ اس اصول کے تحت وہ اس چیز کے قائل ہوگئے۔ اس میں بہت چھوٹی جماعت مسلمانوں کی شامل ہے۔ بڑی جماعت اسی کی قائل ہے کہ جو کچھ رسول اللہ نے فرمایا ہے ٹھیک ہے۔ عذاب ہوگا۔ اس میں راز کیا ہے غور کریں۔ اگر خدا جھوٹ بولتا ہے تو خدا کا نقصان واقع ہوتا ہے۔ اگر سچ بولتا ہے تو دُنیا کی بہت بڑی اکثریت تباہ ہوتی ہے اور جہنم میں جاتی ہے۔ وَلَقَدْ ذرأسنا لجہنم کثیر من الجن والانس اکثر جنوں کو اور آدمیوں کو ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر یہ بات سچی ہے تو اکثریت تباہ ہوگئی۔ اور اگر یہ بات جھوٹی ہو تو اللہ پاک کی طرف عیب منسوب ہو۔ تو خدا کا ذرا سا بھی داغدار ہو جانا

بہت زیادہ قبیح ہے اس سے کہ ساری دنیا تباہ ہوجائے۔ اس کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہیں۔ سارا عالم تباہ ہوجائے پرواہ نہیں۔ پہلے نہیں تھا تو کیا ہوا کچھ بھی نہیں۔ کیا بگڑ گیا۔ اگر اب بنا کر بگاڑ دے تو کیا ہوگا۔ کچھ نہیں۔ لیکن اگر اس کی ذات میں کچھ کمی آجائے تو سارا نظام الوہیت تباہ ہوجائے گا۔ تو نظام الوہیت کا داغدار ہوجانا زیادہ بُرا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہ سارا عالم تباہ ہوجائے۔ اس لئے اس کا وعدہ سچا ہے وعدہ اور وعید دونوں سچے ہیں۔ اگر اس میں احتمال پیدا ہوگا تو وثوق جاتا رہے گا۔ ڈر جاتا رہے گا۔ خوف جاتا رہے گا۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اور غلط عقیدہ ہے اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ ان اللہ لا یخلف المیعاد اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

اب انہوں نے یہ کہا کہ یہ کہاں کا رحم و کرم ہے کہ ایک قلیل جماعت کو تو عقل، ہدایت، ایمان، اور شعور دے دیا۔ کہ اس کو رشد و ہدایت مل گئی۔ اس کو ہادی مل گئے اس کو عقل مل گئی۔ اور ایک بہت بڑی جماعت کو رشد و ہدایت نہیں ملی۔ صحبت فاسقوں فاجروں میں رہی۔ اس کو صحبت عالموں زاہدوں میں رہی۔ اس کو ذرائع اچھے مل گئے۔ اس کو ذرائع خراب ملے۔ یہ بالکل عدل اور انصاف کے خلاف ہے ان کے لئے تو ذرائع رشد و ہدایت کے پیدا کر دئے۔ اتنی بڑی اکثریت کو ذرائع ضلالت اور گمراہی کے پیدا کر دئے۔ اور وہ عادل ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے عذاب نہیں ہوگا۔ یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ آپ پوری کائنات کو دیکھیں۔ مفرد تھوڑے سوں کو بنایا اکثریت مرکبات کی بنائی۔ عناصر اربعہ کو ترکیب سے محروم کر دیا۔ مفردات سے جمادات بنائے ان کی بہت قلیل تعداد ہے۔ پھر

جمادات سے نباتات بنائے یہ نباتات بمقابلہ جمادات کے بہت کم ہیں۔ نباتات سے
حیوانات بنائے۔ حیوانات بنباتات سے بہت کم ہیں۔ پھر حیوانات سے
انسان بنائے۔ انسان حیوانات کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ تمام عناصر کو محروم کر دیا
جماد سے۔ تمام جمادات کو نمو سے محروم کر دیا۔ تمام نباتات کو حیات و حرکت سے محروم
کر دیا۔ تمام حیوانات کو انسانیت سے محروم کر دیا۔ تھوڑوں کو انسانیت دی۔
برابر اکثریت کو محروم کرتا چلا آرہا ہے۔ مگر یہ خلاف عقل نہیں ہے مصلحت اور
دانائی ہے۔ تو وہاں بھی تھوڑوں کو راحت اور جنت دیدی۔ اکثریت کو محروم کر
دیا تو کیا ہرج ہے۔ جس طرح یہاں یہ خلاف عقل اور خلاف انصاف نہیں ہے۔ اسی
طرح وہاں خلاف عقل و انصاف نہیں ہے۔ جس طرح یہاں حکمت رحمت اور مصلحت
ہے اس طرح وہاں مصلحت حکمت رحمت اور دانائی ہے۔ شروع سے اس کے
اسباب دیکھیں نظام کائنات یہی ہے کہ برابر اکثریت کو محروم کرتا چلا آرہا ہے
جس طرح یہ شروع کے اس کے فعل رحمت کے منافی نہیں ہیں اسی طرح یہ آخر کا
فعل رحمت کے منافی نہیں ہے۔ تھوڑوں کو جنت میں بھیجے گا۔ زیادہ کو دوزخ
میں۔ اگر تم یہ پوچھتے ہو کہ کافروں نے کیا کیا جو ان کو جنت سے محروم کر دیا۔ ہم
پوچھتے ہیں کہ جانوروں نے کیا قصور کیا کہ ان کو انسانیت سے محروم کر دیا۔ نباتات
نے کیا قصور کیا کہ ان کو حیات حرکت سے محروم کر دیا۔ جمادات نے کیا قصور کیا کہ ان کو
نمو سے محروم کر دیا۔ مفردات نے کیا قصور کیا کہ ان کو جمود اور ترکیب سے محروم کر
دیا۔ اگر یہ سب محرومی عقل کے مطابق ہے تو ایک وہ محرومی بھی عقل کے مطابق ہے
اس میں کیا دقت ہے۔ اگر یہ سب عقل کے خلاف ہے تو جہاں پوری کائنات خلاف

عقل ہے تو ایک یہ بھی خلاف عقل ہوگیا۔ اس میں شبہ کی کیا بات ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور عجیب بات ہے جو میں نے بیان کی ہے اور صحیح غور کا نتیجہ ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے ؛

بندہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے

بڑے بڑے لوگ اور علماء سے جو غلطیاں ہوئیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تاعدہ سے صحیح غور نہیں ہوا۔ ہندوستان میں ایک فرقہ ہے برہمہ کا۔ یہ فلاطوس کا شاگرد ہے۔ فلاطوس سقراط کے ساتھ کا عالم ہے۔ یہ ہندوستان چلا آیا تھا۔ یہ سب اس کے شاگرد ہیں۔ وہ اسی طرح موحد ہیں۔ جس طرح آسمانی مذاہب کے لوگ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یہ نبوت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک کو علم ہے کہ بندہ ایمان نہیں لائے گا۔ اور انکار کرے گا پھر نبی کو بھیجنا فعل عبث ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کوئی لغو اور عبث فعل کرے۔ وہ حکیم ہے اس لئے وہ نبی کو نہیں بھیجے گا۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نجات کے لئے توحید کافی ہے نبوۃ کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ تم کہتے ہو کہ اللہ پاک نے فرمایا وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولاً۔ جب تک اللہ پاک کسی قوم کی طرف رسول نہیں بھیجتا۔ اس کو عذاب نہیں دیتا۔ تو اگر نبی نہ آتا تو عذاب نہ ہوتا۔ تو نبی کا آنا موجب عذاب ہوا۔ تو یہ رحمت نہ ہوئی۔ بلکہ زحمت ہوئی۔ اللہ پاک رحیم ہے یہ اس کی رحمت اور رحمانیت سے بعید ہے کہ بندوں کے لئے زحمت کا باعث پیدا

کرے ۔ اس لئے نبی کو خدا نہیں بھیجتا ۔ دور خلافت عباسی میں ان سے ابن خرم
کا مقابلہ ہوا ۔ تو امام ابن حزم نے کہا کہ جس طرح تم نبوۃ کو عبث کہتے ہو اسی طرح توحید
بھی عبث ہے ۔ کیونکہ اکثر لوگ توحید کے بھی منکر ہیں ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بہت سے
لوگ توحید کو مانتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس طرح بہت سے لوگ نبوت کو مانتے
ہیں ۔ میں نے جب یہ بحث کتابوں میں دیکھی تو میں نے کہا کہ یہ بحث اصول کے مطابق
نہیں ہوئی ۔ بات ضابطہ میں ہونی چاہیئے ۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ
اللہ تبارک تعالےٰ حکیم ہے اور حکیم کا فعل عبث اور لغو نہیں ہوتا اور یہ جانتے
ہوئے کہ ایک شخص ایمان نہیں لائے گا ۔ پھر اس سے یہ کہنا کہ تو ایمان لا ۔ یہ کہنا
عبث اور بے سود ہے تو یہ خدا کا فعل نہیں ہو سکتا ۔ تو ہم یہ دیکھیں کہ
اس کائنات میں کیا ہو رہا ہے ۔ یہاں مرکبات پائے جاتے ہیں ۔ یہ دلیل ہے اس
بات کی کہ اجزاء موجود ہیں ۔ اللہ پاک نے اجزاء کو پیدا کیا ۔ پھر اس نے مرکبات بنائے
وہ اس پر بھی قادر تھا کہ بغیر اجزاء کے براہ راست مرکبات کو پیدا کر دیتا ۔ تو اجزاء
کو پیدا کرنا فعل عبث ہے ۔ کیونکہ مقصود اجزاء نہیں مرکبات ہیں ۔ اب بتاؤ
اجزاء کی تخلیق عبث کے بعد اس کو حکیم مانتے ہو یا نہیں ؟ تو اگر کروڑوں اجزا
عبث پیدا کر کے بھی وہ حکیم ہے تو ایک فعل نبی کو بھیجنا اگر اس کو عبث تسلیم بھی کر لیا
جائے تو بھی یہ اس کی حکیمی کے منافی نہیں ہے ۔ اجزاء ذریعہ ہیں محض اور مرکبات
کے مقابلہ میں غیر مقصود ہیں ۔ تو یہ پوری کائنات کا نظم ذرائع پر ہے ۔ جبکہ وہ اس
پر قادر ہے کہ ہر شئے کو بلا ذریعہ وجود بخش سکتا ہے تو یہ پورا کا پورا نظام کائنات
ہی عبث ہوا ۔ اس کے باوجود وہ حکیم ہے ۔ تو معلوم ہوا کہ حکیم وہ ہے ۔

وہ حکیم کہے نہ کہ وہ جو ہمارے خیال میں ہے۔ اس نے اپنا نام حکیم رکھا ہے۔ اس بنیاد پر وہ حکیم ہے اور ہم کو، یہ حکم کیا ہے کہ تم ذرائع سے کام لو تو تمہارا نام بھی میں نے حکیم رکھا۔ اسی طرح پیدا ہو کر مرنے میں تکلیف ہے پیدا ہونا پھر زندگی میں دکھ بیماری۔ مفلسی۔ غمی۔ ساری تکلیفیں آخر موت نزع کی تکلیف اور پیدا نہ ہونے میں کوئی تکلیف نہیں۔ تو رحمت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ مگر پیدا کر کے دکھ بیماری اور آخر موت دے کر بھی وہ رحیم و کریم ہے یا نہیں؟ تو ایک نبی کو بھیجنا اس کی رحمت و کرم کے منافی کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی کا بھیجنا زحمت ہے۔ تب بھی یہ اس کی رحمت کے منافی نہیں ہے۔

اب انہوں نے ایک سوال یہ کیا کہ اللہ پاک نے عقل کو مجبور کیوں نہیں کر دیا کہ وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتی؟ اس کا جواب کسی نے کچھ نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک انگلی ایک ہے۔ سب اس پر مجبور ہیں۔ ایک انگلی کو کوئی کم عقل والا بھی دو نہیں کہے گا۔ اور یہ ایک کا علم کیسے ہوا۔ دیکھ کر۔ یہ علم حسی ہے۔ اس میں عقل کی ضرورت نہیں۔ تو حس علم پر مجبور ہے۔ اس میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ تو اگر اللہ کو ایک ماننے پر مجبور کر دیا جاتا جس طرح انگلی کو ایک ماننے پر مجبور کر دیا تو عقل بیکار ہو جاتی اور انسان مرتبۂ انسانیت سے گر کر حیوانات نباتات اور جمادات میں شامل ہو جاتا۔ انسانیت سے خارج ہو جاتا۔

اگر اللہ تعالیٰ بندوں کو یہ بتا دیتا کہ وہ ایک ہے تو انکار کی گنجائش نہ رہتی۔ انگلی کو ایک خدا نے بتایا۔ اس کو ایک ماننے پر مجبور ہے۔ خدا کو ایک نبی

نے بتایا اس لئے اس کا انکار ہوسکتا ہے اس کو اختیار ہے۔ ماننے یا نہ ماننے۔ یہ اختیار ہی تو انسانیت ہے۔ اختیار گیا اور انسانیت سے خارج ہوگیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا انسان کو جیسی قدر کرنا چاہئے تھی اس نے اللہ کی ویسی قدر نہیں کی۔ اس نے تو بنایا تھا انسان۔ یہ کہتا ہے کہ جانور اور نباتات کیوں نہ بنایا۔ انسانیت تو یہی ہے کہ چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ جبریہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندہ کے فعل کو خدا پیدا کرتا ہے اور بندہ مجبور ہے اور قدریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے بندے کو عقل دی۔ دانش دی اور پوری قدرت دی۔ تو اب وہ سوچ سمجھ کر خود کرتا ہے اور اپنے فعل کو خود پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس سے اس کے فعل کا سوال ہوگا کہ یہ کیوں لیا۔ ؟ جبریہ نے یہ جواب دیا کہ خدا کو علم ہے کہ بندہ قدرت کو برے فعل میں خرچ کریگا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی اس نے اس کو قدرت دی۔ تو فعل کو خود پیدا کرنا یا اس فعل کو پیدا کرنے کی قدرت دینا یہ جانتے ہوئے کہ اس کا استعمال گناہ میں ہوگا۔ دونوں برابر ہیں پھر بھی سزا و جزا جائز نہیں ہے۔ یہ انتہائی غلطی کی۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھے کہ جو قدرت برا فعل کرنے کی ہے بعینہٖ وہی قدرت اچھا فعل کرنے کی ہے۔ اگر وہ قدرت یکطرفہ ہوتی تو بیشک تمہاری بات صحیح ہوتی۔ چونکہ قدرت دو طرفہ ہے۔ چاہے اس سے اچھا فعل کرے چاہے برا فعل کرے اب جو اس کو وہ خرچ کرتا ہے۔ اچھے یا برے فعل میں تو وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے اور اپنی مرضی اور اپنے ارادہ سے کرتا ہے اس لئے سزا و جزا حق ہے۔ ایک ہی قدرت ہے۔ جو اچھے اور برے فعل میں استعمال ہوسکتی ہے۔ چاہے وہ اس میں استعمال کرے چاہے۔ اس میں یہی معنی قادر ہونے کے ہیں۔ جب قادر ہوگیا تو وہ اپنے ہر فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہے۔

جماعت مشبہہ

مسلمانوں کی جماعت میں سے ایک جماعت مشبہہ کی ہے۔ وہ اللہ کو جسم مانتے ہیں۔ جو دلائل عقلی انہوں نے دیئے تھے ان کا رد بیان کرچکا ہوں۔ آج ان کے شرعی دلائل پر بحث ہوگی۔ ۱۲۰۰ برس میں مسلمانوں نے بہت سی بدعتیں ایجاد کی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ آئیں گی۔ مشبہہ نے جو شرعی دلائل بیان کئے ہیں۔ اس میں وہ قرآن کی آیات پیش کرتے ہیں۔ مایکون من نجوىٰ ثلاثة الا ھو رابعھم تم تین آپس میں چپکے چپکے مشورہ کرتے ہو تو چوتھا میں ہوتا ہوں۔ ھومعکم وہ تمھارے ساتھ ہے۔ جہاں بھی تم ہو۔ نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون۔ ہم مُردوں کے تم سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ مگر تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ میت کے واسطے ہے جب وہ مرجاتا ہے اس وقت ہم تمھارے مقابلے میں تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔ فلولا اذا بلغت الحلقوم۔ جس وقت جان حلقوم میں آجاتی ہے۔ وانتم حینئذٍ تنظرون۔ تم اس وقت تکتے کے تکتے رہ جاتے ہو۔ نحن اَقْرَبُ الیہ منکم ولکن لا تبصرون اور تمھارے مقابلے میں ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ مگر تم دیکھ نہیں سکتے فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونھا۔ اگر تم مختار اور آزاد ہو تو یہ روح جو حلقوم میں آگئی اسے لوٹا کیوں نہیں لیتے۔ اگر تم نہیں لوٹا سکتے تو تم بے قابو ہو بے بس ہو۔ کسی اور کے بس میں ہو۔ حسی شہادت یہ ہے کہ مرتے وقت۔ حکیم ڈاکٹر دوا بیّن پلنگ.

بستر۔ ماں باپ، بہن بھائی، اولاد، سورج، چاند، ہوا ہر شے موجود ہوتی ہے۔ آسمان زمین تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ پھر مرجاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کو حیات میں دخل نہیں ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو دخل ہوتا تو آس کی موجودگی میں یہ نہ مرتا۔ ان آیات سے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ خدا جسم ہے۔ الرحمٰن علی العرش استویٰ رحمان عرش پر بیٹھ گیا۔ استویٰ کے معنیٰ جگہ پکڑنا۔ بیٹھنا۔ عرش کے معنی تخت یا پھیلا ہوا۔ کسی قسم کا ہو۔ وہ کوئی موہوم چیز نہیں یحمل عرش ربک فوقھم یومئذٍ ثمانیہ اس روز عرش کو آٹھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ آٹھ کیا ہیں۔ اس کی تشریح نہیں ہے۔ وہ ملائکہ ہو سکتے ہیں بکرے گائے، اونٹ بھی ہو سکتے ہیں۔ یا سات آسمان ایک کرسی ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ عرش پر جالس ہے یہ مشبہہ کا عقیدہ ہے کیونکہ بیٹھنا۔ اٹھنا۔ لیٹنا۔ یہ جسم کی صفتیں ہیں مگر یہ عقیدہ غلط ہے یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ اور نقل کے بھی خلاف ہے عقل کے تو یوں خلاف ہے کہ عرش نہیں تھا اور اللہ تھا۔ یہ بحث مسلمانوں کے لئے ہے۔ غیر مسلم ہوگا تو اس سے بحث دوسری ہوگی۔ اس سے یہ بات نہیں کہی جائے گی۔ اس سے پہلے نبوت پر بات ہوگی۔ جب نبوت کو تسلیم کرے گا تب اس مسئلہ پر بات ہوگی۔ مثلاً ایک آدمی سیڑھی کے اوپر کے حصّے پر کھڑا ہے اب وہ داخل ہونا چاہتا ہے تو اُسے جو بات بتائی جائے گی۔ وہ اس شخص کو نہیں بتائی جائے گی جو بالکل سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہے اس سے یہی کہا جائے گا کہ پہلے سیڑھی چڑھ جب وہ چڑھ جائے گا تب اس کو کمرے میں داخل ہونے کی تدبیر بتائی جائے گی۔ تو جو لوگ غیر مسلموں سے ان چیزوں پر بحث کرتے ہیں وہ ناجائز ہے۔ ان سے پہلے نبوت پر بحث کرنی چاہئے۔

یہ سمعیات ہیں پہلے عقلیات اور مبادیات پر ان سے بات کرنی چاہئے۔ پہلے اللہ کی ذات، وصفات پھر رسولؐ کی رسالت۔ جب رسالت کی تصدیق ہو جائے گی تو خود بخود بات سمجھ میں آجائے گی۔ کہ نبی نے کہہ دیا بس حق ہے۔ بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ تو اگر خدا کا بیٹھنا ثابت ہو تو خدا تو ازلی ہے عرش حادث ہے اس کی صفت ازلی نہ بیٹھنا ہے۔ بیٹھنا صفت حادث ہے۔ لہٰذا وہ نہیں بیٹھا۔ دوسری دلیل اگر وہ عرش پر بیٹھ جائے گا تو اس کے داہنی جانب کے اجزا بائیں جانب کے اجزا کے غیر ہوں گے۔ یعنی وہ مرکب ہو گیا۔ دو مختلف اجزا سے بنا اور مرکب ہمیشہ اپنے اجزاء کے بعد ہو گا۔ بعد کو ہونے والا خدا بننے کے قابل نہیں ہے۔ حادث ہو گیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر مکان میں ہے تو ہر مکان میں ہو یا بعض مکان میں ہو۔ اگر ہر مکان میں ہو تو گندگیاں نجاستیں اور قاذورات یہ سب کچھ ہیں خدا ان میں بھی ہے۔ یہ نہ عقل میں آتا ہے نہ شرع میں آتا ہے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ بعض میں ہے بعض میں نہیں ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے بعض میں کیوں ہے۔ اور دیگر بعض میں کیوں نہیں ہے۔ بعض مکان میں ہونے کے لئے کوئی مخصص ہونا چاہئے جو بعض مکان میں ہونے کی تخصیص کرے۔ تخصیص ہوتے ہی وہ تخصیص کا محتاج ہو گیا۔ اور محتاج خدا بننے کے لائق نہیں رہا۔ لیس کمثلہ شئے اس کی جیسی کوئی شئے نہیں۔ یہ عدم مماثلت تمام چیزوں میں ہے۔ کسی چیز میں اس کی مثل نہیں ہے۔ اگر وہ بیٹھنے والا ہو گا تو بیٹھنے میں اور لوگ اس کی مثل ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ گیا تو وہ مکین ہو گیا اور جہاں بیٹھا وہ مکان ہو گیا۔ تو مکین اور بھی ہیں ان کی الوہیت کی نفی کس طرح کی جائے گی۔ وہ طریقہ یہی ہے کہ جسم مکان کے اندر ہے

اور مکان اس کو کہتے ہیں جہاں حرکت ہو۔ حرکت یہ ہے کہ ایک شے ایک مکان
کو چھوڑے اور دوسرے مکان میں چلے اور سکون اس کو کہتے ہیں جو ایک ہی مکان
میں رہے تو حرکت ہی سے ان کی نفی الوہیت ثابت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مکان
میں ہوگا تو وہ حادث ہو جائے گا پھر وہ اللہ بننے کے قابل نہیں رہے گا۔ پھر اگر
بیٹھا تو پورا پورا بیٹھا یا کم و بیش بیٹھا۔ اگر پورا بیٹھا تو عرش کے برابر ہوگیا۔ اگر
تھوڑی جگہ بیٹھا ادھر ادھر عرش کا حصہ بچا رہا تو عرش سے چھوٹا ہوگیا۔ اور اگر ادھر
اُدھر نکلا رہا تو عرش پر آنے کا نہیں اور جو حصہ عرش سے باہر ہوگا وہ اس حصے کا غیر
ہوگا جو عرش پر ہے۔ تو مرکب ہو کر حادث ہوگیا بہر صورت میں حادث ہوگیا۔ اگر وہ
جسم ہے تو جسم غائب ہو جاتا ہے۔ اگر جسم سے فاصلے پر جائیں تو نظر نہیں آئے گا۔
اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ لا احب الافلین۔ لا احب الغائبین
جسم میں غائب ہونے کی خصلت موجود ہے۔ لہٰذا وہ خدا بننے کے قابل نہیں ہے
انھوں نے صحیح استدلال کیا حق کیا یہ اتنی دلیلیں میں نے بیان کر دیں کہ اللہ جسم
نہیں ہو سکتا وہ جسمیت سے پاک ہے۔ اب یہاں ذرا سا غور کرنے کی بات ہے کہ
یہ جسم اور جسم جیسا نہیں ہے جسم لاکالاجسام وہ ایسا جسم ہے جو دیگر اجسام کی مثل
نہیں ہے۔ تم جو خصوصیات بتا رہے ہو کہ وہ جسم نہیں ہو سکتا تو وہ ایسا جسم نہیں ہے
جیسے یہ شمس و قمر۔ جانور۔ پہاڑ۔ دریا وہ جسم تو ہے مگر ایسا جسم نہیں ہے۔ اس کی مثال
وہ یہ دیتے ہیں شئی لا کالاشیاء ایسی شے ہے جیسے اور شے نہیں ہے۔ اور
حکیم ارسطو نے یہ کہا ہے لایعرفوا الا بالسلب وہ سلب سے پہچانا جاتا
ہے۔ نفی سے پہچانا جاتا ہے۔ ثبوت سے نہیں پہچانا جاتا۔ نفی سے پہچانے جانے کے

معنی یہ ہیں کہ جب پوچھا جائے گا کہ خدا کے معنی کیا ہیں تو ہر شے کی طرف اشارہ کرکے کہا جائے گا خدا یہ نہیں ہے۔ خدا سورج نہیں ہے۔ چاند نہیں ہے۔ زمین نہیں ہے۔ آسمان نہیں ہے وغیرہ وغیرہ ہر شے کی نفی۔ یہ مشہور ہے کہ اس کا قول ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ بہر حال یہ اس کا قول ہے۔ مجھے اس پر اعتراض یہ ہے کہ تم نے جو نام رکھا ہے یہ اپنی عقل سے رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نام عقل سے نہیں رکھا جاتا۔ جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ اس کا نام رکھتے ہیں۔ باہر کے آدمی اس کا نام نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے ہیں تو صرف ان کی اجازت سے، وہ اپنا نام بھی خود رکھے گا اور تمھارا نام بھی خود وہی رکھے گا۔ ایسا جسم جو لا کالاجسام ہے۔ وہ مشکل نہیں ہے۔ متوہم نہیں ہے متصور نہیں ہے۔ ایسا جسم جو جس کا نہ طول ہو نہ عرض ہو نہ عمق ہو ایسا جسم آپ نہیں سوچ سکتے۔ جیسے لا اول کسی شے کا اول نہ ہو یہ خیال میں نہیں آتا۔ یا حرکت و سکون کا اجتماع کوئی ایسی شے جو متحرک بھی ہو اور ساکن بھی ہو۔ یہ بات خیال میں نہیں آتی۔ جو شے خیال میں نہیں آتی اس کو محال کہتے ہیں۔ جو جسم متصور نہیں ہے۔ اس کو دلیل سے ثابت کرنا چاہیے یعنی ایسا جسم ہو جو طویل، عریض، عمیق نہ ہوتے ہوئے طویل عریض اور عمیق ہو۔ یہ مہمل اور بے معنی بات ہے۔ یہ عقل سے ثابت ہو نہیں سکتا۔ سمع اسبارہ میں ساکت ہے تمھیں کیسے معلوم کہ اللہ نے اپنا نام جسم رکھا تھا کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے اپنے نام گنوائے تھے۔ یا کسی اپنے آدمی سے کہلوایا۔ وہ آدمی نبی ہے۔ نبی نے یہ نام نہیں بتایا۔ ایسا جسم جو طویل اور عمیق اور عریض ہو یہی جسم کی تعریف ہے۔ کہ شش جہات سے گھرا ہوا ہو۔ یہ مخلوق کی صفت ہے اور مخلوق

کی قسم ہے ۔ لہٰذا خالق جسم نہیں ہوگا۔ تو یہ غلط ہے بالکل ۔ وہ جسم ہوتا تو عرش پر بیٹھ جاتا ۔ تو پھر آیت کے کیا معنی ہیں ۔ آیت ہے ھومعکم وہ تمھارے ساتھ ہے ما یکون من نجوی ثلثۃ الا ھورا بعھم جب تم تین مشورہ کرتے ہو تو چوتھا خدا ہوتا ہے ۔ ولاخمسۃ الاھوسادسھم ہ کی اگر مجلس ہو تو چھٹا وہ ہوتا ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجلس میں موجود ہے تو آیت کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے ۔ ان اللہ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے اسی طرح اور بہت سی جگہ ہے تو یہ ھومعکم اینما کنتم ۔ وہ مکان میں ہے ۔ یہ بات نہیں ہے ۔ بلکہ کم اور نا کی جو ضمیر ہے معکم اور معنا میں اس ضمیر کے متعلق ہے مکان یعنی ہم جس مکان میں ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے ۔ یعنی مکان اور مکین دونوں کے مجموعے کے ساتھ ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ ہم ایک مکان میں اور وہ بھی اسی مکان میں ہے ۔ جیسے ہم آپ دونوں اس مکان میں ہیں ۔ نہیں بلکہ وہ ہم اور مکان کے مل کر اس کے وہ ساتھ ہے "ہم مع زمان" کے ساتھ ہے ۔ "ہم مع مکان" کے ایک شے ہوئی اللہ اس شے کے ساتھ ہے ۔ تو اللہ زمان و مکان سے آزاد ہو گیا ۔ اور اس کی معیت علم و قدرت کی ہوئی ظرفیت کی نہیں ہوئی ۔ جیسے پیالہ میں پانی لیں ۔ تو آپ اس پانی کے ساتھ ہیں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بھی پیالے میں ہیں بلکہ پانی اور پیالے کا جو مجموعہ ہے آپ اس کے ساتھ ہیں ۔ ان سب آیتوں کا یہ ایک جواب ہے ۔ اب رہ گیا الرحمٰن علی عرش الستوٰی رحمٰن عرش پر بیٹھ گیا ۔ تو یہ تاویل جو مجسمہ کرتے ہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ ایک معنیٰ یہ ہیں کہ استوٰی کے معنی غلبہ پانے کے ہیں ۔ یعنی رحمٰن عرش پر مستوی ہو گیا ۔ غالب ہو گیا ۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ پہلے غلبہ نہیں تھا بعد میں غلبہ ہوا ۔ دوسری صورت

یہ ہے کہ دو فریق میں جھگڑا ہوا اور ایک فریق غالب آجائے تیسری خرابی یہ ہے
کہ جس طرح عرش استوٰی ہے اسی طرح الرحمٰن علی الارض استوٰی
یعنی عرش پر تو غالب آگیا مگر کیا زمین و آسمان پر غالب نہیں آیا۔ پھر اس
کی تخصیص سے کیا فائدہ! اس کو مخلوق پر غلبہ حاصل ہے۔ عرش کی تخصیص
بے فائدہ ہے۔ یہ تاویل بھی نہیں لگتی۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ استوٰی
ازاغ کی ضد ہے۔ سیدھا پن ٹیڑھے پن کی ضد ہے۔ سیدھا پن اس کی ذاتی صفت
ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ٹیڑھا پن نہیں ہے۔ یہ دلیل بھی صحیح نہیں۔ یہ
ضروری نہیں ہے کہ اگر اس میں سیدھا پن ہے تو ٹیڑھ نہیں ہے۔ یا وہ متحرک نہیں
ہے۔ تو ساکن ہے اور اگر ساکن نہیں ہے تو متحرک ہے۔ جو مرے نہیں تو وہ حیّ ہے۔ ہم حیّ
ہیں اور مریں گے۔ مگر وہ حی ہے اور نہیں مرے گا۔ تو ضد صحیح نہیں بیٹھتی۔ اور اس
آیت میں یہ معنی لگتے بھی نہیں کہ رحمٰن عرش پر ٹیڑھا نہیں ہوا۔ بالکل بے معنی بات
ہے۔ اور نفی ازاغ سے استوا لازم نہیں آتا۔ یہی تین تاویلیں کی گئی ہیں۔
ان میں سے کوئی یہاں نہیں لگتی! اور امام مالک اور دیگر ائمہ نے اس کو متشابہات
میں رکھا ہے۔ کہ اس کا مطلب اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا
متشابہات کی تاویل نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تاویل کرنی ہی ہے تو یہاں ایک
بات اور ہے۔ بالکل نئی بات ہے۔ اسے آپ غور کریں۔

موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا جب وہ جوانی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہاں
استوٰی کے معنی انتہا کے ہیں جو قرآن شریف میں آئے ہیں۔ ان معنوں کو اگر یہاں لگایا
جائے تو صحیح لگتے ہیں کہ خالق کی صناعی عرش پر منتہی ہوئی یعنی عرش بنا کر خالقیت

کو ختم کر دیا۔ زمین سے آسمان۔ آسمان سے عرش تک کل کائنات بنا کر کام ختم کر دیا اس کے بعد کوئی کائنات نہیں بنائی۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا "فردوس جنت کا ایک سب سے اوپر کا حصہ ہے۔ اور اس کے اوپر عرش ہے۔" عرش کے اوپر کوئی شے نہیں ہے۔ یعنی ایجاد و تخلیق کا کام عرش پر ختم ہو گیا اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ نہ خلا ہے نہ ملا ہے۔ دوسری دلیل کہ استویٰ کے معنی انتہا کے ہیں ثم استویٰ الی السماء یعنی ارض سے اس کا نام آسمان کی طرف منتہی ہوا۔ کئی جگہ یہ لفظ استویٰ آیا اس کے معنی منتہی کے لگے یہی معنی یہاں لگا دیجئے۔ مطلب صاف ہو گیا۔ اگر تاویل کرنی ہو تو یہ معنی کرو کہ اس کی تمام کاریگری اور صنعت۔ خالقیت اور کائنات عرش پر ختم ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی صفت کا مسئلہ غلط ہے یہ سب سے پہلے معتزلہ نے نکالا اسی سے تمام شبہات پیدا ہوتے۔ اس کے بعد شیعیوں نے اس کو لیا۔ پھر بعض سنت جماعت علمائے کرام نے اس کو لے لیا۔ یہ ان سے لغزش ہوئی۔ ہمارے یہاں کے علمائے صفت کے مسئلہ میں غلطی یہ ہے کہ صفت کہتے ہیں عرض کو۔ سفیدی کسی شے کے ساتھ چمٹے گی پھر اس سے ایک اسم مشتق ہو گا۔ سفید سیاہی ایک جسم کے ساتھ قائم ہو گی۔ اور اس قیام سے ایک اسم مشتق کیا جائے گا۔ اس کا نام اسود اور سیاہ ہو گا۔ تو نہ یہ قرآن میں آیا نہ حدیث میں آیا۔ انھوں نے اپنی عقل سے گھڑا اور خالق کو مخلوق پر قیاس کیا۔ یہاں ذات و صفات ہیں۔ تو اس کے لئے بھی ذات و صفات قائم کئے۔ حالانکہ جو معنی ذات کے یہاں ہیں وہ وہاں نہیں۔ اسی طرح جو معنی صفات کے یہاں ہیں وہ وہاں نہیں سبحان ربك رب العزة عما یصفون۔ اس صفت سے پاک ہے جو وہ بیان کر رہے ہیں سبحان ربك رب العزة عما یصفون قرآن نے تو اس کی تردید کر دی۔ صفت تو

آپ سمجھ ہی گئے کہ صفت کیا چیز ہے اور کس طرح مشتق ہوتی ہے۔ تو قرآن نے ان کی
نفی کر دی صفتیں جو انسان بیان کرتے ہیں۔ اللہ ان صفات سے پاک ہے۔ ہمارے
یہاں صفت محمول ہے یعنی کوئی شے اس کو اٹھائے ہوئے ہے۔ تو اس طرح اللہ کی
ذات ان صفات کو اٹھائے ہوتے نہیں ہے کہ اس کے ساتھ قائم ہونے کے بعد اسم مشتق
ہو اور اس کے لئے وہ بولا جائے۔ بلکہ اس نے اپنے نام بتا دئے ہیں وہ انہیں ناموں سے
پکارا جائے گا۔ اس کے ناموں کے علاوہ کسی اور نام سے اس کو پکارنے کا کسی کو حق
نہیں ہے۔ مثلاً عقل سے عاقل مشتق کر کے خدا کو عاقل نہیں کہا جا سکتا۔ ذکاوت
اور سخاوت اچھی چیزیں ہیں لیکن خدا کو ذکی اور سخی نہیں کہا جائے گا۔ ارادہ سے اللہ کو
مرید نہیں کہا جائے گا۔ قیام اور ما قام مخلوق کی خصلتیں ہیں۔ تو کوئی صفت اس کے
ساتھ قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ جوہر اور عرض مخلوق ہیں تو ان کی خصلتیں یعنی مخلوق
خصلتیں خالق میں نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے اسماء مشتق کر کے اس کے لئے نہیں نکالے
جائیں گے۔ یہاں تک کہ وحدت بھی اس کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی تاکہ اس سے واحد
مشتق ہو بلکہ وہ واحد حقیقی ہے۔ صرف وہی واحد ہے کائنات میں کوئی واحد نہیں ہے
کیونکہ جو واحد بھی آپ لیں گے۔ وہ تقسیم ہو کر کثیر ہو جائے گا مثلاً ایک انگلی ہے۔ اس
کو آپ تقسیم کریں تو تین پورے بن گئے تو یہ ایک تین کے برابر ہے۔ وحدت کہاں رہی اس
کو اور تقسیم کیجئے تو تقسیم ہوتا ہی چلا جائے گا۔ تو یہ ایک ایک نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے اجزاء
کا مجموعہ ہے۔ یعنی آپ جس کو ایک کہتے ہیں وہ ایک نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ مجموعہ ہے
کئی اجزاء کا ۔ ہر شے کا یہی حال ہے تو اس کائنات میں وحدت نہیں ہے۔ بلکہ یہ وحدت
واحد حقیقی سے مستعار لے کر یہاں بولی جاتی ہے۔ یہاں واحد کا پتہ ہی نہیں ہے ۔ وہ

کائنات سے باہر ہے۔ وہ خالق کائنات ہے۔ اس نے اپنا نام واحد رکھا ہے۔ اس لئے اس کو واحد کہتے ہیں اگر عقل سے کوئی نیک نام اس کے لئے ثابت بھی ہو جائے تب بھی نہیں بولیں گے جب تک اس کی اجازت نہ مل جائے۔ اس نے سور کو شراب کو شیاطین کو فرعون کو ٹی بی کو سب کو پیدا کیا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے اے خالقِ خنزیر۔ اے خالقِ شیاطین۔ تو ہمارے اوپر رحم کر۔ اس نے کہا کہ میں اپنے آدمی کے ہاتھ اپنے نام کہلا بھیجوں گا اس نام سے مجھے پکارنا۔ اپنی عقل سے اور اپنی رائے سے کیسا اچھے سے اچھا نام ہو اس سے مت پکارنا۔ اس نے اپنا نام حکیم رکھا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ حکمت اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس سے مشتق کر کے اس کا نام حکیم رکھا۔ ایسا سوچنا الحاد ہے۔ کفر ہے۔ ناجائز ہے۔ بُرا ہے۔ حکمت کے معنی ہیں جلب منفعت اور دفع مضرت اور ان دونوں سے خدا پاک ہے۔ دونوں کی اس کو پرواہ نہیں۔ تو جس معنی میں ہمارے یہاں حکیم بولا جاتا ہے ان معنوں میں وہ حکیم نہیں ہے۔ حکیم اس کو نہیں کہتے جس کا فعل محکم ہو کیونکہ مکڑی اور شہد کی مکھی کا فعل محکم ہے۔ مگر اس کو حکیم نہیں کہتے۔ حکیم وہ ہے جس کے فعل پر اعتراض نہ ہو۔ یفعل ما یشاء جو چاہے کرے یحکم ما یرید جس کا ارادہ کرے وہ حکم دے دے۔ محض ارادہ اور مشیت سے اس کا فعل یا حکم صادر ہو وہاں عقلی استدلال کی ضرورت نہیں۔ عقل اس کے موافق استدلال کرے تو اس کے خلاف استدلال کرے تو دونوں صورتوں میں غیر معتبر۔ اس نے کہا یعذبھم اللہ اللہ ان کو عذاب دے گا۔ تو اللہ کو معذب نہ کہیں گے۔ رحیم بھی اس کو پکارتے ہیں کہ اس نے اجازت دے دی ہے۔ ورنہ رحیم کہہ کر بھی نہ پکارتے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ جس نام کی اجازت دے دی وہ تمہارے استدلال سے بھی صحیح بیٹھ جائے مگر استدلال اس نام کی بنیاد نہیں ہوگا۔

بنیاد اس کی اجازت ہے۔ میں نے حکیم کی یہ تعریف کی ہے حکیم وہ ہے جس کی مرضی کے مطابق فعل ہو سکتے ہیں نا کوئی کام نامکمل ہوا کہ کسر رہ گئی۔ دوبارہ کروں گا۔ اور جیسا چاہتا تھا ویسا بن گیا تو بڑا خوش ہوتا ہے۔ تو حکیم وہ ہے جس کا فعل اس کی منشاء کے مطابق ہو۔ بڑی تحقیق ہو گئی۔ اس کے باوجود بایں معنیٰ اس کا نام نہیں رکھنا چاہیئے۔ لہٰذا اشتقاق کا مسئلہ بالکل غلط ہے۔ تو اپنی عقل سے کوئی نام رکھ دینا خواہ وہ جسم ہو یا کوئی اور نام ہو غلط ہے۔ حی کہتے ہیں۔ اس کو جو حیات ہو۔ اب یہاں دو چیزیں ہو گئیں ایک حیات اور ایک وہ جو حی ہے۔ وہاں دو چیزیں ہیں ہی نہیں وہ تو واحد ہے۔ حی وہ ہے جو نہ مرے یہ بھی غلط ہے۔ ہم مر جائیں گے تو کیا ہم حی نہیں رہے ؟ اس نے اپنا نام بھی حی رکھا۔ حالانکہ وہ نہیں مرے گا۔ اور ہمارا نام بھی حی رکھ دیا۔ حالانکہ ہم مر جائیں گے۔ تو اس کو اختیار ہے جس کا جو چاہے نام رکھ دے۔ تو نام رکھنے کا حق اُسی کو ہے۔ بغیر جرم سابق کے اگر کسی کو دکھ دیا جائے تو ہماری عقل میں یہ ظلم ہے۔ ہم اس کے بھی قائل نہیں ہیں۔ یہ بھی ظلم نہیں ہے۔ اس نے نام ظلم رکھ دیا۔ اس لئے یہ ظلم ہے۔ کہ تم اگر ایسا کرو گے کہ بغیر جرم سابق کے کسی کو ایذا دو گے تو میں نے تمھارا نام ظالم رکھا۔ عقلاً وہ بھی ظلم نہیں ہے اس لئے کہ تمام کائنات میں برابر بڑی چیز چھوٹی کو کھا رہی ہے۔ مشہور ہے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ درندے جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ قوی جانور کمزور جانور کو کھا رہا ہے۔ مگر ہم کسی کو ظالم نہیں کہتے ہیں۔ اگر چھوٹا بچہ سوتے میں کسی کا گلا کاٹ ڈالے تو اس کو ظالم نہیں کہا جائے گا۔ حالانکہ ایذا متحقق ہے۔ اور ایذا دینے والا بھی ثابت ہے۔ مگر ظالم ثابت نہیں ہو گا۔ عقل کے خلاف ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا

جاتے کہ بغیر جرم سابق کے دکھ دنیا ظلم ہے۔ تو بچوں کی پیدائش۔ اندھے۔ لنگڑے لولے پیدا ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کنٹھ مالا اور قسم قسم کی بیماریاں ہو رہی ہیں۔ جانور ایک دوسرے کو مار رہے ہیں کھا رہے ہیں۔ مگر ان کو کوئی ظالم نہیں کہتا۔ بغیر جرم سابق کے۔ بکریوں۔ گایوں۔ مینڈھوں۔ دُنبوں۔ اونٹوں کو ذبح کرو کھاؤ اور مزید انعام پاؤ خود کھاؤ۔ اور فقیروں کو کھلاؤ۔ حضور اکرمؐ نے ۱۰۰ اونٹ ذبح کیے سب میں سے ایک ایک بوٹی لے کر سالن پکایا اور پیا۔ گویا سب میں سے کھالیا۔ کھلانے کا حکم ہے۔ اپنی عقل کے مطابق ان پر ظلم کرو۔ اور پکاؤ اور کھاؤ اور مزید انعام ملے گا۔ یہ عقل میں آتا ہے ؟ مگر کوئی خدا کو ظالم نہیں کہتا۔ جو خدا کا منکر ہے اس کا تو سوال ہی نہیں۔ مگر جو خدا کو مانتے ہیں۔ سب اس کو ارحم الرحمین ہی کہتے ہیں۔ بڑا دیالو ہے یہی کہتے ہیں۔ ظالم کوئی نہیں کہتا۔ آپ کے دروازے پر کوئی بھوکا پیاسا مر جائے تو سب آپ کو لعنت ملامت کریں گے۔ برا کہیں گے۔ ظالم ٹھہرائیں گے مگر لاکھوں کروڑوں آدمی بھوک سے پیاس سے۔ وبا میں مر رہے ہیں۔ خدا کو کوئی ظالم نہیں کہتا وہ کہتا ہے کہ تم یہ فعل کرو گے۔ تو میں نے تمہارا نام ظالم رکھا اور اگر میں وہی فعل کروں تو میں نے اپنا نام ظالم نہیں رکھا۔ محلے میں کوئی کسی کو مار ڈالے تو اس کا تدارک ہو گا وہ روزانہ مارتا ہے۔ مگر کوئی فریاد کوئی واویلہ نہیں کرتا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی طبیعت مجبور ہے۔ جبلی عادت ہے کہ خدا مارے تو جلائے تو ہر صورت میں ارحم الرحمین ہے۔ کیونکہ اس نے کہا میری ذات تمہاری ذات سے مختلف ہے۔ لیس کمثلہ شیئ۔ اس کی جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ خدا کہے کہ میری عبادت کرو، مجھے سجدہ کرو تو یہ بات صحیح ہے۔ اور اگر تم کہو کہ میری عبادت کرو مجھے سجدہ کرو تو یہ بات

کیسی ہے۔ غلط ہے۔ میری ذات تمھاری ذات سے خلاف ہے۔ اس لئے تم وہی کہو جو میں تم کو بتا دوں۔ انسان عاقل بالغ کے فعل کا نام اچھا۔ اور بُرا رکھا ہے۔ پاگل انسان نکل گیا۔ غیر بالغ نکل گیا۔ تمام جمادات۔ حیوانات۔ نباتات۔ ملائکہ۔ زمین۔ آسمان چاند سورج سب نکل گئے۔ ان کے کسی فعل کا نام بُرا نہیں رکھا۔ جو چاہیں کریں۔ کتا گندی موری میں سے پانی پی لیتا ہے۔ اس سے نہیں کہا کہ تو یہ ناجائز فعل کر رہا ہے۔ مگر تم اگر گندی نالی کا پانی پیو تو گندے ہو۔ نالائق ہو۔ بُرے ہو۔ گناہ گار ہو۔ حسن قبح اور عقلی دلیل عاقل بالغ انسان کے لئے ہے۔ اور کہیں جاری نہیں ہے۔ نہ خالق میں نہ مخلوق میں۔ علاوہ انسان کے ساری کائنات حسن قبح کے غیر مستحق ہیں۔ تو وہ ہر صورت میں ارحم الراحمین ہے۔ خواہ تکلیف اس سے پہنچے یا راحت۔ وہ رحیم مطلق ہے۔ وہ رحیم مقید نہ تھا ہے۔ جو فائدہ پہنچائے تو رحیم۔ نقصان پہنچائے تو غیر رحیم۔ تو اس نے اپنا نام رحیم رکھا۔ اور آپ کے دونوں نام رکھے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق کرو تو رحیم اس کے حکم کے خلاف کرو تو ظالم۔ نفس فعل میں کوئی حسن قبح نہیں ہے۔ مثال سے سمجھیں۔ ایک شخص نے دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ قاتل ہو گیا۔ سب اس کو بُرا کہیں گے۔ اب قاتل پکڑا گیا۔ اس کو سزائے موت دی گئی۔ جلاد کو بلایا گیا۔ اس نے قاتل کو قتل کر دیا۔ جلاد نے بھی قتل کیا۔ مگر اس کو کوئی بُرا نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ انعام و خلعت پائے گا۔ (مغلوں کے زمانے میں خلعت ملتی تھی اور انعام)۔ نفس فعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے بھی قتل کیا اور اس نے بھی۔ مگر جلاد نے مجسٹریٹ کے حکم سے قتل کیا۔ اپنی رائے سے قتل نہیں کیا۔ اس لئے اس کو کوئی بُرا نہیں کہتا۔ حاکم کا حکم اگر قتل کی بُرائی کو کھو دیتا ہے تو احکم الحاکمین کے حکم سے اگر قتل کیا جائے تو اس میں بُرائی کہاں رہی۔ یاد رکھیں آپ کا خدا ارحم الراحمین

ہے اوراحکم الحاکمین ہے۔ اور وہ اپنی تعریف سے بہت خوش ہوتا ہے تو آپ سب مل کر اس کی تعریف بیان کریں. اور اپنے لئے اور میرے لئے دُعا کریں۔

بندہ اپنے فعل کا خود خالق ہے

مسئلہ یہ ہے کہ بندہ اپنے فعل کا خود خالق ہے۔ یا خدا اس کے اندر فعل کو پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی بندے کو فعل کرنے سے پہلے فعل کرنے کی استطاعت ہے یا نہیں معتزلہ تو کہتے ہیں بندے میں فعل سے پہلے استطاعت ہے اور اہل سُنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ فعل کے وقت اس میں اللہ پاک استطاعت پیدا کرتا ہے اور شریعت میں اس استطاعت کے پیدا ہونے کو توفیق کہتے ہیں اگر یہ اچھے کام کی ہے اور اگر یہ برے کام کی استطاعت ہے تو اس کو خصلان کہتے ہیں اور اگر ان دونوں کے علاوہ ہو تو اس کو عون یا مدد کہتے ہیں۔ توفیق کو تیسیف بھی کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: کل میسر لما خلق لھم جس کام کے لئے جو شخص پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے۔ وہ خواہ نیکی کے لئے ہو یا بدی کے لئے۔ قرآنِ شریف میں دونوں قسم کی آیات ہیں جو دونوں گروہ اپنی اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ جن کو راستے کی استطاعت ہو۔ ان پر حج بیت اللہ فرض ہے اس

قسم کی متعدد آیات میں جن سے فعل سے پہلے استطاعت کا ہونا ثابت ہے۔

بحث :

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ایمان لانے کا حکم دیا ہے یا نہیں دیا اگر کہو کہ اس کو ایمان لانے کا حکم نہیں دیا تو یہ سراسر غلط بلکہ کفر ہے۔ اب اگر حکم دیا ہے تو کب دیا ہے۔ ایمان لانے کی استطاعت تھی اس وقت حکم دیا ہے یا اس وقت حکم دیا جب استطاعت نہیں تھی۔

اگر ایسے وقت حکم دیا۔ کہ جب استطاعت نہیں تھی تو ایسی تکلیف لازم آئی جس کی اس میں قدرت نہ تھی۔ مجبور کی تکلیف لازم آئی، اور اگر استطاعت تھی اس وقت حکم دیا تو ٹھیک ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اس میں استطاعت پہلے سے موجود تھی۔ اور استطاعت کی موجودگی میں اس نے حکم دیا، کہ ایمان لا۔ تو اب استطاعت فعل سے پہلے ہوگئی۔ اور تم کہتے ہو کہ فعل کے وقت استطاعت ہوتی ہے۔ اس کا جواب سنیوں نے نہیں دیا۔ استطاعت کے سُنّی اور معتزلہ دونوں ہی قائل ہیں۔ ایک فرقہ جہمیہ ہے وہ استطاعت کا قائل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بندہ کے افعال مثل جمادات اضطراری ہیں لیکن ان کی بات بالکل غلط ہے کیونکہ انسان جو حرکت کرتا ہے وہ رعشہ کی حرکت سے مختلف ہے اور رعشہ کی حرکت اضطراری ہے تو تیسے کی حرکات و افعال اضطراری نہیں ہیں۔ انسان میں استطاعت ہے ۔۔۔۔۔

اور استطاعت فعل کے ساتھ ہے اور وہ استطاعت انسان کے ارادے میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں وہ استطاعت پیدا کرتا ہے اسی کا نام توفیق ہے قرآن شریف میں اس قسم کی آیات بکثرت ہیں اور دوسری قسم کی آیات بھی بہت جگہ

آئی ہیں۔ معتزلہ نے یہ کہا کہ استطاعت فعل سے پہلے ہے یا فعل کے وقت ہے۔ اگر فعل سے پہلے استطاعت موجود ہے۔

اور اہل سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ قدرت سوائے خدا کے کسی میں نہیں ہے اور بندے کو قدرت ہے اور بندہ اسی قدرت سے فعل کرتا ہے۔ یہ دھوکا ہے، کوئی شے اللہ پاک کی قدرت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ قدرت صرف ایک ہی ہے اس میں ایجاد کی قابلیت ہے اور کوئی شئے ایجاد نہیں کر سکتی وھو کل علیٰ مولٰہ اور وہ اپنے مولا پر بھاری ہے یعنی اس کا بوجھ اس کا مولا اٹھائے ہوتے ہے۔ ممکن وہ شے ہے جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ نہ تو ایسا ہوگا کہ وہ ہو ہی ہو۔ اور نہ ایسا ہوگا۔ کہ نہ کبھی نہ ہو بلکہ وہ کبھی ہوگا اور کبھی نہیں ہوگا تو ممکن کو وجود اور عدم دونوں کی طرف سے نسبت برابر ہے۔ ممکن الوجود کو موجود کرنے والی چیز ممکن نہیں ہوگی بلکہ اس کو واجب کہتے ہیں وہ شے واجب الوجود ہوگی اس لئے کہ موجود کرنے والی شے اگر ممکن ہوگی تو اس ممکن کے لئے ایک اور شئے کی ضرورت ہوگی جو اس ممکن کو وجود میں لائے۔ لہٰذا موجود کرنے والا واجب الوجود۔ خالق۔ خدا ہوگا۔ ایجاد بندے کا خاصہ نہیں ہے۔ یہ ہے مذہب اہلِ سنت و جماعت کا۔ ایجاد کرتے والا معدوم کرنے والا وہی ہے۔ اس کے علاوہ کسی میں قدرت نہیں۔

اب وہ کہتے ہیں کہ بندہ میں جس وقت، وہ فعل کر رہا ہے اس وقت بندہ میں اس فعل کے خلاف پر قدرت ہے یا نہیں۔ اگر اس میں قدرت ہے۔ تو فعل اور ترکِ فعل ایمان اور کفر حرکت و سکون جمع ہو جائیں گے اور یہ محال ہے، مشاہدے کے خلاف ہے۔ اور اگر قدرت نہیں ہے۔ تو بھی ہم کہتے ہیں کہ خدا اس میں تاثیر کر دیتا ہے

جب فعل کی تاثیر کر دیتا ہے۔ تو فعل ہو جاتا ہے اور ترک کی تاثیر کر دیتا ہے تو بندے سے ترک فعل سرزد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فعل کے وقت ترکِ فعل کی قدرت نہیں۔ تو اب جو ترک فعل کرے گا تو یہ ایک نئی قدرت ہو گی۔ اسی کا نام توفیق تیسیر ہے اور یہ خدا کا فعل ہے بندے کو صرف وہم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدرت سے یہ فعل کر رہا ہے زین لھم سوء اعمالھم اس بدبخت کا کیا حشر ہو گا جس کا بدعمل اس کے لئے آراستہ پیراستہ کر دیا گیا ہے۔ یضل من یشاء و یھدی من نشاء بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے۔ بندہ جو کفر کر رہا ہے یا ایمان لا رہا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دونوں میرے فعل ہیں۔ وما کان النفس ان تومن إلا باذن اللہ۔ کسی شخص کو یہ مجال نہیں کہ وہ بغیر اذنِ الٰہی ایمان لے آئے۔ اذنِ الٰہی کیا ہے۔ اسی کو توفیق کہتے ہیں۔ معتزلہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان کی یہ بات غلط ہے۔ یہ اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ آج تک یہ کسی پر افشا نہیں ہوا کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ جس وقت وہ فعل کر رہا ہے اس وقت تک اس کو ترکِ فعل پر قدرت ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں ہے، اب وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں فعل اور ترک دونوں جمع ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں جمع نہیں ہوں گے اس لئے کہ کسی فعل پر قادر ہونا اور شے ہے اور اس فعل کا فاعل ہونا اور شے ہے۔ اللہ پاک ایک کروڑ سورج پیدا کرنے پر قادر ہے لیکن پیدا ایک ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ لاانتہا چیزوں پر قادر ہے لیکن منتہا چیزیں پیدا کیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے مگر تمام اشیا پیدا نہیں کیں تو کسی شے پر قادر ہونا اور شے ہے اور اس کا خالق ہونا اور شے ہے۔ کفر کے وقت ایمان پر اور ایمان کے وقت کفر پر بھی قادر ہے۔ تو یہی ہم کہتے ہیں اور اگر فعل

کے وقت ہے تو اس کی حاجت نہیں کیونکہ استطاعت کی ضرورت تو فعل کرنے کے لئے تھی جب فعل موجود ہو گیا تو اب استطاعت کی ضرورت ہی نہ رہی ۔

اب انھوں نے یہ کہا کہ یہاں دو قسم کی استطاعتیں ہیں ایک تو اعضاء کا صحیح ہونا دوسرا موانع کا معدوم ہونا ان دونوں کے مجموعے کا نام استطاعت ہے اور اس استطاعت کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ فعل کرنے پر قادر ہے ۔ یہ استطاعت ظاہری ہے مکمل نہیں ہے ۔ مکمل استطاعت وہ ہے جو خداوند تعالےٰ فعل کے وقت پیدا کرتا ہے ۔ تو جب انھوں نے کہا کہ یہ استطاعت جو آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ نامکمل استطاعت ہے وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا اس استطاعت کو دیکھ کر وہم ہوتا ہے ۔ کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے اور پھر مکمل استطاعت اس میں اللہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کے ذریعے وہ فعل ہو جاتا ہے یہی مکمل استطاعت توفیق الٰہی ہے ۔

لیکن یہ جواب غلط ہے، کیونکہ وہ سلامت اعضاء و موانع کا نہ ہونا جو ہے اس کو فعل کے پیدا کرنے میں دخل ہے یا دخل نہیں ہے ۔ اگر دخل نہیں ہے تو یہ بالکل بیکار چیز ہے ۔ اور اگر دخل ہے تو یہ مکمل استطاعت ہو گئی ۔

اور معتزلہ کی بات بھی غلط ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ فعل کے وقت اگر استطاعت ہوتی تو اس کی ضرورت نہیں، میں کہتا ہوں کہ فعل کے وقت استطاعت ہے اور اسی استطاعت سے فعل ہوتا ہے ۔ اگر فعل کسی اور ذریعے سے ہو جاتا تو پھر استطاعت کے ذریعے کی ضرورت نہ رہتی ۔

اب انھوں نے یہ بات کہی کہ کفر کے وقت بندہ ایمان لانے پر قادر ہے یا نہیں ہے؟

شریعت کے کل احکام حرکت اور سکون سے متعلق ہیں، نماز پڑھو حرکت ہے۔ چوری نہ کرو یہ سکون ہوا کہ چوری کی حرکت نہ کرو بلکہ وہاں رک جاؤ سکون کرو۔ تو انھوں نے کہا کہ حرکت کے وقت سکون پر قادر ہے یا نہیں۔ اگر قادر ہے تو محال لازم آتا ہے۔ کیونکہ حرکت کے وقت سکون ہو نہیں سکتا۔ اگر کہو کہ قادر نہیں ہے۔ تو ہمارا کہنا بھی یہی ہے کہ وہ قادر نہیں ہے بلکہ قدرت فعل بر وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ کفر کر رہا ہے، ایمان پر قادر نہیں ہے جب وہ کفر ختم کر دے گا قدرت ایمان لانے کی ملے گی اور وہ ایمان لائے گا اسی کا نام ہے استطاعت ہے اور اگر پہلے سے استطاعت ہوتی تو کفر کے وقت بھی وہ ایمان پر قادر ہو جاتا یہ عجیب بات انھوں نے کہی اور کہا کہ معتزلہ کے یہاں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ انھوں نے کہا کہ وہ یہ حکم دے رہا ہے کہ اس فعل کے بعد ایسا کر اس کے معنی یہی ہیں۔ کہ اس کو قدرت نہیں ہے۔ جب وہ اس فعل کو کرے گا تب وہ قدرت اس کو ملے گی یہ بہت بڑے بڑے عالم ہیں جنھوں نے یہ بات کہی ہے لیکن میں کہتا ہوں یہ بات بالکل غلط ہے لیکن قادر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو ایجاد بھی کرے۔ فلسفیانہ انداز میں کہتا ہوں کہ جس وقت کائنات کو پیدا نہیں کیا تھا اس وقت اللہ پاک کائنات پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں اگر قادر نہیں ہے تو عاجز ہو گیا اور اگر قادر ہے تو اجتماع النقیضین لازم آیا کیونکہ عدم کے وقت وجود ہو گا۔ یہ میری دلیل ہے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ کسی فرقے سے تعلق نہ رکھیں تو آپ کے خیال میں صحیح بات آئے گی۔ اگر آپ میں کسی طرف جھکاؤ موجود ہے، تو آپ کو جو جھکاؤ کے دلائل ہیں مرغوب ہوں گے اور جو اس کے ٹکراؤ کے دلائل ہیں وہ مرغوب نہیں ہوں گے یہ باتیں آپ مجھ ہی سے سنتے ہیں اور میں بھی سُنّی ہوں اور کوئی سُنّی یہ نہیں کہے گا کہ

سنیوں نے یہ غلطی کی ہے۔ یہ فرق بھی سمجھ لیں کہ سنی مذہب ایک الگ چیز ہے اور ان کے علماء کی رائے ایک الگ چیز ہے۔ جو قرآن اور حدیث اور اجماع کو تسلیم کرے وہ سنی ہے۔ یہ تو ہے دین۔ اور مذہب بہت ہیں۔ حنفی۔ شافعی وغیرہ

تو یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ بندہ کفر کے وقت ایمان پر قادر ہے لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ کفر کے وقت ایمان کا ایجاد بھی کر دے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی میں قدرت نہیں ہے یہ بعید کی چیز ہے۔ یہ بات حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی قادر نہیں ہے، کوئی عالم نہیں ہے کوئی خالق نہیں ہے۔ پھر اس کی تصدیق کیسے ہو؟ کہ بندہ سولہ آنے قادر ہے اپنے فعل پر ورنہ ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرنی چاہیے معتزلہ ثابت نہیں کر سکتے اگر بندے میں خدا کا فعل پیدا کرنا ثابت کرتے ہیں تو ثواب و عذاب۔ سوال و جواب سب ختم ہو جاتا ہے اور بندے میں اگر قدرت ثابت کرتے ہیں تو ان کے خیال میں وہ اس وقت سے بچ جاتے ہیں لیکن وہ نہیں بچتے وہاں بھی یہی صورت ہے۔ کسی فعل کو خود پیدا کر دینا یا اس فعل کے کرنے کی قدرت کسی کو دیدینا دونوں برابر ہیں کچھ بھی فرق نہیں۔ ابوجہل میں کفر پیدا کرنا اور اس کو ایسی قدرت دینا کہ وہ کفر کرے دونوں برابر ہیں۔ اس کا معتزلہ کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اللہ پاک نے اس کو جو فعل کرنے اور نہ کرنے پر جو قدرت دی ہے وہ تمام انسانی افعال پر سولہ آنے قادر ہے اور اس کو اس کا صحیح شعور ہے۔ بلکہ تمام جانور جانتے ہیں کہ بندہ قادر ہے اگر کتا آپ پر لپکے اور آپ زمین سے روڑا اٹھائیں تو یہ دیکھتے ہی فوراً بھاگ جاتا ہے وہ روڑے سے نہیں ڈرتا اس پر تو وہ پیشاب کرتا ہے لوٹتا پوٹتا ہے

وہ جانتا ہے کہ یہ حالت جبر میں ہے کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن جب آپ نے اسے اٹھا لیا تو یہ عالم اختیار آگیا اب یہ نقصان پہنچائے گا اس لئے ڈرتا ہے اسی لئے سونٹے کو چوہا کتر لیتا ہے لیکن آپ نے دکھایا تو فوراً بھاگ جاتا ہے جس سے پتہ چل گیا کہ اختیار انسانی کو جانور بھی جانتا ہے

اب اللہ تعالیٰ کل اشیاء کا خالق ہے اور بندے کے اعمال و افعال کا بھی خالق ہے تو پھر عذاب و ثواب کیسا امام فخر الدین رازیؒ نے تو یہ فرمایا، کہ اس کو حل کرنے کا کوئی حیلہ ہی نہیں ہے اور معتزلہ نے کہا کہ یہ تو ایسی چیز ہے کہ ایک آدمی کو رسیوں سے باندھ کر بکس میں بند کر دیا اور تالا لگا کر پانی میں پھینک دیا اب اس سے یہ کہا کہ نکل۔ ورنہ تجھے جلا دوں گا" سنیوں کا آخری جواب یہ ہے کہ "یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کے فعل سے سوال و جواب نہیں ہو سکتا" یہ بات تو انھوں نے ٹھیک کہی، یہ حق ہے کہ اس کے فعل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ لا یسئل عن ما یفعل اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ تمام نیکوں کو جہنم میں ڈال دے اور بدوں کو جنت دیدے۔ اگر وہ ایسا کرے تو عین انصاف و عدل ہوگا۔ اور وہ اس وقت بھی مستحق حمد ہوگا۔ اور یہ بالکل حسی بات ہے۔ اس دنیا میں آپ غور کریں تو کثیر تعداد کفار اور فساق کی مالا مال اور صاحب عزت و جلال ہے اور اللہ کے جو خاص بندے ہیں وہ اکثر مفلس، تنگ دست اور کمزور ہیں۔ تو اب وہ بدوں کو سکھ اور نیکوں کو دکھ دے کر جب وہ یہاں مستحق حمد ہے تو وہاں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات حق ہے کہ اس کے فعل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ اس بات کا جواب نہیں ہے ایک اور راز کی بات ہے جو اب تک کسی کو معلوم نہیں ہوئی کہ خدا کے کس فعل سے سوال نہیں ہو

سکتا۔ یہ وہ فعل ہے جو بلا واسطہ اس کا فعل ہو۔ اور جو فعل بالواسطہ ہوں گے۔ وہاں جواب میں وہ تمام واسطے آئیں گے جن کے ذریعے وہ فعل ہوا ہے۔ کپڑا گرم ہے تو سوال ہوگا کہ کیوں گرم ہے؟ جواب میں آئیگا کہ اس میں گرم روٹی رکھی ہے۔ روٹی کیوں گرم ہے؟ توے پر سے آئی ہے؟ توا کیوں گرم ہے؟ آگ پر رکھا ہے آگ کیوں گرم ہے یہ سوال نہیں ہوگا۔ کیونکہ آگ میں گرمی کو خدا نے براہ راست پیدا کیا ہے۔ باقی اور جتنے فعل ہیں وہ بھی خدا کے ہیں۔ لیکن وہ واسطوں سے ہوتے ہیں تو جواب میں وہ واسطے بیان ہوں گے۔ یہاں جو حکم دے رہا ہے براہ راست نہیں دے رہا۔ بلکہ اور یہاں جو حکم ہو رہا ہے یہ نبی کے واسطے سے ہو رہا ہے اسلئے جواب و سوال ہوگا۔

اب ایک بات میں کہتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ یہاں جتنے اعمال ہو رہے ہیں وہ سب راحت کا سبب ہو رہے ہیں۔ ملازمت آپ کرتے ہیں۔ کیوں؟ تاکہ آپ کو روپیہ ملے۔ روپے سے آپ کپڑا اور ضروریات مہیا کر سکیں۔ کھانا کپڑا کس لئے تاکہ آپ کو راحت ملے۔ راحت کس لئے؟ اس لئے کہ یہ خدا کا فعل ہے اس سے سوال نہیں ہوگا۔ راحت مقصود بالذات ہے اور تمام اعمال اس مقصود کو حاصل کرنے کے ذرائع ہیں اور آپ کی تنہا مشیت اس راحت کو حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کافی ہوتی تو ان ذرائع کی ضرورت نہیں ہوتی تو آپ اس راحت پر سولہ آنے قادر نہیں ہیں۔ اگر قادر ہوتے تو آپ قطعی حاصل کر لیتے اور وہ جو راحت ہے وہ خود بخود بھی نہیں۔ اگر قادر ہوتے یا اگر وہ خود بخود ہوتی تو ان اسباب کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلا اسباب کے ہو جاتی۔ تو جب وہ آپ کی مشیت سے ہے اور نہ خود بخود ہے تو پھر کیا ہے؟ یہ کسی اور کی مشیت سے ہونا چاہیئے اسی کا نام خدا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے افرئیتم ما تمنون ارے تم اس کو بھی جانتے ہو جو تم ٹپکاتے ہو؟ یا اس کو بھی نہیں جانتے ہو۔ ترے احمق ہو۔ یہ نطفہ کیا چیز ہے

ایمان لانے پر سب مکلف ہیں۔ بڑی سے بڑی عقل والا یعنی نبی اور کم سے کم عقل والا
دونوں مکلف ہیں۔ نبی نبوت سے پہلے سب سے زیادہ عقل مند ہوتا ہے اور انسانوں میں
بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی ہوتا ہے۔ تو دونوں میں وہ شے جس کے ذریعے ایمان
لائے گا۔ مشترک ہونی چاہیئے، تو وہ شے نہ عقل ہوگی نہ علم ہوگا نہ رُوحانیت ہوگی۔ بلکہ
وہ ایسی شے ہوگی جو زیادہ سے زیادہ عقل والا آدمی یعنی نبی اور کم سے کم عقل کا انسان
دونوں میں مشترک ہو اور وہ مشترک شے حِس ہے تو تعلیم کا ذریعہ حسّی ہوگا اس لئے
قرآن کے جتنے دلائل ہیں سب حسّی ہیں۔ جو ان دلائل کو عقلی بتاتے ہیں وہ سمجھتے نہیں۔
بے عقل ہیں۔ جو ان دلائل کو رُوحانی کہتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں۔ وہ سب حسّی دلائل ہیں۔
تاکہ کم سے کم عقل کا آدمی بھی سمجھ لے اور اللہ کی حجّت اس پر پوری ہو جائے۔

افرئیتم ما تمنون ءَانتُم تخلقونہ ام نحن الخالقون۔ ھو کی
ضمیر نطفے کی طرف پھر رہی ہے یا بچہ کی طرف جس کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں۔ یا
خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر خود بخود پیدا ہوتا ہے تو اسباب کے تحت نہ ہوتا اگر تمھاری
مشیت کے تحت ہوتا ہے تو تمھاری خواہش کے مطابق ہوتا آدمی بہت چاہتا ہے، مگر
اولاد نہیں ہوتی۔ کہیں اتنی ہوتی ہے کہ وہ دعا کرتا ہے کہ اللہ اسے بند کر۔ تو اب کون پیدا
کرتا ہے جو پیدا کرتا ہے وہی تو ہوں میں۔

آپ پر راحت جو مرتب ہو رہی ہے، تمام محنتوں اور اعمال پر یہ آپ کی مرضی اور
مشیت کے مطابق ہے، مگر اس میں آپ کی تنہا مشیت کافی نہیں ہے ورنہ اسباب کی ضرورت
نہ ہوتی اور خود بخود اگر ہوتی تو اسباب کے بعد نہ ہوتی۔ تو اب جو وہ ہوئی تو ایسی مشیت سے وہ ہوئی جو
اسباب کے تابع نہیں ہے وہ مطلق مشیت ہے وہی خدا کا فعل ہے۔ وہ مشیت تنہا کافی ہے اور

اسی مشیت سے یہ چیز بنی ہے اور آپ کی مشیت کے مطابق بنی ہے اس لئے وہ حسن ہے۔ تو جو شے اس کی مشیت سے بنے گی وہ حسن ہوگی اور چونکہ وہ غایت اس کی مشیت کا نتیجہ ہے اس لئے اس کے لئے کوئی غایت نہ ہوگی۔ ہمیشہ اسباب کے لئے غایت ہوتی ہے۔ اور وہاں جو فعل ہو رہا ہے وہ بلا اسباب ہو رہا ہے تو وہاں غایت نہیں ہوگی۔ تو وہاں سوال کیوں کا نہیں ہوگا جیسے: راحت کیوں ہے؟ یہ سوال نہیں ہوگا۔

عصمت

عصمت کے معنی سمجھ لیں۔ اس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی ہے۔ سخت غلطی ہوئی ہے۔ سوائے نبی کے ہر شخص سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ہوئی ہے اور ہوگی۔ نبی کے علاوہ کوئی شخص اس قابل نہیں ہے کہ غلطی نہ کر سکے۔ اور جتنی خبر قرآن اور حدیث میں آئی ہے۔ نبی کی غلطی کے متعلق۔ ان سے دونوں فریقوں نے استدلال کیا ہے۔ جن آیات سے نبی کی عصمت اور تقدس ثابت ہوتا ہے۔ اس سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی غلط ہے اور جن آیات سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ اس سے جو استدلال کیا ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔ آیات صحیح ہیں استدلال غلط ہے مثلاً اس وقت سورج نکلا ہوا ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔ مگر اس سے یہ استدلال کہ دھوپ لگے گی۔ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ بادل ہو سکتے ہیں۔ سائے میں بیٹھ سکتے ہیں۔ دھوپ نہیں لگے گی۔ وَعَصٰی آدم ربہ فغوی۔ آدم نے خدا کی نافرمانی کی اور وہ کج راہ ہو گیا۔ ذھب مغاضباً۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وھمت بہ وھم بھا

اس نے ان کے ساتھ قصد کیا اور انہوں نے ان کے ساتھ قصد کیا۔ یوسفؑ نے زلیخا
کے ساتھ۔ واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنات حضورؐ سے فرمایا اپنے
گناہوں کے لئے استغفار کر اور مسلمانوں کے لئے اور مسلمانیوں کے لئے۔ عبس وتولی
تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ انبیاء سے غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ آیات ان کی دلیلیں ہیں
تو نبی کی غلطی ان آیات سے جب ثابت ہوگی جب یہ آیات صحیح ہوں۔ اور یہ حق
ہو کر یہ من جانب اللہ ہیں۔ ان آیات کو نبی نقل کر رہا ہے۔ تو صحیح جب ہوں گی۔ جب
نبی سچا ہو۔ اگر نبی سچا نہیں ہے اور غلط کار ہے تو اس کے قول سے کیونکر استدلال
ہو سکتا ہے۔ تو ان آیات سے کیسے استدلال ہو سکتا ہے اور اگر نبی سچا ہے اور غلط
کار نہیں ہے تو پھر بات دم میں ختم ہو گئی۔ آیت کی دلالت کی ضرورت نہیں رہی۔ جس
آیت سے استدلال کر رہے ہو۔ وہ قابل استدلال جب ہوگی۔ جب آیت معتبر ہو اور
اس کا معتبر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ جو نقل کر رہا ہے وہ معتبر ہو۔ اگر ناقل غیر معتبر
ہے۔ اس سے خطا ہو سکتی ہے۔ تو ان آیات میں بھی تو خطا ہو سکتی ہے۔ اور جب خطا
کا امکان ہو گیا تو قابل استدلال نہیں رہیں۔ اور اگر وہ معتبر ہے تو وہیں۔ پاکی ہو گئی جھگڑا
ہی باقی نہیں رہا۔ اور جن آیات سے نبی کی پاکی بیان ہوتی ہے ان کی بھی ضرورت
نہیں کیونکہ وہ بھی معتبر جب ہوں گی۔ جب ناقل معتبر ہو اور جب ناقل کو پہلے
ہی معتبر مان لیا تو آیات سے استدلال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ
نکلا۔ اسے یاد رکھیں کہ نبی حجت ہے۔ قرآن پر۔ قرآن حجت نہیں ہے نبی پر۔ نبی یہ کہے
گا کہ یہ قرآن ہے۔ مجرد اس کے کہنے سے قرآن تسلیم کیا جائے گا۔ نبی کی صداقت قرآن
سے نہیں ثابت ہوگی۔ اس کے لئے معجزہ آئے گا۔ جب معجزہ سے نبی معتبر ثابت ہو گیا تو

اب وہ جوبات کہے گا وہ معتبر ہوگی۔ قرآن میں جوبات ہوگی وہ مزید تاکید ہوگی حجت نہیں ہوگی یعنی جو طریقہ عقلی استدلال کا ہمارے یہاں رائج ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہوچکا کہ یہ منزل من اللہ ہے اور معجزہ نے کردی تائید تو اب پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے سب ٹھیک ہے۔ اس میں گفتگو کرنے ہی کی ضرورت نہیں۔ اب اگر کہو کہ قرآن معجزہ ہے۔ تو قرآن کے معجزہ ہونے سے پہلے بھی تو وہ گفتگو کر رہا ہے۔ تو جب تک قرآن کے معجزہ ہونے کا اعلان نہیں ہوا اس وقت تک وہ نبی نہیں ہے۔ وہی تو آیات ہیں۔ جب دعویٰ ہوا کہ ایسی آیات نہیں لاسکتے تب ہی تو معجزہ ہوا۔

اب عصمت سمجھئے کہ یہ کیا چیز ہے اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ یہ کر اور یہ نہ کر۔ اس نے کہا یا ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا عیسیٰؑ یا ایہا الرسول۔ ہر نبی کو نام لے کر پکارا۔ لیکن آپ کو یا ایہا الرسولؐ اور یا ایہا النبیؐ کہہ کر پکارا۔ یہ آپ کا اعزاز اور تشریف ہے۔ اب جب اس کو اللہ یا کہہ کر پکارے گا تو نبیؐ اس پکار کو سن لے گا۔ اگر نہ سنے تو نافرمانی ہو۔ یہی معصیت ہے یہی گناہ ہے۔ غلطی اور گناہ کیا چیز ہے۔ خدا کے خطاب کا نہ سننا اور جب نبیؐ کو خطاب ہوتا ہے تو وہ سنتا ہے۔ تو اس کے لئے تو خطاب کا سننا اور مخاطب بننا لازم ہے اور جس کو خطاب نہیں ہورہا۔ اس کو مخاطب بننے کی ضرورت نہیں۔ غیر نبیؐ چونکہ مخاطب ہی نہیں ہے اس لئے وہ خطاب قبول کرنے کے قابل نہ ہونا یہی نافرمانی کا امکان ہے اس میں نافرمان بھی ہوگا۔ اور فرمانبردار بھی ہوگا۔ اس میں دونوں باتیں ہیں۔ نبیؐ تو سنے ہی گا۔ اگر نہ سنے تو وہ بھی نافرمان ہوگا۔ مگر ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ جب اس نے یا کہا تو نبیؐ نے سنا اور کہہ کیا کروں غلطی

کے معنی یہ ہیں کہ خطاب کو نہ سنے۔ یا خطاب سننے کے بعد اس کے خلاف کرے مگر نبیؐ ایسا نہیں کرتا۔ وہ سنتا ہے۔ پھر منتظر رہتا ہے کہ کیا حکم ہوتا ہے۔ پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ "اتبع ما یوحیٰ الی" میں تو صرف وحی کا تابع ہوں۔ ادھر وحی ہوئی ادھر فوراً عمل شروع ہوا۔ قل اعوذ برب الناس انہوں نے کہا میں مانتا ہوں تو رب ہے اگر میں کہوں کہ کہہ یا اللہ تو آپ کیا کہیں گے۔ یہی کہیں گے نا "یا اللہ" مگر آپ نے قل بھی ساتھ لگایا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ یہ قل کیا ہے۔ تو فرمایا کہ میں نے فرشتہ کو یہی کہتے سنا وہی میں نے تم کو بتا دیا۔ تو نبی تو لفظ قل کو بھی نہیں چھوڑتا۔ تو چونکہ امام مخاطب رب العالمین سے ہی نہیں۔ لہٰذا وہاں خطاب سے مطابقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نبی کے واسطے سے جو خطاب ہوگا۔ اس میں دونوں برابر ہیں۔ جو چاہے مان لے جو چاہے نہ مانے من شآء فلیومن ومن شآء فلیکفر۔ چاہے ایمان لائے چاہے انکار کر دے۔ نبی کا خطاب اس قابل نہیں کہ سنتے ہی مانا جائے۔ ہر شخص کو اختیار ہے مانے یا نہ مانے۔ خدا کا خطاب لازمی ماننا ہے۔ لازمی ماننے کے معنی یہ ہیں کہ معصوم ہو گیا۔ نبی کے علاوہ عصمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں طہارت ہے عصمت نہیں۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا اللہ تم کو چاہتا ہے کہ مطہر کر دے۔ اور نجاست کو تم سے دور کر دے۔ طہارت ہے۔ عصمت نہیں۔ عصمت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کپڑا میلا ہی نہیں ہوا۔ اجلا ہی اجلا ہے اور طہارت کے یہ معنیٰ ہیں کہ میلا ہوا اسے دھو ڈالا۔ صاف ہو گیا۔ جن کو وہ معصوم کہہ رہے ہیں۔ اصل میں وہ طاہر ہیں۔ امامیوں سے سخت غلطی ہوئی ہے۔ جب مسئلہ آئے گا تو بیان کر دوں گا۔

مسلمانوں کے تنزل کی وجہ

سب سے بڑی وجہ جو ہے مسلمان کے تنزل کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان تو نام تھا اس کتاب (قرآن) پر جس شخص کا ایمان ہو۔ تو جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا اس چیز کو چھوڑ دیا۔ اس کو یہ خبر نہیں وہ کس چیز پر ایمان لایا تھا؟ مسلمان تو اسی کو کہتے ہیں جو قرآن پر ایمان لایا ہو۔ تو وہ کس قسم کا ایمان لایا ہے؟ اس کے ایمان کے استنے اثر ہیں کہ شادیوں میں بیٹیوں کو جہیز میں یہ قرآن شریف ضرور دے دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ رسمیں معمولی سی باقی رہ گئیں ہیں۔ ورنہ کوئی ذرہ برابر قرآن پر توجہ نہیں دیتا یہاں تک کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں معلم۔ عالم۔ یا ذی علم کہلاتے ہیں۔ وہ بھی مطلق قرآن کو نہیں جانتے بلکہ اس سے دور ہیں۔ عملاً تو سب ہی دور ہیں۔ عمل میں تو سب پیچھے رہ گئے۔ علم جو اس میں اتنا بھرا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت سے مطلق مسلمان واقف نہیں ہے۔ کئی کئی صدی سے خبر نہیں کیا سمجھ گیا۔ اکثر میں نے دیکھا ہے۔ اکثر لوگوں نے لائنیں مقرر کر رکھی ہیں کہ ایک لائن تو عقلی ہے۔ اسے تو عقلی علم کہتے ہیں اور فلسفہ کہتے ہیں۔ اور ایک مذہبی چیز بتاتے ہیں۔ وہ یہ قرآن حدیث ہے تو دو قسمیں کر دی ہیں۔ انتہائی غلطی ہوئی ہے۔ متقدمین سے۔ اور وہ عقل کی جو کتاب ہے وہ تو یہی ہے اس سے زیادہ معقول کوئی کتاب ہی نہیں۔ ہر کتاب میں غلطی ہے جس میں غلطی نہ ہو وہ زیادہ عقلی ہے یا جو غلط چیز ہے وہ عقلی ہے۔ جو چیز عقل میں آجائے وہ ہے عقلی چیز۔ یا جو عقل میں نہ آئے وہ عقلی چیز ہے۔؟

یعنی عقل تو برابر یہ کہہ رہی ہے۔ زندگی کے بعد مرنا۔ پیدا ہو کر مرجانا یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ قطعی اس کو دل پسند نہیں کرتا۔ نہ عقل پسند کرے نہ شہوت پسند کرے۔ کہ کوئی پیدا ہو کر مرجائے۔ اگر کوئی شخص پیدا نہ ہوتا تو کچھ بھی حرج نہ تھا۔

گویا تمام مصیبتوں سے بچا ہوا تھا۔ تو عقل تو یہ کہہ رہی ہے۔ اور مشاہدہ یہ ہو رہا ہے کہ برابر پیدا ہو رہا ہے اور مر رہا ہے۔ تو واقعات عقل کے بالکل خلاف ہو گئے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ اور عقل یہ کہہ رہی ہے کہ یہ فعل غلط ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے تو معلوم ہو گیا کہ یہ واقعات جتنے بھی ہیں۔ کائنات اور واقعات پورے کے پورے یہ سب عقل کے خلاف ہیں۔ تو پھر عقلی علم سے کیا فائدہ ہوا۔ وہ جو عقلی علم ہوگا وہ تو واقعہ کے خلاف ہی ہوگا۔

کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ مرنے میں جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس تکلیف کی قیمت اگر تمام عمر کی بادشاہت مل جائے اور تمام عمر راحت ہی راحت اور لذت ہی لذت حاصل ہو اور پھر ایک جھٹکا جو لگے گا۔ یہ سانس گھٹے گا۔ اس تکلیف کی وہ پوری عمر کی راحت۔ لذت۔ بادشاہت۔ قیمت نہیں ہے۔ کم ہے۔ وہ بہت کم ہے کچھ بھی نہیں ہے یعنی اگر بغیر دیئے الگ مقابلہ کیا جائے کہ یا یہ لے لو یا یہ لے لو تب بھی عقل اس بات کو پسند کرے گی۔ کہ یہ نہ ہو یعنی موت کی تکلیف نہ ہو۔ خواہ بادشاہت چھوڑنی پڑے۔ ہر شخص اس بات کو جانتا ہے پھر کیا فائدہ ہوا۔ مرگیا نا؟ کیوں مرا؟ بالکل سیدھی سی بات ہے یہ۔ موت کی تکلیف اور اذیت اتنی زیادہ ہے کہ چوبیس گھنٹے انسان جو کام کر رہا ہے۔ اس سب کا مقصد یہی ہے کہ کسی طرح موت سے بچے اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ کھانا ہے۔ وہ صرف اس لئے کھاتا ہے کہ بھوک نہ ہو۔ کیونکہ بھوک کی شدت موت کا سبب بنے گی۔ پانی ہے۔ وہ اسی لئے پیتا ہے۔ ہوا ہے۔ اسی لئے سانس لیتا ہے۔ کہ مر نہ جائے۔ کچھ بھی کام آپ کریں۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ سب کا انجام جو ہے وہ یہی ہے کہ کسی طرح موت سے بچو۔ اور کوئی مقصد نہیں۔ آپ غور کر کے دیکھ لیجئے اس میں کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔ رد کرنے کی۔

اب کتنی حیرت کی بات ہے کہ چوبیس گھنٹہ موت سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے

جتنی دیر کوشش کر رہا ہے۔ اس سے بچنے کی۔ اتنا ہی اس کے قریب آرہا ہے۔ جتنی دیر کھانا کھائے گا۔ اتنا ٹائم اور ختم ہوگیا اور قریب آگیا موت کے۔ تو بہت بری بات ہوئی کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ مفر ہی نہیں رہا موت سے۔ سب سے بڑی عبرت دلانے والی جو چیز ہے۔ وہ صرف موت ہی ہے۔ اور کوئی شئے نہیں ہے۔ اگر انسان کو اس کا صحیح تصور ہو جائے۔

اسی لئے فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ موت کو یاد کرو۔ یہ ہاضم لذّات ہے۔ لذتوں کو مٹا دیتی ہے۔ کوئی مزہ نہیں آتا۔ جب لذت نہیں آئے گی تو وہ دھوکا نہیں کھائے گا۔ وہ کھانا جو کھاتا ہے۔ وہ لذّت کے دھوکے میں کھاتا ہے۔ اگر لذت نہ ہو یعنی بیمار ہو تو کھانا نہیں کھاتا۔ سب کہیں کیسا مزے دار ہے چکھ تو سہی وہ تھو تھو کر دیتا ہے اور نہیں کھاتا۔ تو وہ لذت جو ہے وہ دھوکہ دے رہی ہے۔ تو اس دھوکے سے بچنے کے لئے موت کو یاد کرنا چاہیئے۔ تاکہ موت کی تلخی کی یاد لذت کے دھوکے سے بچالے۔ تاکہ پیٹ بھر کر نہ کھائے۔ حکم یہ ہے کہ پیٹ بھر کے کھانے میں شیطان کو موقع ملتا ہے اندر داخل ہونے کا۔ اندر جاری ہونے کا۔ شیطان کو داخل ہونے سے بچاؤ بذریعہ بھوک کے۔

تو بالکل ظاہر بات ہے کہ مرنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ عقل کے جب خلاف ہے مرنا تو پھر کیوں مرا۔ یا پیدا ہی نہ ہوتا۔ تو اس کا صرف یہی ایک جواب ہے کہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں آیا۔ نہ اپنے ارادے سے مر رہا ہے۔ نہ اپنی خوشی سے آیا ہے۔ نہ اپنی خوشی سے جائیگا۔

جب اپنے ارادے سے نہیں آیا۔ کسی اور کی خوشی اور ارادے سے آیا ہے کسی اور کی خوشی اور ارادے سے جائے گا۔ تو جس کی خوشی سے آیا ہے۔ جس کی خوشی سے جائے گا۔ اسی کی خوشی سے یہاں رہنا بھی چاہیئے۔ اپنی خوشی سے

کیوں رہا اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کیوں رہا۔ جو لایا ہے اسی کی رائے کے مطابق یہاں رہنا چاہیئے۔ سیدھی سی بات ہے۔ اسے ہر شخص بہت کم عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ تو وہ جس کی خوشی سے یہاں آیا ہے اسی کی خوشی سے جائیگا۔ اب اس کی خوشی سے یہاں اگر رہا تو اس رہنے ہی کا نام دین ہے۔ اسی کا نام مذہب ہے۔ تو مسلمان اس بات کو بھول گیا۔ بس ایک رسم جاری ہوگئی ہے حج کرنے کی۔ چلے جارہے ہیں حج کو۔ ایک رسم جاری ہوگئی ہے نماز پڑھنے کی۔ پڑھ رہے ہیں۔ روزہ کی ایک رسم جاری ہے۔ یہ نہیں جان رہا کہ کون حکم دے رہا ہے۔ کس کے حکم کے مطابق یہ فعل ہم کر رہے ہیں۔ ہر فعل میں اس کی نیت ہونی چاہیئے۔ خلوصِ نیت ہو کہ اس کے حکم سے یہ فعل کر رہے ہیں۔ اور اس کے حکم سے اس فعل کو ترک کر رہے ہیں۔ یعنی وہ برے فعل کو جو ترک کر رہا ہے۔ وہ بھی ایک رسمی چیز ہے عادت پڑ گئی ہے۔ جیسے ختنہ کی عادت پڑ گئی ہے۔ تمام قوم میں رائج ہے۔ سب ختنہ کرا رہے ہیں۔ یہ نہیں جانتا کتنی بری چیز ہے وہ۔ کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔ زندہ گوشت کا کاٹنا۔ یہ کیوں کرا اپنایا ہے۔ یہ تو ابتدا میں اسی بنیاد پر دکھ اٹھایا گیا تھا کہ یہ حکم الٰہی کے مطابق ہے۔ اس کی خوشی کے لئے یہ دکھ اٹھایا تھا۔ اب وہ ایک رسم بن گئی۔ اس کے لئے دکھ اٹھانا چاہیئے، سکھ اٹھانا چاہیئے۔ اسی "لئے حق" کا نام دین ہے۔ یعنی ہر فعل اور ہر عمل اس کی رائے کے مطابق ہو۔ یہ تھا مسلمان کا کام۔ تو اب کیا کر رہا ہے۔ آدمی کہتا ضرور ہے اپنی زبان سے نام اس کا لیتا ہے۔ باقی یہ کرتا کراتا کچھ نہیں۔ نہ ہاتھ پاؤں سے کرتا ہے اور دل میں تو کچھ ہوتا نہیں۔ کیونکہ دل میں اگر ہو تو وہ کبھی نہ کبھی قاعدہ میں آئے۔ کبھی نہ کبھی اس میں خوف پیدا ہو اور ہیبت طاری ہو کہ یہ فعل غلط کر رہا ہوں اس خوف اور ہیبت سے دکھ پائے اور یہاں کے نقصان سے دکھ پاتا ہے اور رنجیدہ ہوتا ہے اور موت سے یا بیماری سے۔ ایسے ہی ترک نماز۔ اور ترک حج سے دکھ پائے۔ تو یہ نہیں

ہوتا۔ اگر دس ہزار روپوں کا نقصان ہوجاتے یہ اس کی حیثیت سے زیادہ ہو تو دکھ پاتا ہے یا نہیں۔ تو اسی طرح سے دس۔ پانچ یا پندرہ۔ بیس دن کی نماز قضا ہوجائے یا ج قضا ہوجائے یا روزے قضا ہوجائیں۔ تو اسے دکھ ہونا چاہیئے مطلق دکھ نہیں ہوتا۔ جب اس کی کوئی اہمیت نہ رہی تو وہ حکم الہٰی کے مطابق نہیں ہے۔ یہاں حاکم کے حکم کا جو خوف ہے۔ اتنا خوف کبھی حاکم الحاکمین کا نہیں ہوتا۔ یہ نقصان وہ چیز ہے۔ اس لئے مسلمان قوم تباہ ہوگئی اور اس کتاب کے اندر صرف یہی ذکر ہے۔ یہی بیان ہے۔ اس جہاں میں تم رہ رہے ہو۔ اس دنیا میں۔ یہ زندگی درحقیقت دھوکا ہے۔ اس کو اصل زندگی مت سمجھو۔ یہ سمجھانا ہے۔ تو جب یہ دھوکا ہے تو یہ مفید ہو نہیں سکتی تو پھر یہ لغو ہوگی۔ اور لغو اسے کہتے ہیں کہ جس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہاں ہونا ہوگیا۔ معلوم ہوگیا کہ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر نہیں ہے۔ تو لغو بھی نہیں رہی تو پھر کیا ہے درا صل یہ مفید چیز کا ذریعہ ہے۔ مفید چیز کوئی اور ہے اور اس کا یہ ذریعہ ہے۔ جیسے کہ روپیہ کمانا جو ہے اصل وہ مقصد ہے۔ اور دوڑ دھوپ بازاروں میں چلنا پھرنا۔ بسوں سے اترتے میں گر پڑنا۔ گاہکوں سے جھگڑا ہونا۔ یہ تمام محنتیں کرتا ہے تو وہ محنت جو ہے وہ لغو تو نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے کسی فائدہ کا۔ اسی طرح یہ پوری زندگی کسی دوسری زندگی کا ذریعہ ہے۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب

اصل میں آج کل جو مسلمانوں کی حالت خراب ہو رہی ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس آدمی سے جو کام لینا چاہیئے وہ نہیں لیا جاتا ۔ جو آدمی جس کام کا اہل ہے اس سے وہی کام لینا چاہیئے ۔ میرا کام وعظ کہنا یا مسائل بیان کرنا نہیں ہے ۔ یہ علوم تو بہت جمع ہیں اور اس کے اہل بکھرے پڑے ہیں ۔ وہاں سے آپ کو بہت مال ملے گا ۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے ۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جو رائیں علماء نے دی ہیں اور جو دلیلیں ان کی ہیں تو اگر ان میں کوئی خامی ہو تو وہ نکال دیں اور اس کی تصحیح کر دیں تو اگر دلیل غلط ہے تو صحیح دلیل اپنی طرف سے پیش کر دیں اور اپنی رائے دے دیں بس یہ ہے ہمارا کام ۔

اب ایک شخص نے قسم دی بیوی کو کہ اگر تو نے اپنے باپ کے گھر پہ قدم رکھا تو تجھ پر طلاق ہے ۔ تو ایک تو قدم رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ دہلیز کے اندر اپنا پاؤں رکھ دیا اور ایک معنی ہیں گھر میں جا کر رہنا سہنا ۔ تو امام ابو حنیفہؒ نے یہ فرمایا کہ اگر اس نے دہلیز پہ پاؤں رکھ دیا تو طلاق ہو جائے گی ۔ اور امام ابو یوسفؒ یہ فرماتے ہیں کہ نہیں جب تک وہ وہاں رہے سہے طلاق نہیں ہو گی ۔ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے پاؤں رکھنا حقیقت ہے اور رہنا سہنا مجاز ۔ حقیقت مجاز سے اولیٰ ہے ۔ لہٰذا اولیٰ پر فتویٰ ہو گا اور پاؤں رکھنے پر طلاق ہو جائے

گی۔ حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ واضع نے جس شئے کے لئے اور جس مفہوم کے لئے لفظ کو وضع کیا ہے وہ اس لفظ کی حقیقت ہے۔ مثلاً پانی کا مفہوم وہ سیال شئے ہے۔ جس کو پی کر پیاس بجھائی جاتی ہے۔ اور پانی پانی ہوگیا بھی ایک محاورہ ہے۔ جس کا مفہوم شرمندہ ہونا ہے تو پانی کے مجازی معنی شرمندہ ہونا ہے۔ اسی طرح قدم رکھنے کے معنی رہنا سہنا۔ مجازی معنی ہیں اور حقیقی معنی پاؤں رکھنا ہے۔ حنفی فقہ آدھا ان کا ہے۔ آدھا ان کا۔ کہلاتا حنفی ہی ہے امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ تین یہ ہیں۔ اور ایک ان کے استاد امام ابوحنیفہؒ۔ یہ چاروں مل کر حنفی فقہ کہلاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ یہ شیخین کہلاتے ہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ صاحبین کہلاتے ہیں۔ صاحبین میں سے ایک اور امام زفرؒ یہ مل کر طرفین کہلاتے ہیں۔ یہ فقہا کی اصطلاح ہے۔ تو امام یوسفؒ نے یہ فرمایا کہ مجاز رہنا سہنا ضرور ہے مگر مشہور ہے اور مشہور اولیٰ ہے۔ ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ حقیقت اولیٰ ہے۔ خواہ غیر مشہور ہی کیوں نہ ہو۔ بہت بڑا علم ہے۔ اس کا جواب دنیا کی کسی قوم میں نہیں ہے اور سب اللہ کی کتاب سے نکالا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اللہ کی کتاب اتنی چھوٹی سی ہے اور اس سے جو علوم مسلمانوں نے نکالے ہیں اور جو کتابیں اس پر لکھی گئی ہیں کہ اگر کراچی کے چاروں طرف چہار دیواری کھینچ دی جائے اور اس کو گڑھا بنا کر وہ تمام کتابیں اس میں بھر دی جائیں تو سما نہیں سکیں گی۔ اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ واضع نے جو لفظ جس شئے کے لئے بنایا ہے وہ اس لئے نہیں بنایا کہ اس شئے کو نام دینا تھا۔ بلکہ مراد یہ تھی کہ متکلم سامع کو اپنے دل کی مراد سمجھا سکے اور سامع کے دل میں متکلم کے دل کی مراد پہنچ جائے تو اصل مقصود مراد ہے حقیقت کچھ ہی ہوا کرے مراد مقصود ہوتی ہے۔ اب یہ لفظ جس واضع نے وضع کیا ہے۔ اس نے تو آپ سے کہا نہیں آپ نے صرف سنا ہے اور سن کر آپ نے اس کو تسلیم بھی کر لیا کہ پانی سے یہ شئے

مراد ہے اور تسلیم اس لیے کیا کہ ناقلین نے نقل کیا اور اس کو اس مفہوم میں استعمال کیا
تو ان ناقلین کی نقول پر لغت موقوف ہے اور ان ناقلین کے مجموعہ کا نام شہرت ہے ۔
اس لئے شہرت سے کسی مفہوم پر دلیل زیادہ اولیٰ ہے حقیقت سے ۔ یہ دلیل امام یوسفؒ
نے بیان نہیں فرمائی ۔ میں نے ان کے مذہب کی اپنی دلیل سے تعین کر دی اور کسی نے یہ دلیل
بیان نہیں کی ۔ تو اس مسئلہ میں امام ابو یوسفؒ کی رائے بمقابلہ امام ابو حنیفہؒ کے زیادہ قوی ہے
بس میرا یہی کام ہے ۔ آپ ہم سے یہ کام لے سکتے ہیں اور تیار مال تو بہت لوگوں کے پاس
رکھا ہے اور ان سے لینا چاہیئے ۔ ہمارے پاس کچھ تیار نہیں ہے ۔ ایک نگینہ ساز ہے ۔ وہ
دن بھر محنت کرتا ہے دو چار نگ تیار کرتا ہے اور چار روپے لے کر شام کو گھر چلا جاتا ہے
لیکن جوڑیا بازار میں چلے جائیے تو لاکھوں کا تیار مال مل جائے گا ۔ بس یہی صورت ہماری ہے ۔

نبوت اور معجزہ

سوال :- آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم شیطان کو ہوا، یہ حکم اللہ تعالیٰ نے براہِ راست شیطان کو دیا یا فرشتوں کے واسطے سے دیا اور تمہارے قول کے مطابق خواہ براہِ راست اللہ حکم دے یا بواسطہ ملائکہ حکم دے، دونوں صورتوں میں اللہ کا کلام کرنا شیطان سے ثابت ہو گیا اور کلام الٰہی ہی بقول تمہارے وحی ہے تو شیطان صاحب وحی ہو گیا اور صاحب وحی نبی ہے، لہٰذا اس بیان کے مطابق شیطان نبی ہو گیا، اس سوال کا کیا جواب ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نے نبی کی تعریف یہ کی ہے کہ جس بشر پر وحی نازل ہو جس بشر سے اللہ کلام کرے وہ نبی ہے جیسے فرمایا مَا كَانَ لِبَشَرٍ اور اگر غیر بشر سے بات کرے، اس کو ہم نے نبی نہیں کہا جیسے واوحٰی ربک الی النحل تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی بان ربک اوحیٰ لہا —— بایں سبب کہ تیرے رب نے زمین کو وحی کی تو شہد کی مکھی اور زمین دونوں غیر بشر ہیں اس لئے نبی کا لفظ ان پر نہیں بولا جا سکتا اور فرمایا واذ یوحی ربک الی الملائکۃ اور جب تیرے رب نے فرشتوں کو وحی کی تو ملائکہ کو بھی نبی نہیں کہا جا سکتا، باوجودیکہ ان پر وحی ہوئی، لہٰذا غیر انسان خواہ ملائکہ ہوں، خواہ شہد کی مکھی ہو، خواہ زمین ہو، خواہ کوئی اور شے ہو جس پر

اللہ تعالیٰ وحی کرے۔ جیسے واوحیٰ فی کل سماء ہر آسمان میں وحی کی تو یہ سب کے سب ان میں سے کوئی بھی نبی نہیں کہلائے گا، ہاں بیشک رسول، جن اور ملک ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا فاعل الملائکۃ رسلاً فرشتوں کو رسول بنانے والا یا معشر الجن والانس الم یاتکم رسول منکم اے جنوں اور آدمیوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے، لہٰذا نبی انسان کے علاوہ کوئی نہیں اور بھید اس میں یہ ہے کہ جن انسان کے تابع ہے۔ حقیقت میں مقصود کائنات انسان ہے، جن ضمناً ہے کیونکہ جن کی پیدائش انسان سے مقدم ہے اور انسان پر تکوین ختم ہے، اس لئے قابل خطاب الٰہی اولاد انسان ہی ہے، لہٰذا انسان ہی مخاطب بخطاب اول ہے اور اسی کو نبی کہتے ہیں۔

سوال:۔ تم نے کہا کہ جس انسان کی طرف وحی ہو وہ نبی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا واذا وحیت الی الحواریین ان آمنوا بی وبرسولی) اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور حواری انسان تھے، تو لابد حواری نبی ہو گئے، حالانکہ بالاتفاق حواری نبی نہ تھے

جواب:۔ یہ وحی براہ راست حواریوں کو نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ذرا آگے چل کر فرمایا۔ اور جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے کیا تیرا رب ہم پر خوان اتار سکتا ہے؟ عیسیٰ مریم کے بیٹے نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرو۔ اور اس سے آگے کا سارا کلام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ حواریوں پر براہ راست اللہ تعالیٰ کی وحی نہیں ہوئی ورنہ حضرت عیسیٰؑ سے اس سوال و

جواب کی نوبت ہی نہ آتی۔ خود حواری اللہ سے قرآن کی بابت پوچھ گچھ کر سکتے تھے، بلکہ یہ ایسی وحی ہے کہ جیسے فرمایا وقولوا آمنا باللہ وما انزل علینا کہو ہم ایمان لائے، اللہ پر اس شے پر جو ہم پر اتری یعنی قرآن پر اور ظاہر ہے کہ قرآن ہم پر براہ راست نہیں اترا بلکہ ہمارے نبی پر اترا، بس جس طرح ہمارے اوپر تنزیل ہوئی اسی طرح حواریوں پر وحی ہوئی۔ کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال :- کیا نبوت اشرف ہے یا رسالت ؟

جواب :- نبوت اشرف ہے رسالت سے کیونکہ نبوت کے معنی ہیں من جانب اللہ ہونا اور رسالت کے معنی ہیں خلق کی طرف ہونا، یعنی نبوت 'من' یعنی 'سے' کے معنی لئے ہوئے ہے اور رسالت 'الی خلق' یعنی 'تک' کے معنی لئے ہوئے ہے اور 'من' اور 'سے' ابتداء کے لئے ہے اور 'الی' اور 'تک' انتہا کے لئے ہے اور ابتداء اور بدایت نہایت سے اشرف ہے۔ کیونکہ ابتداء اور بدایت وجود ہے اور انتہا اور نہایت بقا ہے اور وجود بقا سے اشرف ہے، کیونکہ وجود بے بقا ہو سکتا ہے، بلکہ ہے اور بقا بے وجود کے نہیں ہو سکتی کیونکہ وجود آنی ہے اور بقا زمانی ہے اور زمانہ غیر مجتمع الاجزا اور فانی ہے اور آن میں اجزاء کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا نبوت رسالت سے افضل ہے۔

-اب اگر تو یوں کہے کہ وللآخرة خیر لک من الاولیٰ تیرے لئے نہایت ہدایت سے بہتر ہے۔ نیز عقبیٰ نہایت ہے اور دنیا ہدایت ہے،

اور ظاہر ہے کہ عقبیٰ یعنی نہایت دنیا یعنی ہدایت سے افضل ہے۔ نیز عمل،
ہدایت ہے اور جزا نہایت ہے اور جزا عمل سے افضل ہے۔ اس کا حل یہ
ہے کہ آخرت اور عقبیٰ اور جزا زمانے کے اعتبار سے نہایت ہیں لیکن حقیقت
میں ہدایت ہی ہیں کیونکہ یہ علل غائیہ ہیں اور علت غائی واقع میں مقدم ہوتی
ہے اسی وجہ سے فاعل کے فعل کی علت ہوتی ہے اور شعور اور تصور میں
مقدم ہوتی ہے، حاصل یہ ہے کہ آخرت، اولیٰ سے بظاہر بعد میں ہے لیکن
اللہ سے قریب ہے اور اولیٰ بظاہر مقدم ہے مگر اللہ سے بعید اور دور ہے

سوال:۔ جب کہ نبوت رسالت سے افضل ہے تو چاہیئے کہ نبی رسول
سے افضل ہو۔

جواب:۔ نبوت اور رسالت اگر الگ ہوں تو بیشک نبی رسول سے
افضل ہے جیسے ملائکہ کہ وہ رسول اللہ ہیں، لیکن نبی اللہ سے افضل نہیں ہیں
یعنی نبی بشر رسول ملکی سے افضل ہے، لیکن جہاں نبوت اور رسالت جمع ہیں
وہاں رسول نبی سے افضل ہے۔ یعنی نبیؑ مع رسالت کے نبی خالی الرسالت
سے افضل ہے۔ اگرچہ نبوۃ فی نفسہ رسالت سے افضل ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ رسول تو نبی مبلغ اور نبی صرف نبی غیر مبلغ تو تبلیغ کی فضلیت
نبوۃ کے ساتھ جمع ہو کر خالص نبوۃ جو تبلیغ سے خالی ہے اس سے افضل ہو گئی
اگرچہ دونوں وصفوں میں سے یعنی نبوۃ اور تبلیغ میں سے نبوۃ ہی افضل ہے
تو رسول کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نبی مبلغ نبی غیر مبلغ سے افضل ہے نہ
کہ تبلیغ نبوۃ سے افضل ہے اس لئے کہ یہ تبلیغ کی فضلیت غیر نبی کو بھی حاصل ہے

جیسے ملائکہ اور علماء امت کہ یہ نبی نہیں ہیں مگر تبلیغ کی فضیلت ان کو حاصل ہے
یہی وجہ ہے کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء امتی کانبیاء بنی
اسرائیل یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے علماء کی طرح قرآن کی تبلیغ
کریں گے، جس طرح انبیاء بنی اسرائیل تورات کی تبلیغ کرتے ہیں، اسی
طرح میری امت کے علماء قرآن کی تبلیغ کریں گے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ علماء
امت نبوۃ میں مثل انبیاء اسرائیل ہیں بلکہ تبلیغ میں مثل ہیں۔

تحقیق: ـــــ نوع انسانی تمام انواع کائناتی سے افضل ہے
ضابطہ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شے کسی شے کے لئے ہے، تو وہ شے اس شے
کے بغیر ناقص ہے، کائناتی اشیاء عرض اور جوہر میں منقسم ہیں۔ عرض کا
وجود جوہر کے لئے ہے، بغیر جوہر کے عرض متحقق ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے
عرض میں نقصان اور جوہر میں کمال ہے جوہر یا جسمانی ہے یا غیر جسمانی،
جسم یا جامد ہے یا نباتی یا حیوانی۔ یہ تینوں قسم کے جسم، جسم انسان میں خرچ
ہورہے اور جسم انسان کے لئے ہیں اور غیر جسمانی جوہر جیسے کہ ملائکہ اور مدبر
اجسام اور ارواح ہیں، لہٰذا تمام انواع کائناتی انسان کے لئے ہیں اور ضابطہ
یہ مقرر ہو چکا کہ جو شے کسی شے کے لئے ہے وہ شے اس شے سے ناقص ہے
اور دوسری شے اس سے کامل اور افضل ہے اور برہان قہار یہ ہے، کہ اگر
کائناتی انواع کے صناع کا مقصد صنعت انسان کے علاوہ کوئی اور نوع ہوتی
تو اس نوع پر صنعت ختم ہو جاتی، لیکن سوائے انسان کے کسی نوع پر صنعت ختم
نہیں ہوئی اس لئے معلوم ہو گیا کہ مقصد صنعت صانع صرف انسان ہی ہے، لہٰذا

ارض وسما اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ان میں سے کوئی شے مقصود
صنعت نہیں ہے، کیونکہ ہر شے انسان سے مقدم ہے اور یہ انتہائی تحقیق ہے

سوال :۔ جنت اور حور العین انسان سے مؤخر ہیں تو چاہیئے کہ انسان
سے افضل ہوں!

جواب :۔ جنت انسان سے مقدم ہے یا آدم اسکن انت وزوجك الجنة
اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو سہو اور فرمایا اعدت للذین آمنو
باللہ ورسولہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار کر لی گئی ہے جو اللہ اور اس
کے رسول پر ایمان لائے۔ اعدت یعنی تیار کر لی گئی ہے، ماضی کا صیغہ ہے۔
نیز اگر بعد میں بھی تیار ہو تو وہ انسان کے لئے ہے۔ اور جو شے کسی شے کیلئے
ہے وہ اس سے کمتر ہے۔

سوال :۔ انسان کو رسالت اور نبوت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

تحقیق :۔ انسان کو نبوت کی ضرورت ہے کیوں کہ انسان
مکلف بالاختیار ہے اور ہر مکلف بالاختیار محتاج رسول ہے، نتیجہ انسان
محتاج رسول ہے، ہم نے جو یہ کہا کہ انسان مکلف بالاختیار ہے، یعنی مکلف ہے اور
مختار ہے، اس کے مکلف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کا وجود کسی شے کے
لئے ہے یا تو اپنی ذات کے لئے ہے یا دوسری کسی شے کے لئے ہے، یا نہ
اپنی ذات کے لئے ہے نہ کسی دوسری شے کے لئے، تو یہ تیسری شق بالکل
باطل ہے کہ انسان کا وجود کسی شے کے لئے نہ ہو، نہ اپنے لئے نہ دوسرے کے
لئے اسی کو عبث کہتے ہیں، یعنی اگر انسان عبث ہوگا تو تمام حیوانات سے

بدتر ہو جائے گا۔ لیکن حیوانات تک بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ انسان ان سے
افضل ہے اور یہ افضلیت اس دار اور اس کائنات میں مقصود نہیں ہے۔
کیونکہ انسان کو ماضی کی اور حال کی اور مستقبل کی تینوں زمانوں کی تکلیف ہوتی
ہے۔ یعنی انسان کو گزشتہ کا حزن اور آئندہ کا خوف ہوتا ہے اور جانور کو
صرف حال کی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا اگر انسان کسی شے کے لئے نہ ہو تو جانور
سے بدتر ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ انسان عبث ہو گا۔ اور عبث کے
معنی ہیں کہ اس کے وجود پر کوئی اثر مرتب نہ ہو تو عام جمادات سے بدتر ہو
جائے گا، کیونکہ ہر جسم پر اثر حرکت و سکون مرتب ہے لہٰذا انسان کو عبث کہنا
گویا بدترین خلائق کہنا ہے لہٰذا کسی شے کے لئے ہے۔ اس وقت یا اپنے لئے
ہے۔ یا دوسرے کے لئے ہے۔ تو یہ شق کہ انسان کا وجود اس کے لئے ہے یہ
بھی غلط ہے کیونکہ اگر اس کا وجود اس کی ذات کے لئے ہوگا تو اس کا وجود اسی
کی ذات میں ہوگا اور جب اس کی ذات میں ہوگا تو اس کی ذات سے ہوگا یعنی
"لذاتہ فی ذاتہ" کو اور "فی ذاتہ بذاتہ" کو مستلزم ہے۔ جس کا وجود لذاتہ ہوگا تو
درحقیقت اس کا وجود بذاتہ ہوگا اور اس کی ذات سے ہوگا لیکن انسان کا وجود
انسان کی ذات سے نہیں ہے یعنی انسان کی ذات اگر انسان کے وجود کا تقاضا
کرے گی تو وحدت الوجود لازم آئے گا، کثرت باطل ہو جائے گی، حالانکہ
انسان میں کثرت متحقق ہے اور خالق کے وجود پر یہ برہان قہاریہ ہے، مطلب یہ
ہے کہ کسی شے کا وجود کائنات میں سے اس کا ذاتی نہیں ہے کیونکہ تقاضائے ذات
ذات سے جدا نہیں ہوتے اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ایک حقیقت ہے

اور زیدیت، بکریت اور عمریت یہ متغائر خاصے ہیں اور یہ حقیقت واحدہ کے لوازم ہو نہیں سکتے کیونکہ مرتبہ زیدیت میں عمریت کی نفی ہے اور نفی لازم یعنی نفی عمریت، نفی ملزوم یعنی نفی انسانیت کو مستلزم ہے، اس لئے وحدۃ کا لازم اور خاصہ کثرت ہو نہیں سکتی بلکہ وحدۃ کا لازم وحدت ہی ہوگی، اب اگر ذات انسان مقتضی وجود اور تشخص ہوگی تو انسان کا ایک ہی وجود اور ایک ہی تشخص ہو جائے گا اور یہ

محال بداہتاً ہے، لہٰذا انسان کا وجود انسان کی ذات سے نہیں ہے بلکہ غیر سے ہے اور جب ذات سے نہیں ہے تو ذات میں نہیں ہے اور جب ذات میں نہیں ہے تو ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ غیر کے لئے ہے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا کہ انسان کا وجود غیر کے لئے ہے اور یہی مکلف ہونے کے معنی ہیں، اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ خطاب اول 'کن' سے ہوا۔ اس کے بعد خطاب ہوا کہ "یہ کر یہ نہ کر"۔ یہ خطاب تکلیفی اگر براہ راست ہوگا، جس طرح خطاب تکوینی براہ راست ہے تو انسان مجبور ہو جائے گا، جس طرح وہ تکوین میں یعنی ہونے میں مجبور ہے، اسی طرح تکلیف میں یعنی کرنے اور نہ کرنے میں مجبور ہو جائے گا اور پھر انسان اور جمادات میں کچھ بھی فرق نہیں رہے گا، للہٰذا خطاب تکلیفی براہ راست نہیں ہو سکتا، وہ بواسطہ بشر ہوگا، بس یہی خطاب تکلیفی بواسطہ بشر، نبوۃ ہے یعنی انسان اپنے تکون اور موجود ہونے کے بعد خطاب ثانی تکلیفی کا محتاج ہے اور خطاب ثانی تکلیفی براہ راست نہیں ہے بلکہ ایسے واسطے سے ہے جو انسان کو مجبور نہ کرے اور یہی واسطہ نبوت ہے اور خطاب ثانی امر الٰہی ہے۔ لہٰذا انسان مکلف بالاختیار ہے اور مکلف بالاختیار ہی محتاج نبوۃ ہے، لہٰذا انسان

کہ نبوت کی اشد ترین حاجت ہے۔

سوال :۔ انسان مختار ہے اس کی کیا دلیل ہے ؟

جواب :۔ انسان کا مختار ہونا بدیہی ہے۔

سوال :۔ اگر بدیہی ہوتا تو اتنے اتنے بڑے علماء اختلاف نہ کرتے۔

جواب :۔ یہ اختلاف انتہائی نا فہمی کی بناء پر ہے، جانور بھی جانتا ہے کہ انسان مختار ہے۔ دیکھو کتا پتھر کے ٹکڑوں پر بیٹھا رہتا ہے اور جب انسان اس پتھر کے ٹکڑے کو اٹھا لیتا ہے تو ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔

سوال :۔ تمام اہل جبر اور اشاعرہ کہتے ہیں کہ انسان اگر مختار ہوتا تو اپنے لئے بہتری اور ہدایت پسند کرتا، کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اس کو غلطی اور گمراہی حاصل ہو، مگر انتہائی کوشش کے باوجود غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان مجبور ہے۔

جواب :۔ انتہائی کوشش ہی کا نام اختیار ہے' دقیقہ' اختیار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے ہدایت اور نیکی ہی حاصل ہو اور اگر اختیار سے صرف ہدایت اور نیکی ہی حاصل ہوتی تو اختیار' اختیار نہ رہتا بلکہ اضطرار سے بدل جاتا، اختیار تو اس کو کہتے ہیں کہ جس سے ہدایت اور ضلالت کبھی یہ کبھی وہ حاصل ہو یہ نہیں ہے کہ اختیار سے ہدایت ہی حاصل ہو ورنہ اختیار جبر ہو جائے گا، غور کرو، یہ تمام فضلاء اور اکابر علماء اس دقیقہ پر مطلع نہیں ہوئے اور اس مسئلہ کو آگے مفصل طور پر ہم بیان کریں گے، یہاں صرف اتنا سمجھنا چاہیئے کہ انسان، مختار ہے اور اس کا مکلف مختار ہونا نبوۃ کو مقتضی ہے، میں کہتا ہوں کہ حس کی شہادت بالکل کافی ہے

اور اس مسئلہ میں کہ انسان محتاج نبوت ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ چھوٹا بچہ منہ میں ماں کا دودھ بھی رکھتا ہے اور کنکر، پتھر، شیشہ کے ٹکڑے بھی رکھ لیتا ہے، یعنی فطرۃ فعل حسن یعنی ماں کا دودھ رکھنا اور فعل قبیح یعنی شیشے کے ٹکڑے وغیرہ رکھنا دونوں پر مختار ہے، یہ تو انسان کے مختار ہونے کی شہادت ہے، کہ وہ فطرتاً مختار ہے لیکن فطرتاً وہ حسن و قبح غذا اور غیر غذا میں تمیز نہیں رکھتا، یہ تمیز فطرتاً انسان میں باہر سے آئی ہے، اسی بیرونی تمیز کا نام نبوۃ ہے، لہٰذا فطرۃ انسانی محتاج تعلیم و تمیز ہے اور اسی تعلیم اور تمیز دینے کا نام نبوۃ ہے اگر کہو کہ یہ تمیز ماں باپ نے دی ہے، تو ہم کہیں گے کہ ماں باپ مرتبہ فطرۃ میں بے تمیز تھے اور یہ سلسلہ یا لا متناہی چلے گا جو محال ہے یا ایسے ماں باپ پر منتہی ہوگا جنھوں نے ماں باپ سے تمیز حاصل نہیں کی ہوگی، بس یہی باپ جنھوں نے اپنے ماں باپ سے تمیز حاصل نہیں کی نبی ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے تمیز دی ہے اور یہ تمیز انہوں نے خدا سے حاصل کر کے عام بنی نوع انسان کو دی اور انسانوں میں سے بعض نے وہ تمیز نبی سے حاصل کی اور بعض نے حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے۔

سوال :۔ معیار صداقت نبی کیا ہے، یعنی نبی کی صداقت کیونکر معلوم ہوتی ہے۔؟

جواب تحقیق :۔ نبی سے ایسا فعل صادر ہو جو ملتا جلتا ہو اس فعل سے جو اللہ سے صادر ہوا ہے اور جس طرح اللہ کے فعل کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح نبی کے فعل کا مقابلہ نہ ہو سکے۔ ملتے جلتے کی قید اس لئے لگائی ہے کہ اگر نبی کا فعل خدا کے فعل جیسا ہوگا تو فوراً انسان یقین کر لے گا اور ماننے

پر مجبور ہو جائے گا اور ایسی حالت میں تکلیف ساقط ہو جائے گی. لہذا نبی کے
ہاتھ پر ایسا فعل صادر ہو گا جو کہ اللہ کے فعل سے ملتا جلتا ہو گا، اسی فعل کو معجزہ
کہتے ہیں، بس معیار صداقت نبی صرف معجزہ ہے، یعنی نبی جب نبوۃ کا دعویٰ
کرے تو اس کی صداقت کے لئے، اس کے دعوے کے مطابق اس سے ایسا
خرق عادت فعل صادر ہو جو کسی انسان غیر مدعی نبوت سے صادر نہ ہو سکے
دعویٰ کی مطابقت ضروری ہے اگر خلاف دعویٰ کی پر خرق عادت کا ظہور ہو تو وہ
معیار نہیں ہے، جیسے مدعی نبوت نے کہا کہ میرے دعوے کی صداقت مردہ زندہ ہو کر
کرے گا، اب مردہ تو زندہ ہو گیا مگر اس نے زندہ ہو کر کہا کہ یہ مدعی نبوت جھوٹا ہے
تو اس صورت میں نبوت مدعی نبوت کی ثابت نہیں ہو گی بلکہ تکذیب ہو جائے گی اور
بعض اوقات غیر انبیاء سے بھی خرق عادت کا ظہور ہوتا ہے لیکن یہ خرق عادات
اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دیگر لوگوں سے صادر ہو سکتے ہیں لیکن جو خرق عادت
کسی غیر مدعی نبوت سے صادر نہ ہو سکے اسی کو معجزہ کہتے ہیں ۔

سوال :۔ معجزہ اور کرامت میں کیا فرق ہے ؟

جواب :۔ خرق عادت کے یہ معنی ہیں جو آثار مبدء فطرۃ میں اللہ تعالےٰ
نے اشیاء میں رکھ دیئے ہیں وہ ان اشیاء پر مرتب نہ ہوں، جیسے آگ میں حرارت
برف میں برودت وغیرہ. چونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان میں یہ آثار مقرر کئے ہیں
اس لئے اللہ تعالیٰ ہی ان آثار کو معطل کر سکتا ہے، اب اگر ان آثار کا تعطل اور
زوال، مادی اور جسمانی اسباب کے ماتحت ہوتا ہے تو یہ اسباب عادیہ کہلاتے ہیں
اور یہ آثار بھی عادی کہلاتے ہیں اور اگر روح کے واسطے سے ان آثار میں

تعطل اور زوال پیدا کرتا ہے تو اس کو خرق عادت کہتے ہیں کیونکہ عادت یہ
جاری ہوئی ہے کہ حرارت پانی میں تاثیر کرکے پانی کی برودت کو رفع کردے
تمام اجسام میں یہ طریقہ جاری اور عادی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم میں تاثیر کرے
اب اگر روح بلا واسطہ جسم تاثیر کرے تو یہ جسم کی عادت کے خلاف فعل کہلاتا ہے، اگر
یہ مومن کی روح سے سرزد ہوتا ہے تو اس کو کرامت کہتے ہیں اور کافر کی روح
سے سرزد ہوتا ہے تو اس کو استدراج یعنی ڈھیل کہتے ہیں اور اگر روح
کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کسی انسان کے ہاتھ پر براہ راست یا بواسطہ ملک فعل
پیدا کرتا ہے تو اس خرق عادت کو معجزہ کہتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ کرامت و استدراج
جسم کی عادت کے خلاف فعل کو کہتے ہیں اور معجزہ جسم و روح دونوں کی عادت
کے خلاف فعل کو کہتے ہیں اور شناخت یہ ہے کہ جو فعل اللہ تعالیٰ سے صادر
ہوتا ہے وہ نہ کوئی روح صادر کرسکتی ہے، نہ کوئی بدن۔ اس لئے وہاں تمام
ارواح و اجسام عاجز ہوجاتے ہیں اور دعویٰ اور تحدی یعنی چیلنج اس فرق کو
ظاہر کردیتا ہے، کوئی جن اور انس، کوئی بدن اور روح اس فعل کو نہیں
کرسکتی کیونکہ وہ فعل صرف من جانب اللہ ہوتا ہے، اس وجہ سے سارا عالم
عاجز ہوجاتا ہے، تمام روحانیات اور جسمانیات سب کے سب عاجز ہوجاتے
ہیں۔ اب رہی کرامت، چونکہ وہ روح کا فعل ہوتا ہے اور جو فعل ایک روح
کرتی ہے، وہ فعل دوسری روح بھی کرسکتی ہے، اس لئے صاحب کرامت دعویٰ
نہیں کرسکتا اور دعویٰ اگر کرے تو فوراً تعارض ہوجاتا ہے، جیسے جادوگروں
نے جب خرق عادت فعل ظاہر کیا یعنی سانپ دوڑنے لگے تو فوراً تعارض ہوا

اور عصا ان سب کو لقمہ کر گیا اور اگر وہ مقابلے پر نہ آتے اور یہی معنی دعوے کے ہیں تو وہ خرق عادت فعل جوں کا توں باقی رہتا جیسا کہ وہ ہمیشہ اس سے قبل کیا کرتے تھے، بس معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ کو یقین ہوتا ہے کہ اور صاحب کرامت کو ظن ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ "فلا تفعلوا" تم نہیں کر سکتے ولن تفعلوا اور تم ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے، تم ہرگز اس قرآن کی مثل نہیں لا سکو گے، تم سب جن و انس مل کر بھی کوشش کرو، تب بھی لا یاتون بمثلہ ہرگز نہ اس وقت لا سکتے ہو نہ آئندہ لا سکو گے کیونکہ صیغہ مضارع کا حال و استقبال کے لئے ہے، الغرض روح جب جسم کے واسطے کے بغیر فعل کرتی ہے تو اس فعل کو خلاف عادت جسمانی کہا جاتا ہے، مگر یہ ظنی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صاحب کرامت کا دل کمزور ہوتا ہے۔ اور صاحب اعجاز کا فعل روحانی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہاتھ پر خدا تعالیٰ فعل کرتا ہے، اس لئے اس کو اس فعل کے وقوع کا یقین ہوتا ہے اور وہ دعویٰ اور تحدی اور چیلنج کرتا ہے اور اس کا یقین حسی مشاہدہ کے یقین سے اکمل ترین ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ کو دریا میں ڈال دیا حسی مشاہدہ یقیناً اس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام غرق ہو جائیں گے لیکن "انا رادوہ" ہم اس کو واپس تیرے پاس لے آئیں گے، اس وحی کا یقین، حسی مشاہدہ کے یقین پر غالب آگیا۔ لہٰذا معجزہ خدائے تعالیٰ کا وہ فعل ہے، جس کا تعارض محال ہو اور کرامت کا تعارض ممکن ہے اور دونوں میں فرق دعویٰ سے ظاہر ہو جاتا ہے یہ غایت درجہ کی تحقیق ہے۔ اہل علم نے کہا ہے

کہ معجزہ وہ خرق عادت ہے جو نبی سے ظاہر ہو اور کرامت وہ خرق عادت ہے جو ولی سے ظاہر ہو۔ میں کہتا ہوں کہ معجزہ کی یہ تعریف صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ نبی پہچانا ہی جاتا ہے، معجزہ سے اب اگر معجزہ نبی سے پہچانا جائے گا تو دور لازم آئے گا۔ یعنی نبی کی معرفت معجزہ پر موقوف ہے اگر معجزہ کی معرفت نبی پر موقوف ہوگی تو اسی کو دور کہتے ہیں جو محال ہے، بلکہ صحیح تعریف یہ ہے کہ مدعی نبوت کے ہاتھ سے خرق عادت فعل اس کے دعوے کے مطابق صادر ہو تو وہ خرق عادت معجزہ ہے حاصل یہ ہے کہ جو خرق عادت قابل تعارض ہے وہ کرامت یا استدراج ہے اور جو خرق عادت قابل تعارض نہیں ہے یعنی جس کا معارضہ اور مقابلہ محال ہو وہ معجزہ ہے۔

سوال :۔ خرق عادت عقلاً ممکن ہے یا نہیں؟

جواب :۔ خرق عادت ممکن ہے، اس لئے کہ ممکن کو وجود و عدم دونوں کی طرف نسبت برابر اور یکساں ہے اور ممکن کی ذات اور ماہیت تساوی طرفین ہے اور دونوں طرفوں یعنی وجود و عدم میں تذبذب ہے۔ ممکن کی حقیقت تذبذب ہے اور وجود خرق تذبذب ہے، خرق مساوات ہے، خرق امکان ہے ہر ممکن کا موجود ہونا ہی خلاف عادت امکان ہے، لہٰذا تمام کائنات کا وجود خرق عادت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ازلی عادت ترک فعل کی تھی۔ اگر ازلی عادت فعل کی ہوتی تو عالم قدیم ہو جاتا، اور ان ہی کائنات خارق عادت پر انبیاء علیہ السلام کے خوارق پرکھے جاتے ہیں۔ یعنی نبی کا خارق عادت فعل اگر کائنات کے مشابہ ہو تو یہی معجزہ کہلاتا ہے۔

سوال :۔ روح انسانی میں اتنی قوت ہے کہ وہ خارق عادت بدن فعل کرے۔

جواب :۔ عادت بدن کے خلاف روح نباتی میں، قوۃ موجود ہے۔ دیکھو ایک ناخن برابر چھوٹا سا پتہ پہاڑ کو شق کر دیتا ہے اور روح حیوانی روح نباتی سے قوی ہے اور روح انسانی حیوانی سے قوی ہے اور روح ولی عوام ارواحِ انسانی سے قوی ہے اس لئے بدرجہ اولیٰ وہ خارق طبیعت بدن فعل کر سکتی ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ روح مردہ بدن کو زندہ کر دیتی ہے یعنی روح کے اتصال سے بدن زندہ ہوتا ہے، اور زندگی بدن کی طبیعت کے خلاف ہے، صرف روح ہی کے اتصال سے یہ زندگی حاصل ہوتی ہے، تو روح بدن کے ساتھ متصل ہو کر جب تاثیر کرتی ہے تو علیحدہ اور مجرد ہو کر بدرجہ اولیٰ تاثیر کر سکتی ہے دیکھو خواب میں روح کو بدن سے اور بدنی علائق سے کچھ تجرد ہوتا ہے، اس تھوڑے سے تجرد کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بے آنکھ کے دیکھتی ہے، بے کان کے سنتی ہے، بے مسافت قطع کئے منزل تک پہنچ جاتی ہے، غرضیکہ روح میں قدرۃ ہے اور بدن میں قوۃ ہے اور قدرۃ قوت پر غالب ہے، کیونکہ قوۃ یکطرفہ فعل کا نام ہے اور قدرۃ دوطرفہ فعل کا نام ہے اور دوطرفہ فعل یکطرفہ فعل سے قوی اور اشرف ہے، اس کو اختیار کہتے ہیں، نیز روح امر الٰہی ہے، اور بدن فعل الٰہی ہے اور امر خلق سے مقدم ہے کیونکہ امر کن سے خلق کا ظہور ہوتا ہے، نیز روح میں فعلیت ہے اور بدن میں صلاحیت ہے اور فعلیت صلاحیت سے قوی اور اشرف ہے، نیز روح میں وحدت ہے اور بدن میں کثرت ہے اور وحدت

کثرت سے قوی تر ہے، کیونکہ کثرت محتاج وحدت ہے اور وحدت مستغنی کثرت
ہے اور مستغنی محتاج سے قوی ہے، حاصل یہ ہے کہ جوں جوں جسمانیت لطیف
اور خفیف ہوتی جائے گی اسی قدر روح میں بدن میں رہتے ہوئے قوت
بڑھ جائے گی، چنانچہ ہوا، پانی، مٹی سے زیادہ قوی ہے، بس جس قدر کہ
روح جسمانی عوائق سے لطیف اور خفیف ہوتی جائے گی اسی قدر روح میں
بدن میں رہتے ہوئے قوت بڑھ جائے گی اور اس وقت روح سے خلاف عادت
بدن افعال صادر ہونے شروع ہو جائیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ قوت ارادی تمام
قوتوں پر فائق ہے اور یہ قوت ارادی روح کی خصلت ہے، بدنی تقاضوں کے
خلاف ارادہ غالب آجاتا ہے جیسے روزے میں تمام خواہشات اور شہوات ارادہ
سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور یہ طبیعت بدن کے خلاف روح کا عمل ہوتا ہے
ہاں بے شک بدن روح کا آلہ اور اوزار ضرور ہے، اس بیان سے واضح
ہو گیا کہ خرق عادت بدن افعال ارواح اولیاء سے اور ارواح اہل یاضت
سے صادر ہوا کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خرق عادت شے کا ظہور خرق
عادت فعل کا ثمرہ ہے، لیعنی بھوک کے وقت جائز کھانا کھا لینا اور پیاس کے وقت
جائز پانی پی لینا اور شہوت کے وقت منکوحہ سے جماع کر لینا یہ عادت بدنی ہے
اور جبکہ انسان ان بدنی عادتوں کے خلاف کرنے پر قادر ہو گیا ہے، لیعنی
بھوک کے وقت حلال اور جائز کھانا نہ کھایا وغیرہ وغیرہ تو اس کے خلاف عادت
فعل کا لازمی ثمرہ خلاف عادت شے کا ظہور ہے اور یہ ہر انسان میں موجود -
ہے۔ لہٰذا کرامت کسب پر موقوف ہے۔ اور ظنی ہے اور معجزہ خالص وہب

ہے اور یقین ہے، بس یہی فرق معجزہ اور کرامت کا ہے) چنانچہ معلوم ہو گیا کہ خرق عادت بدن فعل روح کر سکتی ہے اس میں اس کی قوت ہے۔

سوال :۔ ولی کس کو کہتے ہیں ؟

جواب :۔ ولی قریب کو کہتے ہیں، جو شخص نبی کی اطاعت کامل ترین کرتا ہے، بالکل نبی کے قدم بہ قدم چلتا ہے، اس کو ولی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان اولیاء اللہ الا المتقون متقی ہی اولیاء اللہ ہیں اور متقی کی تعریف فرمائی ھدی للمتقین یہ کتاب متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور متقی کون لوگ ہیں الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوۃ ومما رزقنا ھم ینفقون متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، قرآن شریف کی شہادت اس بات پر ہے کہ ولی صرف متقی ہی ہیں اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ولی وہ ہے کہ جس کو صرف خدا تعالیٰ سے تعلق ہو، یہ صحیح ہے لیکن خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے والا صرف نبی ہی ہے، لہٰذا نبی کی اطاعت ہی کا نام ولایت ہے۔

سوال :۔ نبوت افضل ہے یا ولایت ؟

جواب :۔ نبوت افضل ہے! اس لئے کہ نبوت اصل فضیلت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا کسی بشر سے خطاب کرنا بس یہی اصل افضیلت ہے، باقی تمام فضیلتیں اس فضیلت کی فرع ہیں، یعنی خدا تعالیٰ کا کسی بشر کی طرف متوجہ ہونا نبوت ہے اور پھر اس بشر کا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا، اس کی عبادت کر کے اس کے احکام کی تبلیغ کر کے اس کی طرف دل لگا کر کے یہ سبب کچھ ولایت ہے لہٰذا خدا کا بشر کی

طرف متوجہ ہونا یعنی نبوت بشر کے خدا کی طرف متوجہ ہونے یعنی ولایت سے افضل ہے، لہٰذا نبوت نبی ولایت نبی سے افضل ہے اور غیر نبی کی ولایت نبی کی ولایت کی فرع ہے اور فرع اصل سے افضل نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ اس شے سے جو اصل سے بھی افضل ہو یعنی نبوت مطلب یہ ہے کہ نبی کی نبوت نبی کی ولایت سے افضل ہے اور نبی کی ولایت تمام اولیاء کی ولایت کی اصل ہے اور تمام اولیاء کی ولایت نبی کی ولایت کی فرع اور ظل ہے، اس لئے ولی کی ولایت کیونکر نبی کی نبوت سے افضل ہو سکتی ہے اور جن لوگوں نے ایسا کہا ہے وہ غلط ہے یہاں یہ بات معلوم رکھنی چاہیئے کہ نبوۃ کی نوعیت ہی الگ ہے، ولایت کی نوعیت الگ ہے، یعنی نبی کی نبوت اور چیز ہے اور نبی کی ولایت اور چیز ہے، نبی کی نبوت کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کا بشر کو مخاطب بنانا ہے اور اس بشر کا خطاب کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا، یا اس بشر یعنی نبی کی ولایت ہے اور غیر نبی کی ولایت اس بشر یعنی نبی کے کہنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے، لہٰذا نبی کے کہنے سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا یہ ایک ادنیٰ چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کے کہنے سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا یہ اعلیٰ چیز ہے اور ان دونوں ولایتوں میں اصل و فرع علت و معلول کی نسبت ہے، یعنی کسی مرتبہ علت میں معلول کا پتہ نہیں ہے، اسی طرح ولایت نبی کے کسی مرتبہ علت میں بھی ولایت ولی کا پتہ نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مرتبہ نبوت میں نبی کی ولایت کا پتہ نہیں ہے، چہ جائیکہ ولی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہو اور چہ جائیکہ نبی کی ولایت سے ولی کی ولایت افضل ہو۔ اب رہا رسالت کا معاملہ تو اکثر محققین اس بات کو نہیں سمجھے کہ رسالت مرتبہ

ولایت نبی میں سے ہے، یعنی جس طرح نبی نماز پڑھ کر مرتبہ قرب وولایت میں ہوتا ہے، اسی طرح نماز پڑھوا کر اور پڑھا کر بھی مرتبہ قرب ولایت میں ہوتا ہے یعنی خود اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا اور دوسروں کو قریب کرنا اور یہی رسالت کا مفہوم ہے، دونوں ایک چیز ہیں، لہٰذا رسالت رسول، ولایت رسول کا ایک فرد اور ایک قسم ہے، غور کرو زیر کا بادشاہ کے پاس خود جانا اور دوسروں کو لیکر

جانا ایک ہی قسم کی چیز ہے اور یہ کہنا کہ رسالت خلق کی طرف توجہ کا نام ہے، جیسا کہ عام طور پر قدما میں مشہور ہے یہ غلط ہے، یاد رکھ اور کبھی نہ بھول، نبی کسی وقت بھی خلق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت خالق ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کبھی تنہا متوجہ ہوتا ہے، یہ ولایت کہلاتی ہے، کبھی خلق کو ساتھ لے کر خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یہ رسالت کہلاتی ہے، غرض کہ ہر حال میں نبی خواہ عالم ولایت میں ہو خواہ عالم رسالت میں، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا تو آیا اس کو لے کر آ ایک ہی چیز ہے، ہاں بے شک اللہ تعالیٰ کا نبی کی طرف متوجہ ہونا ہر حال میں نبی کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے افضل ہے یہ بہت غور کا مقام ہے، اکثر لوگ اس مقام پر پھسل گئے ہیں۔

سوال:۔ نبی کا علم کیسا ہے، اور ولی کا علم کیسا ہے، نبی کے علم اور ولی کے علم میں کیا فرق ہے، نیز نبی کے علم اور عقلاء اور عوام کے علم میں کیا فرق ہے؟

جواب، تحقیق:۔ پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ حواس سے جو علم ہوتا ہے اس میں حیوان اور انسان برابر ہیں فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل سے بھی علم ہوتا ہے جو حیوان کو حاصل نہیں ہوتا اور یہ عقلی علم کبھی فطری ہوتا ہے، یعنی بالمفصل جیسے ہر

شخص جانتا ہے کہ تمام انسان مر جائیں گے، حالانکہ اس کو معدودے چند کے علاوہ کسی کی بھی موت کا مشاہدہ اور احساس نہیں ہوتا اور عقلی فطری علم ہر انسان میں بالفعل موجود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور ایک عقلی نظری علم ہوتا ہے جو کسب پر موقوف ہے اس کی صلاحیت اور قابلیت بھی ہر انسان میں ہوتی ہے، مگر فعلیت یعنی بالفعل حصول نہیں ہوتا۔ اسی سے عالم اور جاہل میں تمیز ہوتی ہے، عالم بالفعل کسی علم پر قادر ہوتا ہے اور جاہل بالقوۃ کسبی علم پر قادر ہوتا ہے، ایک علم نہ حس سے حاصل ہوتا ہے نہ عقل سے بلکہ روح سے حاصل ہوتا ہے، جیسے صحیح واقعات کا خواب میں ظہور اس علم کو مکاشفہ کہتے ہیں اور اس کی قابلیت اور استعداد بھی ہر انسان میں کم سے کم ہوتی ہے تو روح سے جو علوم حاصل ہوتے ہیں، وہ اولیاء کو حاصل ہوتے ہیں اولیاء کو نظر عقلی اور نظر حس سے علوم حاصل نہیں ہوتے بلکہ روح کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ کہیں علم کا ذریعہ حاسہ ہے اور کہیں عقل اور کہیں روح ہے، انبیاء میں یہ تینوں قسم کے علوم بحیثیت نبوۃ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ انبیاء کے علم کا ذریعہ نہ حس ہے، نہ عقل، نہ روح، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ نبی کا علم خصوصی ان تینوں ذریعوں سے علیحدہ ہوتا ہے، جس طرح حیوان دیکھنے میں آنکھ کا محتاج ہے اور عقلاء عقل کے اور عرفاء کشف کے اسی طرح نبی صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے، یعنی نبی اللہ تعالیٰ کے ذریعے ہر شے کو دیکھتا ہے، یعنی نبی کے لئے اللہ تعالیٰ ذریعہ رویت اور ذریعہ علم ہوتا ہے اور جو اللہ دکھاتا ہے، جس طرح عقلیات کے لئے حس کافی نہیں اور

کشفیات کے لئے عقل کافی نہیں اسی طرح نبوۃ کے لئے کشف کافی نہیں ہے،
یعنی اللہ تعالیٰ جو دیکھتا ہے، وہ ہی نبی کو دکھاتا ہے تحکم بین الناس
بالحق بما اراك الله لوگوں کے درمیان حق فیصلہ کر، اس علم کے ذریعہ جو اللہ
تعالیٰ نے تجھ کو دکھایا ہے، الغرض نبی کے علم کی نوعیت بالکل علیحدہ ہے، یہی وجہ
ہے کہ نبی کے علم کے مقابلہ پر اگر بدیہی مشاہدہ بھی آجائے تو بدیہی مشاہدہ
ترک کیا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے دریا میں حضرت
موسیٰ کو ڈالدیا، یہ بدیہی مشاہدہ موت کا تھا اور فرمادیا تھا انا رادوہ الیك
ہم تیرے پاس اس کو (زندہ سلامت) واپس بھیجدیں گے، یہ وحی تھی، لہٰذا
انہوں نے وحی پر عمل کیا اور وحی کو ترجیح دی اور حسی مشاہدہ کو رد کیا، یعنی
موت کا تصور بھی ان کو نہیں ہوا کہ پانی میں ڈالنے سے موت واقع ہو جائے گی
بلکہ وحی کا یقین کر کے پانی میں ڈال دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا نبی کا علم
بدیہی مشاہدہ سے قوی ہوتا ہے، جیسے بدیہی مشاہدہ شہید کی موت کا ہے
لیکن اللہ تعالیٰ نے شہید کی موت کو حیات فرمایا، یہ علم بدیہی مشاہدہ پر غالب آیا
اور شہید کو حی یعنی زندہ کیا، لہٰذا جو علم انبیاء کو حاصل ہوتا ہے، اس کا کوئی حصہ
کوئی جز صدیقین کے نصیب میں نہیں ہوتا ہاں اس علم کے ذریعہ جو معلومات ہوتی
ہیں وہ اہل کشف، اہل عقل اور اہل حس کو بتائی ضرور جاتی ہیں اور ہر ایک
طبقہ اپنے اپنے ادراک کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، نبی کو
زمین اور مٹی سے روز جزا آدمی کے پیدا ہونے کا اس سے بھی زیادہ شعور
ہوتا ہے جیسا کہ عوام کو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کا شعور ہوتا ہے، عوام

کو حاسہ کے پیچھے کی چیز کا شعور نہیں ہوتا، عوام کو پس پردہ چیز کا شعور نہیں ہوتا
عوام کو کائنات سماوی کا شعور نہیں ہوتا، عوام کو مابعد الموت اور مابعد البعث کا
شعور نہیں ہوتا، جنت اور دوزخ کا شعور نہیں ہوتا، نبی کو اسی زندگی میں
ہر شے کا شعور ہوتا ہے اور ظاہر ہے جو قوائے درا کہ ہمارے سامنے ہیں، ان
میں سے کوئی قوت بھی ان اشیاء کا ادراک نہیں کر سکتی اس سے ظاہر ہو گیا کہ
نبی کو حسی، عقلی اور روحانی قوت کے علاوہ اور قوت دی گئی ہے اور وہ
خدا کی قوت ہے، اس قوت کے ذریعہ تمام علوم حاصل کرتا ہے۔

سوال:۔ نبی کو ملک سے زیادہ علم ہے یا کم؟

جواب:۔ زیادہ ہے اور یہ زیادتی مقدار کی نہیں، بلکہ نوعیت علم نبی
اور ہے اور نوعیت علم ملک اور ہے۔ نبی کو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت ہے
اور اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب ہو سکتا ہے کہ ملک اتنا قریب نہیں ہو سکتا۔

سوال:۔ مادی اور جسمانی علائق کے ساتھ کیونکر متصور ہو سکتا ہے کہ
غیر جسمانی اور غیر مادی کے مقابلہ میں شے جسمانی تقرب حاصل کر لے؟

جواب:۔ جسمانیت اور علائق مادی تقرب الہی کے منافی نہیں ہے، کیونکہ
جسمانیت خلق کی فرع ہے اور روحانیت امر کی فرع ہے اور خلق و امر دونوں کو
یکساں تقرب ہے اور روحانیت کے تقرب کا مسئلہ فلسفی کی زبان پر ہے، جو اب
تک ثابت نہ ہو سکا۔

سوال:۔ کوئی ایسا لحظہ بھی آتا ہے کہ نبی، ولی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ
سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے؟

جواب:- ہرگز نہیں، کوئی ایسا لحظہ نہیں ہوتا، جس میں ولی اللہ سے زیادہ قریب ہو نبی کے مقابلے میں، اس لئے ولی کے قرب کا سبب صرف نبی کا تتبع ہے، یعنی نبی ہی ولی کو خدا سے قریب کرتا ہے اور خدا تک پہنچاتا ہے، اگر نبی نہ ہو تو ولی، ولی ہی نہیں ہو سکتا۔ حاصل یہ ہے کہ نبی کے علاوہ جتنے بھی لوگ خدا سے قریب ہوتے ہیں، وہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو نبی کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ نبی جہاں پہنچا ہے، نبی کے بعد اور نبی کے پیچھے یہ بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

سوال:- جب نبی کے پیچھے وہاں پہنچ جاتے ہیں اور لفظ "وہاں" کے معنی دونوں کے لئے مشترک ہیں، اس لئے یہ وہم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

جواب:- تقرب کے مدارج لامتناہی ہیں، ادائی مدارج تقرب میں نبی ان کو چھوڑ دیتا ہے، پھر لامتناہی مقام تقرب کو نبی طے کر کے اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ولی کے خدا تعالےٰ تک پہنچنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ولی ان حدود میں آجاتا ہے، جو خدا تعالےٰ کا تقرب کہلاتی ہیں اور نبی کے خدا تعالےٰ تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف تقرب خدا تک نہیں پہنچتا بلکہ ان تقربات کو عبور کر کے خدا تک پہنچتا ہے، حاصل یہ ہے کہ ولی تقرب کی حد تک پہنچتا ہے اور نبی اللہ تعالےٰ تک پہنچتا ہے۔ وہ صرف تقریب خدا تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ ان تقربات اور نبی اللہ تعالےٰ تک پہنچتا ہے۔

ولایت اور نبوت

یہ بحث بہت پرانی ہے۔ امام فخرالدین رازی نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کیا ہے۔ جب وہ نقل کر رہے ہیں تو ان کے زمانے سے پہلے ہی کی ہونی چاہئے۔ فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں عبودیت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور حضرات صوفیائے کرام رحمہم اللہ اجمعین ولایت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ نبی کی ولایت نبوت سے افضل ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔

پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ ولایت کے معنی کیا ہیں؟ ولایت کیا چیز ہے؟ اور نبوت کیا شے ہے؟ ولایت کے ایک معنی وہ ہیں جو شرع میں مستعمل ہیں۔ ایک معنی وہ ہیں جو صوفیائے کرام کے یہاں مستعمل ہیں اور ایک معنیٰ وہ ہیں جو لغت میں ہیں۔

لغت میں ولایت قرب کے معنیٰ میں آیا ہے، مدد اور نصرت کے معنیٰ میں آیا ہے، ماویٰ اور ملجا کے معنیٰ میں آیا ہے۔

اولیاء کسے کہتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ الا المتقون متقی اولیاء اللہ ہیں۔ شرعی اور قرآن کی زبان میں تو متقی ولی ہے۔ اب متقی کون ہے۔

الذین یومنون بالغیب' ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنا ھم ینفقون ۔ متقی وہ ہے جس میں یہ تین خصلتیں ہوں (۱) ایمان بالغیب ہو۔ ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ جو شے حاسے سے غائب ہو۔اس پر ایمان لائے۔ جیسے ملائکہ۔جنت ۔ دوزخ ۔خدا اور اس کی صفات وغیرہ وغیرہ۔مفسرین اور اہلِ علم یہی بیان کرتے ہیں۔میں نے یہ بات نکالی ہے کہ ان کا غیب پر ایمان ایسا ہے۔ کما یومنون بالشھادۃ ۔جیسے کہ شہادت پر ایمان ہے جس طرح آپ کو یقین ہے کہ ایک انگلی ایک ہی ہے ۔ایک انگلی دو انگلی نہیں ہیں۔اسی طرح خدا پر ایمان ہو کہ ایک ہی ہے ۔ خدا دو نہیں ہیں (۲) نماز قائم کرتے ہیں (۳) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے ۔اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ مارزقنا ھم نہیں ہے بلکہ مما رزقنا ھم ہے۔یعنی جو دیا ہے وہ نہیں بلکہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اگر دو تین وقت کے فاقہ پر ایک روٹی ملی تو اس میں سے بھی ایک ٹکڑا خرچ کر دیتے ہیں۔اگر ایک روپلے کی ضرورت ہے ۔اور ان کو ملے دو آنے تو اس میں سے بھی خرچ کر دیتے ہیں۔ یہ تو اہل دین کی حالت بتا رہا ہے ۔ اہل دنیا کی یہ حالت تھی اس زمانے میں' ابو نصر فارابی بہت بڑا حکیم گذرا ہے مسلمانوں میں اس سے زیادہ بڑا کوئی حکیم نہیں ہے ۔ وہ پھٹے حال رہا کرتا تھا ۔ وہ ایک روز ایک حلوائی کی دکان پر گیا اور ایک مٹھائی کو دیکھ کر اس سے پوچھا یہ مٹھائی کیسی ہے ۔اس نے ان کا فقیرانہ حلیہ دیکھ کر مٹھائی کے دام زیادہ بتا دیئے کہ یہ کیا خریدے گا۔لیکن انھوں نے اس کو دکان سے کھینچا اور بہت مارا یہاں

تک کہ لوگ جمع ہو گئے اور پولیس والے ان کو پکڑ کر حاکم وقت کے پاس لے گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس کو کیوں مارا تو انھوں نے یہ کہا کہ یہ اتنا جاہل آدمی ہے کہ میں نے مٹھائی کی ماہیت دریافت کی تھی اور اس نے جواب میں کیفیت بتائی اس جہالت پر میں نے اس کو مارا۔ حاکم وقت نے ٹال ٹول دیا کہ یہ بھلا آپ کی بات کا جواب کہاں دے سکتا ہے۔ اور سمجھا بجھا دیا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں گئے اور اس سے پوچھا میں کہاں بیٹھوں۔ بادشاہ نے کہا جہاں آپ کا منصب ہے وہاں بیٹھ جائیے۔ یعنی جہاں اور حکماء بیٹھے ہیں ان کی صف میں بیٹھ جائیے۔ مگر یہ بادشاہ کی گردن پر جا کر بیٹھ گئے کہ میرا منصب یہ ہے کہ میں یہاں بیٹھوں۔ اس کی حالت یہ تھی کہ تین درہم روزانہ کماتا تھا ایک اپنے اہل کو دیتا ایک والدین کو اور ایک درہم خیرات کرتا تھا۔ یہ تو حال تھا دنیادارِ کا تو دین دار لوگ جو اس زمانے میں تھے۔ ان کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔ حکماء کا شمار دین داروں میں نہیں ہوتا۔ اگلے مسلمانوں میں یہ بات عام تھی کہ جو کچھ کماتے ہیں اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔

تو متقی کی تین خصوصیات ہیں (۱) ایمان بالغیب (۲) اقامت صلوٰۃ اور (۳) انفاق فی الرزق۔ اور جو متقی ہے وہ ولی ہے۔ تو شرع میں ہمارے یہاں تو ولی کے یہ معنی ہیں۔

اب نبی کسے کہتے ہیں۔ نبی وہ انسان ہے۔ جس سے خدا خطاب کرے اب وہ انسان بچہ ہو جوان ہو بوڑھا ہو مرد ہو یا عورت ہو۔ اللہ تعالیٰ جس بشر سے خطاب کرے وہ نبی اور یہ خطاب نبوت ہے۔ وما کان لبشر الا ان یکلمہ اللہ۔ اللہ

کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے بات چیت کرے الا وحیؑ اور اگر بات کرتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ وحی کرتا ہے۔ وحی اس اشارہ کو کہتے ہیں جو دل میں ڈالا جائے اور اس طرح ڈالا جائے کہ اس کے خلاف معارضہ نہ ہو سکے۔ یعنی پختہ یقین ہو کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ الہام میں یہ شبہ رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ اللہ کی طرف سے ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہو۔ الہام دونوں طریقوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ فالھمھا فجورھا وتقویٰ اللہ نے نفس کو الہام کیا فجور بھی اور تقویٰ بھی اور وحی جو ہوتی ہے وہ فجور کی نہیں ہوتی تقویٰ ہی کی ہوتی ہے۔ تو وحی تقویٰ منجانب اللہ ہوتی ہے اور فجور بواسطہ شیطان الہام ہوتا ہے۔ اس لئے وہ وسوسہ شیطانی ہے۔ اللہ تعالیٰ فجور براہ راست دل میں نہیں ڈالتا بلکہ شیطان دل میں ڈالتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ براہ راست فجور دل میں ڈالتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تو بچاؤ کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ وحی اتنی قوی ہوتی ہے کہ حسیات میں جو یقین ہوتا ہے۔ اس سے بھی قوی وحی کا یقین ہوتا ہے۔ ادھر سو پچاس سال کے علماء اس کو نہیں سمجھے واوحینا الی ام موسیٰ ہم نے موسیٰؑ کی ماں کو وحی کی کہ تو اس کو دودھ پلا اگر تجھے ڈر قتل کا ہو تو اس کو دریا میں ڈال دینا۔ سب مفسرین اور علماء اس دھوکہ میں رہے کہ یہ الہام تھا۔ کیونکہ اگر اس کو وحی کہتے ہیں تو عورت کے لئے نبوت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے ان کا کیا ہرج ہے۔ اگر عورت نبی ہو جائے۔ اس بناء پر وحی ام موسیٰؑ کو انھوں نے الہام بتایا۔ اگر عورت کو نبوت سے خارج کر دیا جائے تو نصف انسانیت کمال سے

محروم ہوجاتی ہے۔ یہ بات طبیعت کے بھی خلاف ہے۔ اور عقل کے بھی خلاف ہے اللہ کے نزدیک مرد عورت دونوں کی حیثیت ایک ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر عورت سے مرد کے اعمال اچھے ہیں تو عورت سے مرد اچھا ہے اور اگر عورت کے اعمال مرد سے اچھے ہیں تو عورت مرد سے بہتر ہے۔ اب میں ایک بڑی اچھی بات بتاتا ہوں۔ اس سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا انشاءاللہ۔ جس وقت موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے دریا میں ڈالا تو اس وقت یہ خوف تھا کہ وہ ان کو قتل کر دے گا۔ فرعون کو ان کی پیدائش کا علم ہونا اس میں کچھ وقت لگتا۔ پھر وہاں سے پولیس اور فوج کے آنے میں وقت لگتا۔ پھر آنے کے بعد یقین نہیں تھا کہ بچے کو قتل کر دیتے ممکن تھا کہ کسی کو رحم آجاتا اور وہ چھوڑ دیتا قتل نہ کرتا۔ تو امکان بچنے کے بہت تھے۔ مگر دریا میں ڈالنے کے بعد تو قطعی موت تھی۔ مگر ان کو اس بات کا یقین تھا کہ دریا میں ڈالنے میں نجات ہے۔ اگر الہام ہوتا تو ظن ہوتا یقین نہ ہوتا اور ڈوبنے میں موت یقینی تھی تو لازماً یہ ایسی بات تھی جو یقین کے مقابلہ میں بھی اتنی زیادہ قوی تھی کہ یقینی شے کے خلاف پر آمادہ ہوگئیں۔ ایسی چیز صرف وحی ہو سکتی ہے۔ الہام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ الہام میں تو تردد ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے ہو ممکن ہے نہ ہو۔ اردو میں بھی جو تفسیریں آج کل لکھی جا رہی ہیں ان میں بھی الہام بتایا ہے سب غلط ہے۔ یہ وحی تھی۔ اللہ جس پر وحی کرے وہ نبی۔ کیا بگڑتا ہے اگر عورت نبی ہو جائے۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی۔ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ بشریت دونوں میں مشترک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی

ہے۔ توجو فرق ہے وہی بوت ہے۔ اور فرق ہے 'وحی' تو وحی نبوت ہے۔ اور وحی کیا چیز ہے (۱) بغیر الفاظ کے دل میں بات ڈال دینا اس طرح کہ اسے یقین ہو کہ یہ فعل ڈالنے والے ہی کا ہے اور کسی کا نہیں ہے۔

(۲) او من ورائ حجاب، یا پس پردہ۔ پس پردہ کا یہ مطلب ہے کہ آواز آتی ہے۔ بولنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلام سنا کرتے تھے۔ اور ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہ اللہ ہی کی آواز ہے اور کسی کی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فاستمع لما یوحیٰ الی اے موسیٰؑ سن جو وحی ہو رہی ہے۔ تو آواز جو آرہی تھی۔ اللہ نے اس کا نام وحی رکھا اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ (۳) او یرسل رسولاً فیوحیٰ باذنہ مایشاء یا وہ ایک رسول بھیجتا ہے جو اس کے اذن سے اجازت سے مشیت سے دل میں وحی ڈال دیتا ہے۔ یہی تین طریقے ہیں اللہ کے بندہ سے بات کرنے کے۔ اور اس کلام کرنے کا نام نبوت ہے۔ اور جس سے کلام ہو رہا ہے۔ اسی کا نام نبی ہے۔ یہ معنی ہیں۔ نبوت کے۔

اب آپ دیکھیں کہ اللہ بشر سے خطاب کرتا ہے۔ اس کا آپ تجزیہ کریں تو اس میں کہیں ولایت کا جز نہیں ہے۔ ولایت کے وہی معنی لے لیں جو صوفیائے کرام کے یہاں ہیں یعنی تقرب الہٰی۔ یہاں بندہ کا تقرب خدا سے نہیں ہے۔ بلکہ خدا کا تقرب بندہ سے ہو رہا ہے۔ خدا کہہ رہا ہے یا عیسیٰؑ یا موسیٰؑ۔ بندہ خدا کی طرف نہیں جا رہا ہے بلکہ خدا بندہ کی طرف آرہا ہے۔ نبوت کیا ہے۔ خدا کا بندہ کی طرف متوجہ ہونا بایں خطاب کہ یا فلاں۔ ولی کہتا ہے یا اللہ اور اللہ کہتا ہے یا ایہا النبیؐ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ولی اللہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس سڑک کو کتنا بھی بڑھائیں

یہ نبوت کی سڑک ہے جس سے اللہ بندہ کی طرف آرہا ہے۔ کبھی نہیں ملے گی۔ دونوں
لائینیں الگ الگ ہیں۔ یہ اِدھر سے چلتی ہے وہ اُدھر سے چلتی ہے۔ یہ ایک دوسرے
کی مقابل چیزیں ہیں۔ ایک دوسرے کی شریک ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے نبی گھٹتے
گھٹتے کبھی ولی نہیں بنے گا۔ اور نہ ولی بڑھتے بڑھتے کبھی نبی بن سکتا ہے۔ وہاں نبوت
اور ولایت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نبی ولی ہوتا ہی نہیں جو معنی ولی کے مشہور ہیں۔
اس معنی میں نبی یا رسول کبھی ولی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولی تو اس کا نام ہے جو نبی کا تابع
ہو۔ نبی اصلی روشنی ہے، اور ولی اس کا ظل ہے۔ مثال سے بات سمجھ میں آئے گی۔ اصلی
روشنی سورج کی ہے اور وہ دھوپ ہے۔ سایہ جہاں دھوپ نہیں ہے روشنی وہاں
بھی ہے۔ دھوپ میں بھی سب چیز نظر آتی ہے۔ اسی طرح چھاؤں میں بھی سب چیز نظر
آتی ہے اور یہ سایہ جو ہے وہ سورج کی روشنی کا ظل اور اس کے تابع ہے۔ ولی اس
کو کہتے ہیں جو تابع نبی ہو اور جو تابع نبی نہیں ہے وہ شیطان ہے۔ ولی نبی کا جزء
نہیں ہے، ظل ہے، پرتو ہے۔ غور کرو اللہ توفیق دے۔ یہ مجھے خدا نے بتایا ہے
مجھ سے پہلے یہ کوئی نہیں بیان کر سکا۔ ظل اپنے مرتبہ میں کتنی بھی بڑھ جائے وہ دھوپ
کے برابر روشن نہیں ہو سکتی۔ دھوپ نبی کی روشنی ہے۔ اور ظل نبی کا پرتو ہے، سایہ ہے۔
صدیقیت ہے۔ بڑے سے بڑا ولی صدیق کہلاتا ہے۔ صدیقیت کیا ہے۔ یہ چھاؤں
چلتے چلتے جہاں ختم ہوتی ہے۔ اور وہ خط روشنی کا جہاں کھینچتا ہے۔ وہ ظل کا
زیادہ سے زیادہ روشن خط ہے وہ صدیقیت ہے۔ صدیقیت نبوت کا جزء ہو ہی
نہیں سکتی۔ نبوت نام ہے اصلی نور کا۔ ولایت نام ہے ظلی نور کا۔ ظلی نور وہاں ہو
ہی نہیں سکتا۔ بہت بڑھیا بات ہے۔ بہت عجیب بات ہے۔ نور جاتے ہی یہ چھاؤں بھی

ختم ہو جائے گی۔ یہ اسی نور کی برکت ہے کہ یہ روشنی ہے تو جتنے بھی صدیق اور اولیاء ہیں۔ یہ نبی ہی کی برکت ہے۔ اسی کے نور کا ظل ہیں۔ تو یہ چھاؤں جتنا نور کے قریب ہوگی۔ اتنی ہی روشن ہوگی۔ اور جوں جوں بعد ہوتا جائے گا۔ چھاؤں کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ تو یہ سب مدارج ولایت ہیں۔ یہ ترقی کرتے کرتے اصل نور کے قریب تک ہی تو پہنچے گی نا۔ اب اس کا آخری حصہ اور نور کا پہلا حصہ دونوں کو دیکھ لیجئے۔ بین فرق ہے دونوں میں۔ تو مقدمین حضرات اللہ ان کی مغفرت کرے انھوں نے جو یہ کہا ہے کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے غلط ہے۔ اللہ ان کو بھی توفیق دے اور نیکی دے اور مجھے بھی۔ بات یہ ہے جو میں نے بیان کی۔

اب رہ گیا ان کی دلیل کا جواب وہ میں بتاؤں۔ یہ ایک دلیل تھی، انھوں نے اور بہت سی دلیلیں بیان کی ہیں سب غلط ہیں۔ آپ غور کریں۔ نبوت سے پہلے نبی کیا چیز ہے۔ زیادہ سے زیادہ ولی کہو گے۔ اب آپ غور کریں کہ کیا وہ زمانہ نبوت کے زمانے سے افضل ہے وللآخرة خیر لك من الاولیٰ آخر نبوت ہے اولی ولایت ہے۔ تو نبوت ولایت سے بہتر ہوئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس وقت خالی ولایت ہے۔ اور اس وقت نبوت بھی ہے۔ اور ولایت بھی ہے اور دونوں مل کر بہت بڑے ہوگئے اور نبوت سے افضل ہوگئے۔ یہ فلسفی دھوکہ ہے اور جو عقلی قواعد سے واقف نہیں ہیں وہ ایسے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ غور کرو ایک شے اصلی ہے اور ایک شے نقلی ہے۔ اب اصلی میں اگر نقلی کو ملا دیں گے۔ تو یہ اصلی اور نقلی کا مجموعہ اصلی سے ہمیشہ گھٹیا رہے گا۔ اگر ولایت کو افضل مان لیا جائے تو نبوت کو گھٹیا فرض کر لیا جائے تو ولایت اور نبوت کا مجموعہ ولایت سے افضل نہیں ہوا بلکہ ولایت

سے گھٹ گیا جس طرح چاندی اور سونے کا مجموعہ نرے سونے سے گھٹیا ہے۔ ان کی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ رسالت اور نبوت میں بندہ کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اور ولایت میں خدا کی طرف۔ تو خدا کی طرف توجہ ہونا یہ افضل ہے بندہ کی طرف توجہ ہونے سے۔ توجہ الی الخالق افضل ہے توجہ الی المخلوق سے۔ ولی توجہ الی الخالق کرتا ہے اور رسالت توجہ الی المخلوق ہے۔ الجبرا میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ مشترک مقداروں کو دونوں طرف سے گھٹا دینے سے نتیجہ نکل آتا ہے۔ یہاں "توجہ الی" دونوں طرف مشترک ہے۔ اس کو اگر دونوں سے گھٹا دیا جائے تو خالق اور مخلوق رہ جاتے ہیں۔ اب خالق مخلوق سے افضل ہے لہٰذا توجہ الی خالق توجہ الی المخلوق سے افضل ہے۔ لہٰذا ولایت نبوت سے افضل ہے۔ استدلال کرنا بھی تو نہیں آتا۔ حدودِ کلام سے پوری واقفیت نہیں ہے۔ کتابوں سے دیکھ کر اگر لکھے گا تو کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ خود واقفیت ہو۔ پھر اس کا استعمال بھی آتا ہو۔ اگر حساب کے دو تین سوال یاد کر لئے تو کب تک چلے گا۔ کچھ دور جا کر اٹک جائے گا۔ اور جو قوانین سے واقف ہے سوال حل کر دے گا چاہے پڑھا ہو چاہے نہ پڑھا ہو۔ یہ غلطی اس واسطے ہوئی کہ استادوں کی باتوں کو یاد کرتے تھے میں اس کو بُرا نہیں کہتا بلکہ قانون سے واقفیت نہیں تھی۔ واقف نہیں ہو گا تو سو میں اٹھانوے غلطی کرے گا مذہب کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ مذہب کے معاملے میں تو بولتا ہی نہیں۔ یہاں گفتگو علمی ہے۔ قانون عقل کو استعمال کرنے میں غلطی کی ہے۔ سب حکیموں نے۔ یہ جو معمولی لوگ ہیں یہ تو کوئی چیز ہی نہیں ہیں۔ ایسی ضابطہ کی غلطی ہوتی ہے۔ توجہ جو ہے خالق کی طرف وہ کیا ہے۔ نبوت تو معلوم ہو گیا کیا ہے یا ایہا النبی انذر مسل

(۱) اے نبی نماز پڑھ پہلا حکم ہوا (۲) دوسرا حکم ہوا کہ ان کو نماز پڑھوا۔ حیرت انگیز اور غور کرنے کی بات ہے ولی مکلف ہے تنہا نماز پڑھنے کا اور نبی مکلف ہے۔ خود نماز پڑھنے کا اور سب کو نماز پڑھوانے کا۔ وہ سب ایک ہی چیز ہے۔ تو نماز پڑھ۔ یہ تو نبی کی ولایت ہو گئی اور تو نماز پڑھوا۔ یہ نبی کی رسالت ہو گئی۔ جس طرح نبی نماز پڑھنے میں خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ان کو نماز پڑھوانے میں خدا کو دیکھ رہا ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ نبی سے کہا تو تنہا نہ آ ان سب کو ساتھ لے کر آ۔ وہ تو دونوں صورتوں میں خدا ہی کو دیکھ رہا ہے وہ خلق کی طرف کیسے دیکھ سکتا ہے۔ رسالت کے لفظ سے دھوکہ ہو گیا نبی کی ولایت اور رسالت ایک ہی چیز ہے۔ ولایت کے معنی قربت کے ہیں نا تو کہا تو قریب آ اور ان کو بھی اپنے ساتھ قریب لے کر آ۔ ایک ہی چیز ہے۔ کیا فرق ہے۔ وہاں ایک ہی شے ہے دو چیزیں نہیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عصمت انبیا علیہم السلام

مومنین انبیا علیہم السلام کی ۲ جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت عصمت انبیاء کی قائل ہے۔ دوسری جماعت غیر معصوم ہونے کی قائل ہے۔ جو لوگ معصیت انبیاء کے قائل ہیں۔ ان میں سے بعض معصیت کبیرہ کے قائل ہیں۔ بعض معصیت صغیرہ کے، بعض کے نزدیک چونکہ معصیت کفر ہے۔ اس لئے یہ بعض کفر تک کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک تقیۃً کفر جائز ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ یہ معصیت انبیاء سے نبوۃ سے قبل ہو سکتی ہے یا نبوۃ کے بعد جو لوگ عصمت انبیاء کے قائل ہیں وہ قائلین غیر معصومیت کے دلائل سے متاثر ہو کر معصیت کو ترک اولیٰ پر محمول کرتے ہیں اور ان میں سے بعض نسیان پر محمول کرتے ہیں اور بعض معصیت کو قبل النبوۃ پر محمول کرتے ہیں یعنی انبیاء علیہم السلام سے نبوت سے قبل معصیت صادر ہو سکتی ہے۔ اعتقاد و تبلیغ اور فتوی میں سب متفق ہیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ یہ اختلاف یعنی عصمت اور غیر معصومی زیادہ سیرت اور افعال میں بیان کی گئی ہے۔ ان تمام حضرات قدسیہ میں سب سے مقدس وہ حضرات ہیں جو اپنے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہ کفر منسوب کرتے ہیں اور نہ کبیرہ نہ صغیرہ بلکہ ترک اولیٰ منسوب کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک نبی ترک اولیٰ فعل کر سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ نبی کی طرف ترک اولیٰ کی بھی نسبت کرنی کفر ہے۔ کیونکہ اگر نبی بھی ترک

اولیٰ فعل کرے گا۔ تو اب کون اولیٰ فعل کریگا اور اولیٰ فعل کا وقوع صفحۂ ہستی سے
مٹ جائے گا۔ کیونکہ تمام لوگ نبی ہی کے قدم بقدم چل سکتے ہیں۔ اور جب
نبی تارک اولیٰ ہوگیا تو اولیٰ کا نمونہ ہی نہ رہا تاکہ لوگ اس کا تتبع کریں اور اس
وقت عالم خیر اور اولیٰ فعل سے خالی ہو جائے گا میں کہتا ہوں کہ نبی نہ تارک
اولیٰ ہے۔ نہ مرتکب معصیت ہے۔ خواہ وہ معصیت صغیرہ ہو خواہ کبیرہ ہو، نہ
قبل النبوۃ نہ بعد النبوۃ۔ غرضیکہ نبی ہر وقت معصوم ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے
میں کہتا ہوں کہ نبی مخاطب رب العالمین ہے۔ اور مخاطب رب العالمین معصوم
ہے، نتیجہ نبی معصوم ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ نبی مخاطب رب العالمین ہے
یہ ہے کہ نبی اس بشر کو کہتے ہیں کہ جس بشر سے اللہ تعالےٰ خطاب کرے اور کلام
کرے اور کلام اور خطاب کرنے کے تین طریقہ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا ما کان
لبشرٍ ان یکلمہ اللّٰہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء
بشر سے اللہ تعالےٰ کے کلام کرنے کے صرف تین ہی طریقے ہیں۔ یا وحی سے یا پس پردہ
یا ایک رسول (فرشتہ) کو اللہ تعالےٰ بھیجتا ہے۔ وہ فرشتہ بحکم الٰہی اللہ کی مشیت کے
مطابق اس بشر کو وحی کر دیتا ہے اور یہ تینوں طریقے وحی ہی ہیں۔ الا وحیا میں وحی
صاف ہے اور من وراء حجاب جیسے حضرت موسےٰ سے پس پردہ کلام ہوا۔ یہ بھی
وحی فاستمع لما یوحی۔ اے موسیٰ جو وحی ہو رہی ہے اسے سن اور فیوحی میں بھی وحی
ظاہر ہے۔ الغرض اللہ تعالےٰ جس بشر اور جس انسان پر وحی کرے۔ بس وہ بشر
اور وہ انسان نبی ہے اور وہی مخاطب رب العالمین ہے۔ لہٰذا اس بیان سے
ظاہر ہو گیا کہ نبی مخاطب رب العالمین ہے۔ اب دوسری بات کہ مخاطب

رب العالمین معصوم ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مخاطب حقیقی وہ ہے جو خطاب سنے کیونکہ منشاء خطاب مقصد تکلم سامع کا سننا ہی ہے اور یہ سننا ہی معصوم ہونا ہے کیونکہ نہ سننا ہی غیر معصوم اور نافرمان ہونا ہے۔ لہذا خطاب کو عصمت معصومی لازم ہے۔ لہذا جو مخاطب ہے وہ قطعاً اس خطاب کو سنتا ہے اور خطاب کا سننا ہی فرمانبرداری اور عصمت ہے اور نہ سننا نافرمانی اور غیر معصومی ہے اور خدا کی نافرمانی محال ہے یعنی خدا کے براہ راست فرمان کے بعد نافرمانی محال ہے اور مخاطب فرمانبرداری پر مجبور رہے۔ شبہ ۱ مگر شیطان نے سنا اور عمل پر مجبور نہیں ہوا۔؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خطاب براہ راست نہیں تھا۔ فرشتوں کے واسطے سے تھا۔ جیسے ہمیں نبی کے واسطے سے ہے اور اذ امرتک کا مطلب ہے اذا امرتک بالواسطۃ الملائکۃ جس طرح ہماری طرف خطاب ہے وما امروا الا لیعبدوا اللہ اور نبی کے واسطے سے ہے شیطان کو اگر براہ راست امر ہوتا تو اس کی بھی مجال نہ ہوتی کہ سجدہ نہ کرتا۔ اس میں یہی بھید ہے کہ براہ راست خطاب نہیں تھا جب ہی تو وہ جلا۔ اور واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا کہا۔ ورنہ یہ کہتا کہ واذ قلنا للملائکۃ والابلیس اسجدوا۔ کیونکہ فرشتہ اور شیطان ایک جماعت نہیں تھے۔ شبہ ۲ انبیا کو بھی امر ملائکہ کے واسطے سے ہوتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ یہ سفارت ہے۔ اصل حکم وہ ہوتا ہے۔ جو نبی کے قلب پر نازل ہوتا ہے۔ فرمایا فلا تعجل بالقران من قبل ان یقضیٰ الیک وحیہ۔ قرآن میں جو ملک جبریل کے ذریعہ وحی ہوا ہے۔ اس میں جلدی مت کرنا (کیونکہ اس کے واسطے سے ہوا ہے۔ اصل بات وہ ہے جو میرے اور تیرے درمیان ہے) جب تک تیرے

اوپر پوری پوری وحی نہ آجائے۔ اور وہ وحی وہ ہوگی جو ملک کے واسطے سے نہ ہوگی۔ ملائکہ معلم نہیں ہیں۔ علمائے سالم تک تعلیم خدا براہ راست معلم ہے ملائکہ کے ذریعے کچھ مضامین آئیں گے۔ باقی سب براہ راست خدا بتائے گا۔ یہ مضامین کچھ احادیث میں کچھ شریعت میں ہیں۔ جنت دوزخ کے حالات نمازوں میں رکعتوں کی تعداد۔ حج کی تفصیلات۔ قیامت کے حالات اور ہزاروں باتیں یہ سب قرآن میں کہاں ہیں یہ سب نبی کو براہ راست وحی ہوئی ہیں۔ ہاں بیشک خدا کا حکم جو نبی کی معرفت قوم کو ہوتا ہے اس میں قوم مختار ہے چاہے حکم خداوندی کو سنے چاہے نہ سنے لیکن خدا کا حکم براہ راست جو مخاطب کو ہوتا ہے۔ محال ہے کہ مخاطب اس حکم کو نہ سنے یعنی اس خطاب کے ساتھ مخاطب نہ بنے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا انما امرہ اذا ارادشیأ ان یقول لہ کن فیکون۔ اس کے حکم کی حالت تو یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ 'ہو' پس وہ ہو جاتا ہے۔ بحکم مایرید یعنی نفس ارادہ حکم نافذ کرنے میں کافی ہے۔ بھید اس میں یہ ہے کہ نفس ارادہ حصول مراد میں کافی ہے۔ یعنی ارادے اور مراد میں مسافت نہیں ہے تاکہ مراد کے حصول میں دیر لگے لہٰذا جب بھی وہ کسی کو فرمان دے گا۔ اس کو فرمانبرداری کرنی ہی پڑے گی۔ اور جب وہ کسی کو خطاب کرے گا۔ اس کو مخاطب اور فرماں بردار اور معصوم یعنی غیر نافرماں بننا ہی پڑے گا۔ اور یہ غیر نافرمان بننا ہی معصوم بننا۔ اور غیر معصوم نہ بننا ہے۔ لہٰذا اس بیان سے واضح ہو گیا کہ مخاطب رب العالمین معصوم ہے اور جبکہ دونوں مقدمے ثابت ہو گئے یعنی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نبی مخاطب رب العالمین ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا

کہ مخاطب رب العالمین معصوم ہے۔ تو یہ استدلال شکل اول پر منطبق ہو کر صریح اور بدیہی نتیجہ کا موجب ہو گیا۔ یعنی نبی مخاطب رب العالمین ہے۔ اور ہر مخاطب رب العالمین معصوم اور فرمانبردار رب العالمین ہے۔ لہذا لازمی طور پر یہ نتیجہ نکل آیا کہ نبی معصوم اور فرمانبردار رب العالمین ہے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ نبی کو خدا کا خطاب براہ راست ہوتا ہے۔ مخاطب کو خطاب سننا لازم ہے۔ خطاب سننا ہی عصمت ہے۔ لہذا نبوت کو عصمت لازم ہے۔ نبی مخاطب ہے لہذا نبی معصوم ہے۔ ہر مخاطب معصوم ہے نبی مخاطب ہے۔ لہذا نبی معصوم ہے۔ نبی کی عصمت کی اس سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس دلیل کے ساتھ ہم منفرد ہیں۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس پر وحی ہو وہ نبی ہے تو چاہیئے کہ عورت بھی نبی ہو واوحینا الی ام موسیٰ۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی نازل کی اور شہد کی مکھی بھی نبی ہو۔ واوحی ربک الی النحل۔ تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی اور حواری عیسیٰ علیہ السلام بھی انبیاء ہوں واذا وحیت الی الحوارین اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے۔ رسول نہیں ہو سکتی۔ نبی اور رسول میں فرق ہے۔ اس کی تفصیل ہم دوسری جگہ مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اور ہم نے عقلی اور نقلی دلائل سے عورت کی نبوت ثابت کر دی ہے۔ ہاں بیشک رسول نہیں ہو سکتی۔ وما ارسلنا من قبلک الا رجالا ہم نے تجھ سے پہلے مرد ہی رسول بنا کر بھیجے ہیں اور یہ حق ہے کہ عورت رسول نہیں ہوتی لیکن نبی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اولئک الذین انعم اللہ علیہم من النبیین۔ یہ وہ حضرات ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں اور یہ کون ہیں یہ

انبیاء ہیں اور اولئک کے مشار الیہ میں حضرت مریم علیہا السلام شامل ہیں۔ اور ماکان لبشر کی قید سے غیر بشر خارج ہو گیا اور قولوا امنا باللہ وما انزل علینا کہو ہم اللہ پر اور جو ہم پر نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور فرمایا وما امروا الا لیعبدوا اللہ اور ظاہر ہے ہم پر جو نازل ہوا وہ ہمارے نبی کے واسطے سے نازل ہوا۔ اسی طرح جو وحی حواریوں پر ہوئی اور وہ یہ تھی "ان امنوا بی وبرسولی" مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے ہوئی تھی جس طرح ہم پر انزال ہمارے نبی کے واسطے سے ہوا اور جس طرح ہم پر قرآن کا نازل ہونا ہماری نبوت کو نہیں چاہتا اسی طرح حواریوں پر وحی ہونا ان کی نبوت کو نہیں چاہتا۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ولو علم اللہ فیہم خیرا لاسمعہم ولو اسمعہم لتولوا وہم معرضون ؁ اور اگر اللہ تعالےٰ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سنا دیتا اور اگر وہ ان کو سنا دیتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے۔ اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ سنائے اور وہ نہ سنیں اور تم نے اوپر یہ بیان کیا کہ اللہ جسے سنائے وہ قطعاً سنے۔ اس کا کیا حل ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مفسرین نے لتولوا وہم معرضون کے معنی نہ سننے کے لئے ہیں اس وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے اور لتولوا وہم معرضون کے معنی نہ سننے کے لئے غلط ہیں۔ کیونکہ اگر آیت شریفہ کے یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ تعالےٰ ان کو سنائے اور وہ نہ سنیں تو ایک تو یہ خرابی لازم آئے گی کہ اللہ تعالےٰ عاجز ہو جائے۔ دوسرا تناقض لازم آئے گا۔ کیونکہ یہ آیت شکل اول پر منطبق ہے یعنی اگر اللہ تعالےٰ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سنا دیتا۔ اگر ان کو سنا دیتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر اللہ تعالےٰ ان میں بھلائی

جاننا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے. حالانکہ علم بالخیر کو رشد و ہدایت لازم تھی اور اس وقت صریح تناقص لازم آیا. نیز لو کے معنی یعنی اگر کے معنی باطل ہو گئے یعنی اگر ان کو سناتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے یعنی ان کو نہیں سنایا اور وہ منہ پھیر کر نہیں بھاگے یہی معنی لو کے اور اگر کے ہیں. لہذا لو کے معنی کا باطل ہونا اور تناقص کا لازم ہونا اور خدا کا عاجز ہونا. اس تفسیر پر لازمی ہے. لہذا یہ تفسیر غلط ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اگر ان کو سنا دیتا تو وہ قطعی سنتے اور کفر و ضلالت سے منہ پھیر کر بھاگ جاتے اور اس وقت نہ عجز باری تعالےٰ لازم آتا نہ تناقص نہ لو کے معنی کا باطل ہونا لہذا ثابت ہو گیا کہ اللہ جس کو سنائے وہ قطعاً سننے پر مجبور ہے. نافرمانی نہیں کر سکتا. غور کر یہ غور کا مقام ہے. لہذا بحمد اللہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ نبی کا معصوم ہونا واجب اور ضروری ہے یعنی عصمت اور نبوۃ ایک ہی چیز ہے. تنبیہ یہاں یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ ہر عصمت طہارت ہے اور ہر طہارت عصمت نہیں ہے. کیونکہ طہارت نجاست کے بعد بھی ہوتی ہے اور عصمت مسبوق بالنجاست نہیں ہے. یعنی ہر نبی صدیق ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صدیق نبی ہو. لہذا رؤساء صدیقین اور امہات المومنین اور اہلبیت پاک صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین. یہ تمام حضرات مطہر ہیں، معصوم نہیں. معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہیں اور آیت تطہیر اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے. اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا براہ راست خطاب خطاب تکوینی ہے. اور خطاب تکوینی میں مخاطب اسی خطاب کے ساتھ مکون اور متحقق ہوتا ہے. اور اس بیان سے اصحاب نجمت

واتفاق کا شبہ بھی دور ہوگیا یعنی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اتفاق سے اور خوش
قسمتی سے عالم حادث ہوا ہے کوئی محدث اور موجد نہیں ہے۔ کیونکہ اگر محدث
عالم کو حادث کرے گا تو وجود عالم کے وقت حادث کرے گا یا عدم عالم کے
وقت حادث کرے گا۔ اگر وجود کے وقت حادث کرے گا تو وجود تھا ہی حادث
کیا ؟ کیا اس کو تحصیل حاصل کہتے ہیں اور تحصیل حاصل محال ہے اور اگر عدم عالم
کے وقت ایجاد کیا اور ایجاد کو وجود لازم ہے تو وجود عالم عدم عالم ایک وقت
ہوگیا اور عدم کے وقت وجود کا ہونا اجتماع النقیضین ہے جو محال ہے لہذا
ایجاد نہ وجود کے وقت ہو سکتا ہے نہ عدم کے وقت ہو سکتا ہے۔ لہذا وجود عالم بے
ایجاد بے احداث بے موجد بے محدث ہے اور حل اس شبہ عامۃ الورود کا یہ ہے
کہ ایجاد وجود عالم کے وقت ہے اور تحصیل حاصل لازم نہیں آتی کیونکہ وجود اسی
ایجاد کا اثر ہے اور اس حل کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود عالم ایجاد عالم
سے نہ مقدم ہے تاکہ تحصیل حاصل لازم آئے۔ نہ وجود ایجاد سے
موخر ہے تاکہ اجتماع النقیضین لازم آئے۔ بلکہ ساتھ ساتھ ہے۔ جیسے کنجی کی حرکت
ہاتھ کی حرکت سے نہ مقدم ہے نہ موخر ہے۔ دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔ شبہ میں
مستدل نے ایک شق حذف کر دی تھی۔ اس وجہ سے تحصیل حاصل اور اجتماع النقیضین
لازم آتا تھا۔ اور واقعہ یہ تھا کہ یہاں تین شقین تھیں یعنی وجود عالم ایجاد عالم سے یا
مقدم ہے یا موخر ہے یا ساتھ ساتھ ہے۔ قدماء فلاسفہ نے غلطی سے تیسری شق چھوڑ
دی۔ جس کی وجہ سے اس ظلمانی شبہ میں پڑ گئے اور یہی تقریر بعینہ کن فیکون میں جاری
ہوتی ہے کہ خطاب کن موجود کی طرف ہے یا معدوم کی طرف۔ اگر موجود کی طرف ہے تو تحصیل

حاصل اور اگر معدوم کی طرف ہے تو خطاب ناجائز اور حل یہی ہے کہ خطاب موجود کی طرف ہے اور اس موجود کا موجود ہونا۔ اسی خطاب سے ہوا ہے اس موجود کا موجود نہ خطاب سے مقدم ہے نہ خطاب سے موخر ہے تاکہ تحصیل حاصل اور معدوم کے مخاطب ہونے کا ناجائز ہونا لازم آئے غور کرو یہ مغالطہ ہر جگہ جاری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی چیز کو تو کاٹے اور وہ کٹ جائے پھر تو یہ کہے کہ یہ نہیں کاٹی گئی کیونکہ کاٹنا یا کٹنے کے وقت ہے یا نہ کٹنے کے وقت اگر کٹنے کے وقت ہے تو تحصیل حاصل ہے اگر نہ کٹنے کے وقت ہے تو اجتماع النقیضین ہے یا جیسے جلانا یا جلنے کے وقت یا نہ جلنے کے وقت دونوں صورتوں میں تحصیل حاصل اور اجتماع النقیضین لازم کرکے جلانے کی نفی کی جائے بس حل یہ ہے کہ کاٹنا اور جلانا کٹنے اور جلنے کے وقت ہے اور کٹنا اور جلنا کاٹنے اور جلانے سے ہی ہوا ہے۔ کٹنا اور جلنا کاٹنے اور جلانے سے نہ مقدم ہے۔ نہ موخر۔ تاکہ یہ دونوں خرابیاں لازم آئیں اور بالکل اسی طرح منطقیوں نے ایک اور مغالطہ عامۃ الورود وضع کیا ہے کہ جس سے ہر مدعا ثابت کیا جاتا ہے۔ یعنی مشہور ہے کہ منطقی جو چاہے ثابت کرے وہ اسی مغالطہ سے ثابت کیا کرتے ہیں اور اس کی تقریر یہ ہے کہ مدعا ثابت ہے۔ یعنی جو چاہے انسان مدعا فرض کرلے اور اس کو کہے کہ یہ ثابت ہے اور حق ہے۔ مدعا ثابت ہے اگر مدعا ثابت نہ ہوگا تو اس کی نقیض ثابت ہوگی اور جب نقیض ثابت ہوگی تو کوئی شے ثابت ہوگی نتیجہ ان دونوں مقدموں سے یہ نکلا کہ اگر مدعا ثابت نہ ہوگا تو کوئی شے ثابت ہوگی۔ اب اس کا عکس نقیض لیا اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شے ثابت نہ ہوگی تو مدعا ثابت ہوگا اور یہ بات بالکل صاف طور پر باطل ہے کہ جب کوئی شے ثابت نہ ہو تو مدعا کیسے ثابت ہوگا۔ لہذا یہ عکس نقیض باطل ہے اور جب

عکس نقیض باطل ہے تو اصل جس کا یہ عکس نقیض ہے وہ اصل بھی باطل ہوگی۔
کیونکہ عکس اصل کو لازم ہے اور لازم کے بطلان سے ملزوم یعنی اصل کا بطلان ظاہر
ہے تو یہ مقدمہ یعنی اگر مدعا ثابت نہ ہوگا تو کوئی شے ثابت ہوگی یہ باطل اور
غلط ہوا اور جب یہ مقدمہ جو نتیجہ قیاس ہے باطل ہوگیا تو قیاس کے دونوں
مقدمے یا کم سے کم ایک مقدمہ ضرور باطل ہوگیا اور قیاس کے یہ دو مقدمے ہیں
اگر مدعا ثابت نہ ہوگا۔ تو نقیض ثابت ہوگی اور جب نقیض ثابت ہوگی تو کوئی
شے ثابت ہوگی۔ تو یہ دوسرا مقدمہ تو ظاہر ہے کہ حق ہے لہذا پہلا مقدمہ یعنی اگر
مدعا ثابت نہ ہوگا تو نقیض ثابت ہوگی۔ یہ غلط ہے یعنی عدم ثبوت مدعا کی تقدیر
پر ثبوت نقیض مدعا باطل ہے۔ تو عدم ثبوت مدعا کی تقدیر پر قطعاً ثبوت مدعا
حق ہے اور یہ بین البطلان ہے کہ عدم ثبوت مدعی پر ثبوت مدعا ہو یعنی ثبوت مدعا
عدم ثبوت مدعا کو لازم ہو یہ غلط ہے اور جب لازم غلط اور باطل ہے تو ملزوم یعنی
عدم ثبوت مدعا غلط اور باطل ہے اور جب ثبوت مدعا باطل ہے تو قطعاً ثبوت
مدعا حق ہے یعنی مدعا ثابت ہے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس
شبہہ کی سب سے بہتر یہی تقریر ہے جو میں نے بیان کی ہے اور اس کا صحیح حل یہ
ہے کہ قیاس کے دوسرے مقدمہ میں جو یہ کہا ہے کہ جب نقیض ثابت ہوگی تو کوئی
شے ثابت ہوگی۔ اس کوئی شے سے خاص شے مراد ہے یا عام شے مراد ہے یعنی خاص
شے بھی کوئی شے ہے اور عام شے کے ہر فرد پر بھی کوئی شے صادق ہے اگر مراد کوئی
شے سے خاص شے ہے تو وہ خاص شے صرف نقیض ہے یعنی اگر نقیض ثابت
ہوگی تو کوئی شے ثابت ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نقیض ثابت ہوگی تو کوئی

شے یعنی ایک چیز یعنی وہی نقیض ثابت ہوگی۔ اور جب اس کا عکس نقیض لیں گے
اور یوں کہیں گے کہ جب کوئی شے ثابت نہیں ہوگی۔ تو مدعا ثابت ہوگا تو یہ
عکس حق ہے کیونکہ کوئی شے کے ثابت نہ ہونے کے معنی نقیض کے ثابت نہ ہونے
کے ہیں اور نقیض کے ثابت نہ ہونے کی تقدیر پر قطعاً مدعا ثابت ہے۔ لہذا عکس
نقیض حق ہے اور اصل بھی حق ہے اور اصل نتیجہ قیاس ہے لہذا قیاس حق ہے
اور کوئی خرابی اب لازم نہیں آتی اور اگر کوئی شے سے عام شے مراد ہے یعنی
عام شے کا کوئی فرد یعنی اگر کوئی شے ثابت نہ ہوگی تو مدعا ثابت ہوگا۔ یہاں کوئی
شے سے عام شے کا ہر فرد مراد ہے تو بے شک اس وقت عکس نقیض تو ضرور باطل
ہے۔ لیکن یہ مراد لقینی ناجائز ہے۔ یعنی ثبوت میں شے کے لفظ سے جو مراد ہے نفی
میں بھی شے کے لفظ سے وہی مراد ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ ثبوت یعنی اصل میں شے
کا لفظ نکرہ تو ضرور ہے۔ مگر نکرہ معہودہ ہے۔ لہذا نفی یعنی عکس میں بھی نکرہ معہودہ
ہی کی نفی ہوگی۔ نکرہ منفیہ عام نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر نقیض ثابت ہوگی تو کوئی
شے ثابت ہوگی۔ اس قضیہ میں کوئی شے کے لفظ میں جو شے کا لفظ ہے وہ عام نہیں
ہے بلکہ وہ خاص شے ہے اور وہ خود نقیض ہے یعنی اگر نقیض ثابت ہوگی تو بیشک
نقیض ثابت ہوگی۔ اب عکس جو لیا جائے گا۔ تو نفی شے معین یعنی نقیض ہی کی نفی
ہوگی۔ شے عام کی نفی نہیں ہوگی۔ بلکہ شے خاص کی نفی ہوگی اور وہ شے خاص وہی
شے ہے جو اصل میں کوئی شے ہے اور وہ نقیض ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یوں نہیں
کہنا چاہیئے کہ اگر نقیض ثابت ہوگی تو کوئی شے ثابت ہوگی تاکہ عکس میں کوئی شے
کی نفی نکرہ منفیہ ہو کر عام ہو جائے بلکہ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اگر نقیض ثابت ہوگی

تو کوئی نہ کوئی شے ثابت ہوگی اور وہ کوئی نہ کوئی شے نقیض ہی ہے اور جب عکس میں
کوئی نہ کوئی کی نفی ہوگی تو وہ درحقیقت اسی معہود ہی کی ہوگی یعنی نقیض کی اور اس
وقت معنی یہ ہوں گے اگر کوئی نہ کوئی شے یعنی شے معہود فی الدین ثابت نہ ہوگی تو
مدعا ثابت ہوگا اور یہ حق ہے لہذا مغالطہ بالکلیہ باطل ہوگیا۔ غور کر یہ غور کا مقام
ہے متقدمین اور متاخرین شبہ کے حل اور اس کی تقریر سے غافل رہے ہیں۔ اب اہم
اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اللہ تعالے کا براہ راست خطاب خطاب تکوینی
ہے اور خطاب تکوینی میں مخاطب اسی خطاب کے ساتھ مکون اور متحقق ہوتا ہے یعنی
مخاطب کی مجال نہیں کہ خطاب سے مخاطب نہ ہو بس خطاب سے مخاطب ہونا ہی
اس کا فرمانبردار ہونا اور معصوم ہونا ہے۔ اور خطاب تکلیفی اللہ تعالے سے براہ راست
نہیں ہوتا بلکہ انبیاء اور رسل کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ خطاب بالواسطہ ہوتا ہے
یعنی نبی کے واسطے سے ہوتا ہے اور اس میں مخاطب کو قدرت واختیار ہوتا ہے اور
قدرۃ واختیار کو خطاب نبی سننے اور نہ سننے کی طرف نسبت برابر ہوتی ہے۔ اس لئے
ہوسکتا ہے کہ سنے اور ہوسکتا ہے کہ نہ سنے لہذا اطاعت وعصیان یہاں متصور ہے اور
خطاب الہیٰ میں عصیان اور غیر معصومی متصور ہی نہیں ہے۔ لہذا نبی معصوم ہی ہے۔
نبی سے عصیان متصور ہی نہیں ہے جس طرح تمام کائنات کو اللہ تعالے نے
خطاب تکوینی سے مخاطب کیا وہاں خلاف خطاب متصور ہی نہیں ہے مثلاً آگ کو
خطاب کیا، کونی حاراً، آگ حار ہوجا بغیر شدت طریان ضد کے یعنی جب تک کہ
ٹھنڈک کے طریان کی شدت نہ ہو تو حار ہی رہیو۔ بس وہ دائماً حار رہی ہوگی۔ جب
تک کہ دوسرا خطاب نہ ہو کہ یا نار کونی برداً بغیر طریان ضد کی شدت کے تو بیشک

اس وقت وہ ٹھنڈی ہی ہوگی اور یہی حال تمام کائنات مخاطبات ادلیہ کا ہے۔ بالکل کائنات ادلیہ کے نبی مشابہہ ہے۔ اور جس طرح خطاب ثانی سے کائنات کے پہلے احکام منسوخ ہو جاتے ہیں اور اسی طرح نبی کے خطاب ثانی سے پہلے خطاب کے احکام منسوخ ہو جاتے ہیں اور جس طرح کائنات میں بغیر دوسرے خطاب کے پہلے خطاب کے خلاف کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسی طرح نبی میں بغیر دوسرے خطاب کے پہلے خطاب کے خلاف کی صلاحیت نہیں ہے۔ لہذا نبی معصوم بالذات ہے۔ ان اتبع الامایوحیٰ الی میں صرف وحی کا متبع ہوں اور وحی کلام اللہ ہے اور کلام اللہ محتمل صدق وکذب نہیں ہے جس طرح انسانی کلام محتمل صدق وکذب ہے۔ قولہ الحق اس کا کلام حق ہی ہے۔ اس میں احتمال کذب نہیں ہے اور نبی اس کلام سے متکلم ہے جو اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام محتمل صدق وکذب نہیں ہے۔ کیونکہ تشقیق خصلت امکانی ہے۔ یعنی ممکن یا موجود ہوگا یا معدوم۔ اسی طرح موجود یا معدوم ہونے کی تمام خصلتیں ممکن ہی میں ہوں گی۔ اللہ تعالےٰ میں تشقیق نہیں ہے کہ اللہ یا موجود یا معدوم کیونکہ یا یہ یا یہ خاصہ امکانی ہے۔ بس اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ یا عالم ہے یا جاہل، قادر ہے یا عاجز بصیر ہے یا اعمیٰ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کے لئے اضداد نہیں ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالےٰ کا کلام یا صادق ہے یا کاذب۔ یہ ممکنات کے کلام کا خاصہ ہے۔ اللہ کا کلام صادق ہی صادق ہے اور نبی اللہ تعالےٰ کے کلام سے متکلم ہے۔ ماینطق عن الھویٰ اپنے اختیار سے نطق وتکلم نہیں کرتا اور اللہ کا کلام وقول حق ہی ہے۔ قولہ الحق اور بھید اس میں یہ ہے کہ جتنے بھی سچے کلام ہوتے ہیں۔ وہ وہی ہوتے ہیں جو واقعات کے مطابق ہوں اور اللہ تعالےٰ

کا کلام واقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ واقعہ اللہ کے کلام کے مطابق ہوتا ہے۔ اذا اراد شیأ ان یقول لہ کن فیکون جب وہ کسی شے کو واقع اور حقیقت بنانا چاہتا ہے۔ تو اس سے کہتا ہے، واقع اور حقیقت بن جا بس مجرد اس قول کو سنتے ہی وہ شے واقع اور حقیقت بن جاتی ہے۔ یعنی کن قول و کلام ہے اور یکون واقعہ اور حقیقت ہے اور قول مقدم ہے اور واقعہ موخر ہے۔ لہذا اس کا قول واقعہ کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ واقعہ اس کے قول کے مطابق ہوتا ہے یعنی جو وہ کہتا وہ حق اور صدق اور واقعہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ حق اور صدق اور واقعہ کہتا ہے۔ یعنی حق اور صدق اور واقعہ اس کے قول و کلام سے پہلے نہیں ہے تا کہ وہ صدق و حق اور واقع بولے بلکہ مجرد اس کے کہتے ہی صدق و حق و واقعہ متحقق ہو جاتا ہے۔ لہذا نبی سچ نہیں بولتا۔ بلکہ جو بولتا ہے وہی سچ ہے یعنی سچ اللہ اور رسولؐ کے قول کے تابع ہے۔ اللہ اور رسولؐ کا قول سچ کے تابع نہیں ہے۔ کیونکہ صداقتیں اور حقائق اور واقعات اس کے قول سے متحقق ہوئی ہیں۔ اس کا قول صداقت اور حقیقت اور واقعیت کا تابع نہیں ہے یہی شبہ لعین اوّل کو لگا اور اس نے اس کے قول کو واقع کے تابع کر دیا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میرے حکم کے بعد تعمیل حکم سجدہ سے کوئی مانع نہیں ہے ما منعک الا تسجد اذ امرتک یعنی واقعیت میرے قول کے تابع ہے۔ واقع واقع ہونے میں میرے قول کے بعد کوئی مانع نہیں ہے۔ اس مردود نے کہا کہ تیرا قول واقع کے خلاف ہے یعنی واقعہ میں مسجود کو خیر ہونا چاہیئے اور یہاں معاملہ معکوس ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ واقعہ قول کے تابع ہے کیونکہ اگر واقعہ واقع کے تابع ہو گا تو واقعہ متبوع دوسرے واقعہ کے تابع اور اسی طرح واقعات میں تسلسل لازم آئے گا۔ اور تسلسل محال ہے۔ لہذا واقعہ قول پر

منقطع ہوجائے گا۔ اور کل واقعات کی اصل قول الہٰی ہوگی بس یہ اصل گمراہی ہے جو
تمام حکماء اور فلاسفہ اور دہریہ اور جملہ مذاہب باطلہ کو مضل اوّل نے ضلالت کی ہے
اور یہی اصل ہدایت ہے کہ واقعات قول کے تابع ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے تمام ہادیوں کو
ہدایت فرمائی ہے۔ یعنی اصل اور اوّل ہدایت یہ ہے کہ تمام واقعات قول الہٰی کے تابع
ہیں اور اصل اوّل ضلالت یہ ہے کہ قول الہٰی واقعات کے تابع ہے۔ یعنی شریعت کے
تمام حقائق وفلسفی علوم تابع ہیں۔ نہ یہ کہ فلسفہ کے شریعت تابع ہو (ہم اس مضمون کو تفصیل
کے ساتھ دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں) لہذا شریعت فعل الہٰی ہے اور فلسفہ فعل شیطان
اور تشیطن ہے۔ غور کریئے انسانی کلام کو بلکہ ہر ممکن کے کلام کو صدق وکذب دونوں کی
طرف نسبت برابر ہے اور جبکہ انسانی اور امکانی کلام میں مساوات ہے تو پھر صدق کے
رجحان یعنی ہدایت کی توقع انسان اور ممکن سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ لہذا ضروری ہے
کہ صدق وہدایت کو بیرون انسان وممکن سے ترجیح دلوائی جائے اور بیرون انسان
وممکن خالق انسان ہے لہذا صرف اللہ ہی کا کلام صادق ہے اور وہی مبدءٔ ہدایت
ہے اور یہ اللہ کا کلام نبی کی زبان سے تکلم کیا جاتا ہے۔ لہذا نبی صادق ہے۔ اصدق ہے
معصوم محض ہے۔ مبدءٔ ہدایت ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ انسان کا بچہ ماں کے دودھ
کو بھی جو صحیح اس کی غذا حلال جائز نافع مفید اور ضروری ہے۔ منہ میں رکھ لیتا ہے اور
کنکر سوئی شیشہ کا ٹکڑا جو غیر صحیح حرام ناجائز مضر غیر مفید مہلک ہے، اسے بھی منہ میں رکھ
لیتا ہے۔ اس سے صحیح طور پر معلوم ہوگیا کہ انسان کی فطرت میں اختیار ہے۔ حسن وقبیح
نیک وبد حلال وحرام جائز وناجائز دونوں پر قادر ہے۔ لہذا وہ تمیز جو حسن وقبیح حلال
جائز ومفید کی طرف لے آئے وہ فطرت سے باہر ہے اور وہی تمیز نبوت ہے اور

معصیت اور ترک اولیٰ بے تمیزی ہے اور بے تمیزی تمیز میں متصور نہیں۔ لہذا نبی
میں معصیت اور ترک اولیٰ اور غیر معصومی متصور نہیں ہے۔ لہذا نبی معصوم محض ہے
اللھم صل علی سیدنا محمدؐ وعلی آل سیدنا محمد وبارک وسلم۔ اب اگر تو یہ کہے
کہ دلیل سے تو ثابت ہو گیا کہ نبی معصوم ہے۔ لیکن کثیر آیات بینات سے نبی کی
غیر معصومی ظاہر ہوتی ہے اور انہی آیات سے منکرین عصمت نے نبی کے غیر معصوم
ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ان آیات کی کیا تاویل ہے۔ وہ سب متشابہ ہیں۔
کیونکہ محکم دلیل سے ثابت ہو گئی عصمت اگر عصمت ثابت نہ ہو گی۔ تو قرآن۔ حدیث
اور تمام کلام ربانی مخدوش ہو جائیں گے۔ اور دین وحق ختم ہو جائے گا۔ مگر وہ ختم
نہیں حق ہے تو اس کے خلاف جو مضامین ہیں وہ سب متشابہ ہو گئے ہیں اور ان سب
کو متشابہات اور متشابہات میں شامل کر کے ان سے استدلال نہیں کیا جائے گا
اور یہ مقدمہ اس کے ساتھ لگا لیں کہ خدا کو حق ہے نبی کو جو چاہے کہے نبی کو بہت اچھا
کہے اور پھر ایسی بات کہہ دے۔ جو بہت اچھا ہونے کے خلاف ہو۔ اس کو خدا کو کوئی
روکنے والا نہیں جو چاہے کہے۔ جاننا چاہیئے کہ فریقین نے عصمت اور عدم عصمت
پر آیات ہی سے استدلال کیا ہے۔ قائلین عصمت کے دلائل یہ ہیں۔ پہلی دلیل :-

(۱) اگر انبیاء سے معصیت صادر ہو گی تو وہ مستحق ذم وعقاب ہونگے
لیکن وہ مستحق ذم وعقاب نہیں ہیں۔ لہذا ان سے معصیت صادر نہیں ہو سکتی۔ یہ اصول
دلیل ہے جو تمام ان آیات کو محیط ہے۔ جن سے عصمت پر استدلال کیا جاتا ہے۔
میں کہتا ہوں کہ استحقاق ذم وعقاب عدم غفران کی فرع ہے اور جبکہ اگلے پچھلے گناہ
معاف ہو گئے۔ تو پھر استحقاق ذم وعقاب کیسا۔ قائلین عصمت کی دوسری دلیل

(۲) اگر انبیاء سے معصیت صادر ہوگی تو ان کی شہادت نامقبول ہوگی. لیکن ان کی شہادت مقبول ہے، میں کہتا ہوں کہ غیر انبیاء صلحا فضلا وغیرہ سے قطعاً معصیت صادر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہادت مقبول ہوتی ہے. تیسری دلیل۔

(۳) اگر انبیاء سے معصیت صادر ہوگی تو ان کو ڈانٹنا واجب ہوگا. لیکن انبیاء کو ڈانٹنا واجب نہیں ہے. میں کہتا ہوں کہ صلحاء اور خلفاء اور صدیقین سب سے معصیت صادر ہوتی ہے اور ان کو ڈانٹنا واجب نہیں ہے. چوتھی دلیل۔

(۴) اگر انبیاء سے معصیت صادر ہوگی. تو معصیت میں بھی ان کی اقتدا واجب ہوگی. لیکن معصیت میں اقتدا واجب نہیں ہے. میں کہتا ہوں کہ امر اور اسوۂ حسنہ میں اقتدا واجب ہے۔ پانچویں دلیل

(۵) اگر انبیاء سے معصیت صادر ہوگی تو وعید عذاب اور لعنۃ کے مستحق ہوں گے. لیکن وہ مستحق عذاب و لعنۃ نہیں ہیں. میں کہتا ہوں استحقاق عذاب و لعنۃ عدم عفو کی فرع ہے. چھٹی دلیل۔

(۶) انبیاء اس بات کے ساتھ مامور ہیں کہ وہ لوگوں کو ترک معصیت کی تبلیغ کریں اگر وہ خود معصیت کریں گے۔ تو لم تقولون ما لا تفعلون کے تحت میں آجائینگے یعنی کیوں ایسی باتیں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جب جب عفو نہ ہو۔

(۷) ساتویں دلیل انبیاء کی شان میں ہے: انھم کانوا یسارعون فی الخیرات وہ تمام نیکیوں میں جلدی کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ صدیقین اور صلحاء بھی تمام نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان سے معصیت صادر ہوتی ہے۔

(۸) آٹھویں دلیل۔ انبیاء مصطفےٰ ہیں اور اصطفا مانع معصیت ہے. میں کہتا

ہوں اصطفا مانع معصیت نہیں ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا پھر ہم نے کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے مصطفاؤں کو قرار دیا۔ فمنھم ظالم لنفسہٖ پھر ان مصطفاؤں میں سے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے یعنی مصطفاؤں میں سے بعض ظالم یعنی صاحب معصیت تھے۔

(۹) نویں دلیل انبیاء مخلصین ہیں۔ اور شیطان نے کہا تھا۔ تیری عزت کی قسم بجز تیرے مخلص بندوں کے سب کو اغوا کروں گا۔ لہٰذا انبیاء شیطان کے اغوا سے مستثنیٰ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو شیطان کا قول حجت نہیں ہے اور ثانیاً شیطان نے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو اغوا کیا اور ایسا اغوا کیا کہ جنت سے نکلوا دیا۔

(۱۰) دسویں دلیل۔ مکلف کی دو قسمیں ہیں۔ حزب الشیطان اور حزب اللہ اگر انبیاء سے معصیت صادر ہوگی تو وہ حزب الشیطان میں داخل ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ جب جب عفو نہ ہو۔

(۱۱) گیارہویں دلیل انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں اور جب ملائکہ معصوم ہیں تو افضل الملائکہ بدرجہ اولیٰ معصوم ہیں۔ میں کہتا ہوں جو گفتگو عصمت انبیاء میں ہے وہی عصمت ملائکہ میں ہے۔ نیز افضلیت انبیاء متفق علیہ نہیں ہے۔ جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے غیر معصوم ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلائل بھی آیات ہیں۔ جیسے

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَاُ الْخَصْمِ ۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۔ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ ۔ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ط۔ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ط۔ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ط۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ - وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى - عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ - لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ - وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى - يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ - قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ - اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ط - وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا - اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ط اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ط - بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا - فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ط - اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ

"قائلین غیر معصومیت نے استدلال کیا ہے. میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے آیات؟ سے معصومی ثابت کی ہے. ان کے استدلالات بھی صحیح نہیں ہیں! اور جن لوگوں نے آیات سے غیر معصومی ثابت کی ہے. ان کے استدلالات بھی صحیح نہیں ہیں. اس لئے کہ آیات سے استدلال اس وقت صحیح ہوگا جب آیات کا لانے والا قابل تصدیق ہو اور مرتکب معصیت اس قابل نہیں ہے کہ اس کی نقل صحیح ہو. حاصل یہ ہے آیات سے قبل آیات کا لانے والا اگر معصوم ہے اور اس کے معصوم ہونے کی بنا پر آیات کو تسلیم کیا ہے تو پھر ان آیات سے اس کے معصوم ہونے پر استدلال بے سود ہے. اگر غیر معصوم ہے تو پھر ان آیات سے استدلال غیر معتبر ہے. اور حق یہ ہے کہ معجزہ نبی کے معصوم ہونے پر دلالت کرتا ہے اور نبی کا معصوم ہونا ممکنات میں سے ہے اور نبی کا غیر معصوم ہونا جن آیات سے ظاہر ہوتا ہے وہ سب متشابہات میں سے ہیں. لہٰذا ان آیات پر ایمان لانا واجب ہے اور عمل کرنا یعنی ان کے متعلق اظہار خیال کرنا ناجائز ہے مثلاً وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ یہ آیت حق ہے. لیکن اظہار خیال کہ آدم علیہ السلام عاصی تھے. غاوی تھے

ناجائز ہے بلکہ کفر ہے۔ اسی طرح انہ لیس من اھلک یہ آیت متشابہہ ہے۔ اس پر ایمان
لانا حق ہے اور اس پر عمل کرنا یعنی یہ اظہار خیال کرنا کہ نوح علیہ السلام کا قول غلط ہے یہ
اظہار خیال ناجائز بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ اللہ اور رسول دونوں کا قول حق ہے۔ کیونکہ
رسول کا قول ان ابنی من اھلی ہے اور اس کا رد اس کی نقیض ہے اور وہ اللہ تعالے کا
قول انہ لیس من اھلک ہے اور اسی طرح تمام اقوال کو قیاس کرنا چاہیئے۔ حاصل
یہ ہے کہ نبوت ہی معصوم ہے اور یہ نبوت اور معصومی محکم آیت یعنی معجزہ سے ثابت
ہو چکی۔ اب جو آیت بھی معصومیت کے خلاف آئے گی۔ وہ متشابہہ سمجھی جائے گی اور
متشابہہ کا حکم یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور عمل نہ کیا جائے جس طرح قرآن سارے
کا سارا بیان ہے اور وضاحت ہے۔ اس کے باوجود بعض آیات میں بیان اور وضاحت
نہیں معلوم ہوتی۔ لہذا ان آیات کو متشابہہ قرار دیا گیا اور ان پر ایمان واجب ہوا۔ اور عمل حرام
ہوا۔ اسی طرح نبی کی پوری عمر معصومیت کی ہے۔ اس کے باوجود کچھ ایسے حالات ظاہر ہوتے جو
بظاہر معصومیت کے خلاف ہیں۔ لہذا ان حالات کو متشابہہ قرار دیا گیا خوب سمجھ لو کہ
آیات کا تسلیم کرنا نبی کی معصومی پر موقوف ہے اگر آیات سے نبی کی معصومی پر استدلال
کیا جائے گا۔ تو حصر لازم آئیگا اور اگر آیات سے غیر معصومی پر استدلال کیا جائے گا
تو اس وقت آیات خود غیر معصوم ہیں۔ اس لئے آیات قابل استدلال نہ رہے گی
کیونکہ اس وقت نبی کا غیر معصوم ہونا موقوف ہو گیا۔ آیات کے معصوم ہونے پر اور
آیات کا معصوم ہونا موقوف ہے۔ نبی کے معصوم ہونے پر نبی کا غیر معصوم ہونا نبی کے معصوم ہونے
پر موقوف ہو گیا اور یہ محض تخلیط اور لغو ہے اور لغو سے احتراز باعث فلاح ہے۔ الذین ھم عن اللغو
معرضون۔ لہذا انبیاء کی غیر معصومی سے احتراز اور معصومی پر ایمان باعث فلاح

ہے۔ تنبیہہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ نبی کے متعلق معصیت یا ترک اولیٰ کی نسبت کرنی حرام ہے۔ ہاں بیشک اللہ تعالےٰ کو حق ہے کہ وہ نبی کی شان میں جو چاہے فرمائے لیکن غیر نبی کو نبی کے حق میں نبی کی شان کے خلاف الفاظ استعمال کرنے کفر ہیں اور ان کی نقل بغیر کسی عقیدہ کے فسق ہے۔ اس کفر و فسق سے احتراز لازم ہے نبی نے کہا ان ابنی من اھلی۔ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ نبی نے بات حق کہی مگر اس نے کہدیا انہٗ لیس من اھلک میں اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہے اذا جاءك المنافقون قالوا نشھد انك رسول اللہ جب منافق تیرے پاس آئے تو انھوں نے کہا کہ البتہ بے شک تحقیق تو خدا کا رسول ہے۔ اتنی بڑی غلیظ قسم کھائی بات صحیح تھی اس کی تصدیق کردی اللہ یعلم انك رسول اللہ۔ اللہ جانتا ہے کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے تائید کردی مگر اس کے کہنے والے جھوٹے ہیں۔ واللہ یشھد ان المنافقین لکذبون۔ اللہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں یعنی سچ بولکر جھوٹ بول رہے ہیں۔ ولولا جاءو علیہ باربعة الشھداء فاذ لم یاتوا بالشھداء فاولئك عند اللہ ھم الکذبون کس کو شک ہوسکتا ہے کہ تین صدیق ایک بات کہہ دیں کہ یہ سچ ہے مگر اگر چار شاہد نہ لائیں تو جھوٹے ہیں میں ان کو تسلیم نہیں کرتا یعنی ۳ صدیق کو جھوٹا اور ۴ کا ذبوں کو سچا تسلیم کرتا ہے۔ اگر ۴ جھوٹے کہدیں کہ شادی شدہ آدمی کو زنا کرتے دیکھا ہے تو بس میں نے اس کو تسلیم کرلیا اس کو پتھروں سے مار ڈالو۔ اور ان ۳ سچوں سے اتنا ناراض ہے کے مارو۔ ۸۰-۸۰ کوڑے ان سچوں کے۔

تو خدا کو حق ہے جو چاہے کہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اس کے معاملے میں تو بولنا ہی نہیں چاہیئے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اگر بادشاہ وزیر کے متعلق، وزیر کی شان

کے خلاف کوئی لفظ استعمال کرے اور دوسرا شخص بھی اسی طرح وزیر کی شان کے خلاف
اسی قسم کے الفاظ ادا کرے تو یہ قطعی اس شخص کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ دیکھو
اللہ تعالےٰ نے فرمایا یاَ ایہا الذین امنو لا تقولو ا راعنا و قولو ا انظرنا ۔ اے ایمان والو
راعنا نہ کہو انظرنا کہو اور لغت میں راع اور انظر دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن
راع میں شائبہ اہانت تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو منع کر دیا گیا۔ جو دل سے قطعی اہانت
گوارا نہیں کرتے تھے۔ یعنی مومنوں کو نیک نیتی سے بھی ایسا لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیئے
کہ جس میں اہانت کا شائبہ ہو اور یہ کون تھے جن کو کہا گیا یہ ابوبکر، عمر، عثمان و علی تھے
ہماری تمہاری تو بات ہی نہیں۔ نبی جس وقت انتہائی دنیا داری میں مصروف
ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنا مقرب الہٰی ہوتا ہے کہ دوسرا شخص غیر نبی انتہائی
استغراق الہٰی میں بھی اتنا مقرب نہیں ہوتا اور بھید اس میں یہ ہے کہ صدیق کو
اللہ سے تعلق ہوتا ہے اور نبی سے اللہ کو تعلق ہوتا ہے۔ اور اللہ کو جو بندے سے
تعلق ہے وہ بہت بڑا ہے اس تعلق سے جو بندے کو اللہ سے ہوتا ہے۔ بندے کو اللہ سے جو تعلق
ہے اس کی انتہا صدیقیت ہے اور اللہ کو جو بندے سے تعلق ہے۔ اس کی ابتدا نبوۃ ہے
کیا تو نہیں دیکھا کہ مینار جب تو دو حصے کرے گا تو نیچے کے حصے کا بلند مقام بھی
اوپر کے حصے کے پست مقام سے پست رہے گا۔ صدق کی تو صرف عبادت ہی
عبادت ہے وہ بھی جبکہ جب مقبول ہو اور نبی کا جینا اور مرنا اور تندرست ہونا اور بیمار ہونا
اور سیر ہونا اور بھوکا رہنا، سب عبادت مقبولہ ہے۔ قل ان صلاتی و نسکی و محیای
و مماتی للہ رب العالمین۔ للہ کے معنی مقبول کے ہیں۔ بہر حال نبی کی شان میں
کوئی معمولی سا لفظ بھی استعمال کرنا کفر یا فسق ہے۔ چہ جائیکہ معصیت یا ترک اولیٰ

کہنا۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے حضور میں دن رات بے تکان اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے بڑے سے بڑے کے لئے بھی اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ واصطنعتک لنفسی میں نے تو تجھے اپنے لئے بنایا ہے اور جو بندہ اپنی بیوی کے آگ سینکنے کے لئے آگ کی تلاش میں نکلے اس سے اللہ تعالےٰ کہے یا موسیٰ انی انا اللہ اور فرمائے واصطنعتک لنفسی اور ان بزرگ بندوں پر کبھی سلام نہیں بھیجا اور جن بندوں کو اپنے لئے بنایا ان پر سلام بھیجا۔ وسلام علی المرسلین اور ان بزرگ بندوں سے کہا کہ وہ صلاۃ میرے بندے پر بھیجیں۔ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین امنوصلوا علیہ وسلموا تسلیما

اثباۃ نبوۃ انسان نبی کی طرف محتاج ہے۔ یعنی نبی کے بغیر انسان انسان ہی نہیں ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے یعنی انسان اور حیوان میں فرق ظاہر ہے اور اس فرق کا نام عقل ہے۔ لہذا انسان عاقل ہے۔ اور عاقل محتاج معلم اور معلم عقل ہی نبی ہے۔ لہذا انسان محتاج نبی ہے۔ اب اس بات کا بیان کہ عقل محتاج تعلیم ہے اور عاقل محتاج معلم ہے یہ ہے کہ دنیا کی زندگی بسر کرنی یعنی اس موجودہ حیات کا گذارنا عقل پر موقوف نہیں ہے۔ اگر اس زندگی کا گذارنا اور بسر کرنا عقل پر موقوف ہوگا۔ تو چونکہ تمام حیوانات اس زندگی کو گذار رہے ہیں، سب کے سب عقلا ہو جائیں گے۔ اور اس وقت انسان اور حیوان میں فرق نہیں رہے گا۔ بلکہ انسان تمام حیوانات سے کمتر اور بدتر ہو جائے گا۔ کیونکہ تمام حیوانات بغیر عقل کے زندگی گذار رہے ہیں۔ اور انسان عقل کی مشقتیں برداشت کرکے زندگی گذار رہا ہے۔ اور کتاب الہیٰ

میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اُلٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ہُمْ اَضَلُّ۔ یہ مثل حیوانات ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر لہٰذا ضروری ہے کہ دنیاوی زندگی بسر کرنے کے علاوہ عقل پر کوئی اور ثمرہ مرتب ہو۔ یعنی عقل سے کوئی ایسا فعل ہونا لازم ہے۔ جو دنیاوی زندگی بسر کرنے کے علاوہ ہو اور ایسا فعل کہ جس کا انجام حیات دنیوی نہ ہو عقل کو متصور نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عقل کو ایسا فعل کرنا لازم اور واجب اور ضروری ہے کہ جس فعل کا انجام دنیوی مسرت راحت نہ ہو اور اس جہاں میں ایسا فعل کرنا کہ جس کا انجام دنیوی زندگی نہ ہو عبث کہلاتا ہے اور عقل عبث نہیں ہے۔ لہٰذا ایسا فعل جو نہ عبث ہو اور اس کا انجام دنیوی زندگی بھی نہ ہو قطعاً عقل کو معلوم نہیں ہے لہٰذا عقل کا وجود اور اس کے فعل کی حقانیت کو عبث سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی معلم ہو جو اس کو ایسے فعل سے بچانے کی تعلیم دے۔ جو اس کو عبث فعل سے بچائے۔ اور ایسے فعل سے بچائے جو دنیوی زندگی میں مفید ہے۔ پس معلم عقل انسانی یا خالق مخلوقات ہے یا انسان نبی ہے۔ تو خالق مخلوقات تو معلم ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ خالق کی تعلیم تکوینی ہے اب اگر خالق تعلیم دے گا۔ تو تمام عقول مرتبہ اول میں تعلیم یافتہ اور ہدایت یافتہ ہو جائیں گی اور کوئی بھی ضلالتہ یافتہ نہیں رہے گا۔ اور اگر مخلوقات اور کائنات معلم عقل ہوں گی تب بھی تمام کی تمام عقلیں تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ کیونکہ کائنات اور جملہ مخلوقات سب کے سب ملازم مالک ہیں اور ملازم کا فعل مالک ہی کا فعل ہوا کرتا ہے لہٰذا تمام عقول انسانی ہدایت یافتہ ہو جائیں گی نیز خالق کائنات اور کائنات دونوں کے دونوں ہر وقت عقل انسانی کے سامنے موجود ہیں اور اگر ہدایت

خالق کا یا کائنات کا یا دونوں کا اثر ہوگی تو عقل انسانی دائماً ہدایت یافتہ ہو جائے
گی۔ اور ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی عقل ہدایت یافتہ ہے اور کوئی ہدایت یافتہ نہیں
ہے۔ یعنی اختلاف متحقق ہے اور اختلاف کا تحقق بین دلیل ہے اس بات کی کہ
ہدایت میں براہ راست نہ خالق کی تاثیر ہے نہ کائنات کی۔ اگر خالق کی تاثیر ہوتی
تو سب ہدایت یافتہ ہو جاتے جس طرح سب عقل یافتہ ہو گئے۔ یعنی عقل کے وجود
میں خالق کی تاثیر ہے اس لئے سب کے سب انسان عقل یافتہ ہو گئے۔ اور سب
حیوان سے ممتاز ہو گئے۔ اور جس طرح حیاۃ میں خالق کی تاثیر کے سبب سے سب
کے سب حی ہو گئے۔ اور جس طرح کائنات کی تاثیر کے سبب سے سب کے
سب باقی ہو گئے۔ یعنی بقاء عارضی میں کائنات کی تاثیر سب میں مشترک ہے
مثلاً سورج کی تاثیر سے سب کے سب منور اور گرم ہو گئے۔ رات کی تاثیر سے
سب کے سب مظلم اور سرد ہو گئے وغیرہ یعنی عقل جس فعل کے لئے وضع ہوئی
ہے عقل میں اس فعل کے کرنے کی صلاحیت تو ہے فعلیت نہیں ہے۔ اب اگر
اللہ تعالےٰ یا کائنات کا اثر وہ فعل ہوتا کہ جس فعل کے لئے عقل کو وضع کیا ہے
تو اس فعل کی فعلیت ہوتی صلاحیت نہ ہوتی۔ لہٰذا ایسا معلم اور ہادی ہونا چاہیے
جو فعل کو صلاحیت سے خارج کر کے فعلیت کی طرف لے آئے اور یہ صلاحیت
اختیار کا پتہ دے رہی ہے۔ یعنی چاہے عقل اس فعل کو کرے چاہے نہ کرے اور
خدا تعالےٰ کی تاثیر میں اور کائنات کی تاثیر میں اختیار باقی نہیں رہتا۔ مثلاً
خدائے تعالےٰ کہے کہ میں ایک ہوں تو کسی کی مجال نہیں جو شرک کرے یا آسمان
زمین سورج چاند حیوان درخت پتھر یہ کہے کہ اللہ تعالےٰ ایک ہے تو کس کی

مجال ہے جو شرک کرے اور اس وقت انسان انسانیت اور عقل و اختیار سے خارج ہو کر غیر انسانیت اور بے عقلی اور بے اختیاری میں داخل ہو جائے گا لہذا ایسا معلم ہونا چاہیئے کہ انسان انسانیت اور عقل و اختیار سے خارج نہ ہو اور تعلیم اور ھدایت حاصل کر لے اور ایسا معلم صرف انسان ہی ہے۔ اور اسی انسان معلم کا نام نبی ہے۔ لہذا جس نے نبوت کا انکار کیا۔ اس نے اللہ تعالےٰ کی اس نعمت عظمتہ کا انکار کیا کہ جس کا نام انسانیت اور عقل و اختیار ہے اور اس کی تصریح کتاب الہیٰ میں کی گئی ہے۔ وما قدروا اللہ حق قدرۃ اذقالوا ما انزل اللہ علی بشر من شئ اللہ تعالےٰ کی انھوں نے نہایت نا قدری کی یعنی اللہ تعالےٰ کی عظیم ترین نعمت کی نا قدری کی جب انھوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالےٰ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ وہ عظیم ترین نعمت انسانیت عقلی و اختیار تھی۔ جو نبوت کے انکار کے بعد وہ نعمت عبث اور رائیگاں ہو جاتی ہے۔ حاصل اس سارے بیان کا یہ ہے کہ انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے اور یہ امتیاز صرف عقل ہی ہے اور تمام حیوانات بغیر عقل کے اس دنیا کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس زندگی بسر کرنے میں عقل کی حاجت نہیں ہے۔ تو ضرور ہے کہ عقل کے لئے اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی اور عمل اور کوئی اور کام ہے اور وہ عمل اور وہ کام عقل کو معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کے کام ہی کا نام ہدایت ہے۔ اگر عقل کو اپنا کام معلوم ہوتا تو عام انسان ہدایت یافتہ ہوتے اور اختلاف نہ ہوتا۔ لیکن اختلاف مستحق ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ عقل اپنے کام سے بے خبر ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ عقل کو اس کے کام سے باخبر کرنے کے لئے کوئی معلم

اور مخبر ہونا چاہیئے۔ تاکہ عقل عبث نہ ہوجائے یا غلط عمل نہ کرے اور اسی معلم اور
مخبر صادق کا نام نبی ہے اور خالق عقل اور دیگر تمام مخلوقات علاوہ انسان کے
اگر معلم عقل اور مخبر ہوں گے تو انسان مجبور ہوجائے گا۔ لیکن انسان مختار
ہے۔ لہذا ایسا معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کو باخبر کردے اور انسان اپنے اختیار
سے اپنا صحیح عمل کرلے اور ایسا معلم صرف انسان ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ انسان
معلم اور مخبر ہی نبی ہے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ مزید توضیح اس دنیاوی
زندگی کی غایت و مقصد بغیر عقل کے پورا ہورہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ عقل
کی زندگی اس کے ماورائے ہے اور ماورا، لذت الم ہے اور الم ہرگز مقصود نہیں
ہے۔ لہذا عقل کا مقصود بھی لذت ہی ہے۔ لیکن ایسی لذت جس میں ضرر کی
اور الم کی ملونی نہ ہو خالص لذت مقصود عقل ہے اور نکھری ہوئی اور خالص
لذت جب تک حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس ملونی اور اس کھوٹ اور
کوڑے کو نکھارا نہ جائے۔ لہذا ضروری ہے کہ کوئی نکھارنا سکھائے اور وہ نکھارنا
سکھانے والا ہی نبی ہے اور اسی کی طرف کتاب الہیٰ میں اشارہ ہے۔ قد افلح
من ذکہا وقد خاب من دسٰہا جس نے نفس کو نکھار لیا۔ اس نے خالص لذت
پائی، اور جس نے نفس کو تھتھڑا رہنے دیا وہ خالص لذت سے محروم رہا۔ اب اگر تو یہ
کہے کہ یہ عالم بد زندگی یہ حیوانی حیات تھتھڑی ہوئی ہے۔ یہ لذت تھتھڑی ہوئی ہے
اس میں نکھرا ہوا عالم نکھری ہوئی حیات نکھری ہوئی خالص لذت متحقق ہی نہیں پھر
کس طرح عقل تعلیم پاکر باخبر ہوکر تھتھڑے ہوئے میں نکھرے ہوئے کو کیونکر تلاش
کرے گی۔ میں کہوں گا تھتھڑا ہوا ہی تھتھڑے ہوئے سے قطع نظر نکھرا ہوا ہے جس وقت

لتھڑا ہوا چھاننے اور نکھارنے کے بعد دوسرے پیالے میں پلٹا جائے گا. بس
وہی لتھڑا ہوا دوسرے پیالہ میں نکھرا ہوا ہے. بس یہی حیات حیوانی اگر نبی کی رائے
سے بسر کی گئی اور اسی بسر کرنے کا نام چھاننا اور نکھارنا ہے. بس یہ زندگی بسر
کرتے ہی چھن گئی اور نکھر گئی اور اسی کا نام حیات عقلی ہے اور سعادت سرمدی و فوز
عظیم ہے تنبیہ یہ حیات عقل انسانی حیات ملکی یا حیات ملکی کے مشابہ نہیں ہے جیسا کہ حذاق
علماء اور قدماء حکما کو شبہ ہوا ہے کیونکہ حیات ملکی مدبر امر ہے جیسا کہ فرمایا فالمدبرات
امرا حیات انسانی امر ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ قل الروح من امر ربي اور امر مقصود تدبیر
ہے۔ لہذا حیات انسانی عقلی حیات ملکی سے قطعی افضل ہے اور اس مسئلہ کو دوسری
جگہ ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے. کیا تو نہیں دیکھتا کہ قوی طبیعۃ جاذبہ ماسکہ
ھاضمہ واخذ غاذیہ نامیہ متولدہ اور قوی حیوانیہ خمسہ ظاہرہ اور خمسہ باطنہ شہوت و غضب
یہ انیس کی انیس قوتیں ظلمانی جس طرح مدبرات امر ہیں اسی طرح قوی نورانیہ مسلکہ
بھی مدبرات امر ہیں اور امران ظلمانی اور نورانی دونوں قوی سے بالاتر ہے۔ لہذا
سعادت عقلی انسانی کونین کی سعادتوں سے افضل ہے اور یہ حیات عقلی نبوت
کا ظل ہے اور نبوت کا اتباع ہے جس طرح ظل کے لئے نور آفتاب ضروری
ہے۔ اسی طرح حیات عقلی کے لئے نبوت ضروری ہے. جس طرح آنکھ اندھیرے
میں بغیر چراغ کے نہیں دیکھ سکتی اسی طرح عقل حیوانی ظلمتوں میں بغیر نور نبوۃ
کے نہیں دیکھ سکتی. لہذا انسانیت کے لئے نبوۃ لازم اور ضروری ہے۔ اس
کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ تکلم اور کلام متکلم کی فرع ہے. یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ
کلام ہو اور متکلم نہ ہو. لہذا تکلم کے لئے اولی اور ابتداء ہے. لہذا پہلی بار جو تکلم

متحقق ہوا ہے وہ کسی انسان سے نہیں سیکھا گیا کیونکہ وہاں کوئی اور انسان ہی نہیں تھا لہذا پہلا تکلم صرف اللہ تعالےٰ کی وحی سے ہوا ہے اور یہی نبوت کے معنی ہیں یعنی بیٹے نے ماں باپ سے تکلم سیکھا اور ماں باپ نے اپنے ماں باپ سے سیکھا اور یہ طریقہ لا انتہا تو جا نہیں سکتا کیونکہ تکلم متکلم کی فرع ہے اور متکلم کے بعد ہے۔ لہذا تکلم کیلئے قطعاً اول ہے اور یہ پہلا تکلم جو بغیر سیکھے متحقق ہوا ہے۔ یہ صرف وحی الہیٰ سے ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کتاب میں جو مضمون ہے وہ دماغ سے آیا ہے اور دماغ میں مضمون کتاب سے آیا ہے اب ہر کتاب دو دماغ کے بیچ میں ہے اور ہر دماغ دو کتاب کے بیچ میں ہے اور بیچ کا تحقق ہو نہیں سکتا۔ اوّل کے تحقق کے بغیر۔ لہذا ضروری ہے کہ پہلی کتاب ہو اور پہلا دماغ ہو اور یہی پہلی کتاب کتاب اللہ اور پہلا دماغ رسول اللہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہر شے کا تحقق اور تکون خطاب الہیٰ سے ہوا ہے۔ جیسے کہ فرمایا کن فیکون۔ یعنی ہر شے نے اللہ تعالےٰ کے خطاب سے وجود حاصل کیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہر شے دوسری شے سے ہے جیسا کہ دہریہ کہتا ہے۔ کیونکہ اگر ہر شے دوسری سے ہوگی تو پہلی شے سے دوسری شے کا عین ہوگی یا غیر ہوگی اگر عین ہوگی تو یہ پھر ہوئی کیا یہ تو پہلی ہر شے ہے یعنی مرغی انڈے کا یا غیر ہے یا عین ہے اگر مرغی انڈے کا عین ہے تو پھر مرغی ہوئی، کیا انڈا ہی رہا اگر مرغی انڈے کا غیر ہے تو قطعی مرغی عدم سے آئی اور عدم سے آنے کے معنی ہیں خطاب الہیٰ سے آنے کے ہیں۔ لہذا ہر شے خطاب الہیٰ سے متحقق ہے۔ پہلا خطاب کن ہے۔ دوسرا خطاب کن کذا ہے۔ اب اگر انسان مخاطب بخطاب کن کذا نہ ہوگا۔ اور ہر شے مخاطب بخطاب کن کذا

ہے۔ تو انسان تمام اشیاء سے کمتر اور بدتر ہو جائے گا۔ لہذا انسان کو مخاطب بخطاب کن کذا ہونا چاہیئے اور یہ خطاب نبی ہی کے واسطے سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر نبی کا واسطہ نہ ہوگا تو انسان تمام اشیاء کی مثل ہو جائے گا۔ اور کوئی تفوق انسان کو کائنات سے نہیں ہوگا۔ اور اس وقت مثل جمادات و نباتات و حیوانات ہو جائے گا۔ لہذا انسان کو انسان بننے کے لئے نبی کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ بغیر نبوۃ اور رسالت کے نظام انسانیت باطل ہو جائے گا جس طرح بغیر توحید کے نظام کائنات باطل ہو جائے گا۔ لہذا کائنات کی بقا کے لئے توحید کی ضرورت ہے اور انسانیت کی بقا کیلئے نبوۃ کی ضرورت ہے۔ غور کریں کہتا ہوں کہ عقل کے عمل کا نام فکر ہے اور فکر معلومات کی ترتیب کا نام ہے۔ یعنی ایک معلوم کو مقدم رکھیں اور دوسرے کو موخر رکھیں تاکہ نامعلوم اور مجہول چیز معلوم ہو جائے اور معلومات یہ نہیں چاہتے کہ ایک معلوم مقدم ہو اور دوسرا موخر۔ کیونکہ ترتیب جس طرح ایک کو مقدم اور دوسرے کو موخر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے کو مقدم اور پہلے کو موخر کرنے سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً جو شے دائیں جانب ہے اگر منہ پھیر لیا جائے تو وہی شے بائیں جانب ہے اور وہی شے جو آگے تھی وہ پیچھے ہو سکتی ہے۔ لہذا عقل کا عمل صرف ترتیب ہے اور ترتیب کو صحت ترتیب لازم نہیں ہے۔ ورنہ تمام عقلاً ایک ہی نتیجہ پر پہونچتے۔ تو لابداً وہ ضروری ہوا کہ کوئی عقل کے عمل ترتیب کو درست اور صحیح کرے اور وہی یعنی عقل کے عمل و ترتیب کو صحیح اور درست کرنے والا ہی نبی ہے۔ یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ فلسفی علوم جتنے بھی ہیں۔ سب کے سب دنیاوی زندگی میں کارآمد ہیں۔ مثلاً علم حساب جس میں عدد کے احوال کا بیان ہے اس سے فائدہ صرف

یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتیں اوران کا تبادلہ بآسانی ہوسکے. علم الجبرا میں حساب کے
مشکل سوالات بآسانی حل ہوجائیں. علم ہندسہ سے تعمیرات اور کلوں کے
نقشے وغیرہ بآسانی حاصل ہوجاتے ہیں. علم طب سے بدن انسان کو صحت
ومرض کی حیثیت سے جو احوال لاحق ہوتے ہیں. ان کا تعارف ہوجاتا ہے علم ہیئت
سے اشکال فلکیہ اوران کی تاثیرات جو فضول ہوتی ہیں وہ معلوم ہوجاتی ہیں علم
نغمہ سے گلے کی آوازوں کے حال اور گانے کے حال معلوم ہوجاتے ہیں. علم
طبعی کے تمام اصناف سے تاثیرات اجسام معلوم ہوجاتے ہیں اور یہ تمام علوم
صرف اس حیات دنیاوی میں دخیل ہیں اور یہ زندگی ان علوم کے بغیر بہت بڑی
تعداد حیوانات کی بسر کررہی ہے. لہٰذا جبکہ یہ زندگی ان عقلی علوم کے بغیر بھی بسر
ہوسکتی ہے. بلکہ ہورہی ہے تو اس وقت یہ عقلی علوم اور یہ عقل کا عمل لغو اور بیکار
ہے اور اس وقت انسان تمام حیوانات سے بدتر اور کمتر ہوجاتا ہے. کیونکہ
حیوان بغیر عقلی علوم زندگی بسر کررہا ہے. انسان عقلی علوم کی اتنی بڑی مصیبت
برداشت کرکے زندگی بسر کررہا ہے. اب رہے علوم مابعد الطبیعۃ یعنی علم الٰہیات
اور علم کلی سو یہ اضغاث احلام ہیں. کیونکہ علم ادجانی اور علم مجردات اور علم مفارقات
یہ عقل کو حاصل ہی نہیں ہوسکتے. کیونکہ عقل جس روح کی صفت ہے. اپنے
محل کو یعنی روح کو آج تک نہیں سمجھ سکی. دیگر ارواح نورانی یا ظلماتی کو کیا
سمجھے گی اور مفارقات کو کیا سمجھے گی. غور کر اب رہا علم منطق سو اس میں کلیات
یعنی تصور و تصدیق سے بحث ہوتی ہے. تو یہ مفہومات کلیہ نہ تو جزئیات مادتیہ
میں مفید ہیں. یہ جزئیات مجردہ ہیں. لہٰذا منطق دافی خسران دنیا و دیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی علوم میں صرف ریاضی اور بعض طبعی علوم مفید ہیں اور وہ بھی صرف اس حیاتِ دنیوی میں اور حیات دنیوی قطعاً ان علوم ریاضیہ اور طبیعیہ کے بغیر حاصل ہو رہی ہے۔ تمام حیوانات ان علوم کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس وقت علماء ریاضی اور علماء طبعی تمام حیوانات سے بدتر ہو گئے اور علماء علوم الٰہیہ کلیتہ ضال اور مضل ہیں۔ کیونکہ عقل کو آج تک اس کے محل یعنی روح کا علم نہیں ہو سکا۔ اور علماء منطق کی مثال ایسی ہے۔ جیسے خواب میں راحت ہی راحت دیکھ رہا ہے۔ بیدار ہوتے ہی کچھ بھی نظر نہیں آتا یا جیسے بچہ تصویر سے خوش ہو رہا ہے۔ ذی تصویر کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتا۔ یہ حال ہے عقلی علوم کا بیشک بعض دنیا کی زندگی میں مفید ہیں۔ لیکن اس صورت میں انسان حیوان سے قطعی بدتر ہو جاتا ہے اور دیگر بعض درحقیقت حاصل ہی نہیں ہیں۔ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل یعنی عقل کی بدولت بعض صورتوں میں مثل حیوان ہے اور بعض میں حیوان سے بھی بدتر ہے۔ حملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولا۔ انسان عقل کی امانت برداشت کر کے بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہو گیا۔ ظالم تو یوں ہوا کہ فلسفہ الٰہیات اور علوم کلیہ میں وقت عزیز برباد کر دیا۔ اور جاہل یوں ہوا کہ ریاضی اور طبعی اور سائنس میں وقت صرف کر دیا اور یہ نہ جانا کہ بغیر ریاضی اور طبعی کے زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ بلکہ بکثرت ہو رہی ہے۔ خواہ مخواہ کی مشقت میں مبتلا ہوا۔ اس سارے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ عقل بطور خود جو علوم حاصل کر رہی ہے یا جو عمل کر رہی ہے وہ یا عبث ہے یا ظلم و ضلالت و جہالت ہے۔ لہٰذا عقل محتاج ہے کہ کوئی اس سے صحیح عمل کرائے اور وہی نبی ہے۔ جو ان کو کتاب اور حکمت سکھائے

ویعلمھم الکتاب والحکمتہ۔ کتاب وہ چیز ہے جس میں شک نہ ہو یعنی یقین
اور یقین خیر محض ہے اور حکمت خیر کثیر ہے۔ من یوت الحکمتہ فقد اوتی خیرًا
کثیرًا، یعنی یقینی علم اور عمل صالح کی تعلیم کرے۔ اب اگر تو یہ کہے عقل بغیر تعلیم نبی کے
بہت سے یقینیات حاصل کر لیتی ہے تو میں کہوں گا ہرگز نہیں بلکہ عقل کو
بہت سے یقینیات فطرتًا حاصل ہیں۔ حاصل کرتی نہیں، کسب کرتی نہیں بلکہ
بلاکسب وہب عقل کی طرف سے ان یقینیات اور بدیہات کا فیضان ہوتا
ہے اور یہ استعداد ہے۔ فعلیتہ نہیں ہے۔ یعنی عقل کا کسب نہیں ہے۔ بلکہ
مرتبہ اوّل میں یہ علوم یقینیہ بدیتہ خالق عقل کی طرف سے عقل انسانی میں موہوب
ہوتے ہیں اور ان علوم بدیتہ میں انسان اور حیوان مشترک ہیں۔ وہاں ان علوم
بدیتہ سے نظری علوم کی طرف انتقال کی قابلیت اور استعداد عقل انسانی میں
ضرور ہے۔ فعلیتہ قطعی نہیں ہے۔ ورنہ اکتساب کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ نیز جس
طرح بدیہی علوم میں تمام انسان مشترک ہیں اسی طرح نظری علوم میں بھی تمام
انسان مشترک ہو جاتے اور اس وقت انسان تمام کائنات کے مشابہ ہو جاتا
ممتاز نہ رہتا۔ اور بھید اس میں یہ ہے کہ عقل جزئیات جسمانیہ ذی جہات سے کلیات
اخذ کرتی ہے اور ذی جہات بجمیع جہات دفعتہ متصور ہو نہیں سکتے۔ یعنی عقل
بلحظ واحدہ جمع جہات کا تصور تعقل نہیں کر سکتی اور جب وہ ایک جہت کا تصور
کرکے دوسری جہت کا تصور کرتی ہے۔ اور دوسری جہت کا تصور صحیح بغیر دوسری
جہت کے تحقق کے ہو نہیں سکتا اور تحقق جب ہوگا جب جہت بدلیگی۔ مثلاً اوپر کا
تصور کرکے جب نیچے کے تصور کرلے گی۔ تو یہ تصور جب ہی صحیح ہوگا جب اوپر کو

نیچے اور نیچے کو اوپر کیا جائے۔ اور جہت کو بدلتے ہی ترتیب غیر صحیح ہو جاتی ہے اور نتیجہ غلط اور غیر صحیح ہو جاتا ہے۔ مثلاً ٹھنڈک اور گرمی ۲ مختلف اثر ہیں۔ اور اثر کی دوسری جہت تاثیر ہے اور اختلاف کی دوسری جہت اتحاد اور وحدت ہے اب اگر بغیر جہت بدلے یہ حکم لگایا جائے گا کہ اتحاد تاثیر اتحاد اثر کو مستلزم ہے تو یہ نتیجہ غلط ہوگا اور اسی گمراہی میں تمام حذاق حکماء مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے اور تمام خدم عالم کے مبادی تا مقاطع اس فاسد بنیاد پر مرتب کئے غلطی اس میں یہ ہے کہ عقل نے واقع میں جہت بدلے بغیر جہت پر حکم لگا دیا یعنی عکس نقیض کا قبضہ جب حق ہو جب طرفین کا تبادلہ واقع میں ہوا ہو ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ عقل نے خیال میں تبادلہ کر کے اور عکس کر کے حکم لگا دیا۔ اب اگر واقع میں اثر کی جہت بدلتی اور تاثیر کی جہت اوپر آجاتی تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ یہ تاثر اضطراری ہے یعنی واحد اضطراری سے واحد ہی صادر ہوتا ہے نہ اور اللہ تعالےٰ واحد اختیاری ہے لہذا اس سے کثرت کا صدور ممکن ہے۔ بلکہ واقع ہے اور بھید اس میں یہ ہے کہ اختیار دو جہتین ہے اور اضطراری ذی جہت واحدہ ہے اور تاثیر کی دونوں جہتیں میں یعنی اختیار اور اضطرار تو تاثیر کون سے رخ اور کونسی جہت کے اعتبار سے واحد اثر کرتی ہے۔ یہ عقل نے نہیں دیکھا۔ اس نے محض تاثیر کا رخ اضطراری دیکھ کر وحدت اثر کا حکم لگایا اور تاثیر کا رخ اختیاری پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بس اسی طرح برابر عقل غلطیاں کرتی رہی ہے۔ لیکن خالق جہات کے سامنے کل جہات متحقق ہیں۔ بیک لحظ اس کے سامنے موجود ہیں۔ اس لئے جو احکام وہ لگائے گا وہ جملہ جہات کے پیش نظر

ہوں گے۔ اور وہ جہات نبی کو دکھاتا ہے اور اسی کے مطابق نبی حکم کرتا ہے۔
ما حکم بین الناس بالحق بما اراک اللہ لوگوں کو صحیح فیصلہ بتا۔ جو اللہ نے تجھے دکھایا
ہے یعنی اللہ تعالےٰ تمام جہات نبی کو دکھاتا ہے۔ یعنی جو خود دیکھتا ہے وہی دکھاتا
ہے۔ لہذا نبی کے فیصلے کُل کے کُل حق ہوتے ہیں۔ اور صحیح ہوتے ہیں اور عقل کا فیصلہ
غلط ہوتا ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے صحیح بھی ہو جاتا ہے تو وہ وہی ہوتا ہے جو نبی کے
فیصلہ پر منطبق ہو جاتا ہے۔ لہذا مبادی حقیقت آرا، باری تعالےٰ ہے جو خصلت
انبیاء ہے۔ غور کرو۔

شبہات نبوّت (الف)

مختلف فرقے کیا کہتے ہیں۔ وہ میں نے بیان کردئے اور ان کا رد کردیا ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ شریعت ایسے افعال پر مشتمل ہے جن میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ جیسے اعمال حج میں کنکری پھینکنا۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا وغیرہ یہ جتنے اعمال ہیں سب عبث ہیں۔ ان میں کوئی مصلحت نہیں ہے یا مثلاً روزہ ہے آخر رمضان کا روزہ اور عید کا دن دونوں آپس میں ملے ہوتے ہیں تو یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ پہلے دن کا روزہ فرض اور دوسرے دن کا حرام۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ اور خدا حکیم ہے۔ تو یہ اس کی شان کے خلاف ہے کہ ایک عبث فعل کا حکم کرے۔ لہٰذا شریعت باطل ہے اور جب شریعت غیر ضروری ہوگئی تو شارع بدرجہ اولیٰ عبث اور باطل ہوا اس لئے خدا نے نبی کو نہیں بھیجا یہ ان کے دلیل کی تقریر ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بات عقل میں نہیں آتی کہ خدا فعل عبث کا حکم کرے۔ مگر اس کا رد ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قاعدہ میں اگر بات کا جواب دیا جائے تو بہت سہولت ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عبث فعل سے پاک ہے اور شریعت عبث افعال پر مشتمل ہے تو شریعت خدا نے حکم نہیں کی۔ جب شریعت نہ رہی تو شارع کی ضرورت نہیں رہی۔ تو یہ شبہہ عقل کی تحسین پر مشتمل ہے یعنی عقل جس کو اچھا کہے وہ ہونی چاہئے اور عقل جس کو بُرا کہے یا اچھا نہ کہے وہ نہ ہونی چاہئے اور یہی ساری گمراہیوں کا اصل سبب ہے (میں اس سلسلے میں ایک رسالہ لکھ رہا

تھا اور ایک ہی دن لکھا تھا کہ مولوی منتخب الحق صاحب تشریف لائے بہت دیر بیٹھے رہے اور وہ رسالہ دیکھنے کے لئے لے گئے) اس بدعت کا پہلا موجد لعین اول ہے اسی نے یہ بدعت ایجاد کی ہے کہ جو بات عقل میں آئے وہ ہونی چاہئے اور جو عقل میں نہ آئے وہ نہیں ہونی چاہیئے اس نے پہلی مرتبہ یہ بات کہی کہ حکم الٰہی عقل کے تابع ہونا چاہیئے۔ اپنے شاگردوں کو بھی اس نے یہی بات سکھلائی۔ چنانچہ عقیدہ کی جتنی گمراہیاں ہیں اس کی بناء یہی شبہ ہے اور عمل کی جتنی گمراہیاں ہیں ان کا سبب شہوت اور غضب ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ افضل کو مسجود ہونا چاہیئے۔ میں چونکہ بہتر مادہ سے بنا ہوں۔ میں آدم سے افضل ہوں اور تونے حکم یہ دے دیا کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سجدہ کرے۔ یہ عقل کے خلاف ہے "انا خیر منہ" میں اس سے بہتر ہوں یہ فلاسفہ اور حکما کی جو جماعت ہے جن کو عاقل کہا جاتا ہے۔ وہ سب اسی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ کہ ہر شئے عقل کے مطابق ہونی چاہیئے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ دھوکے میں پڑ گئے۔ اور اس کے جاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کی بڑی جماعت فقہ میں مشغول رہی۔ اس طرف توجہ کم لوگوں نے دی۔ اس لیئے ان کی دھونس قائم ہو گئی

جیسے آپ نے دیکھا ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ آج سے پچاس برس پہلے انگریزکی دھونس لوگوں کے دلوں پر جمی ہوئی تھی کوئی (فوج کا انگریز سپاہی) گورا ملتا تھا۔ تو لوگ ہٹ جاتے تھے اور اس کو راستہ دے دیا کرتے تھے۔ مگر میں ارادتاً نہیں ہٹتا تھا تو وہ خود ہی ہٹ جایا کرتا تھا۔ اسی قسم کی دھونس ان فلسفیوں کی تھی۔ جو اہلِ تقویٰ اور علمائے فقہ پر جم گئی تھی۔ کیونکہ وہ ان چیزوں سے واقف نہیں تھے۔ ورنہ یہ بہت معمولی بات ہے کوئی چیز نہیں ہے۔ اب آپ غور سے سنیں تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

بہت باریک باتیں ہیں۔ کل فلسفیوں کا یہی عقیدہ ہے جو شیطان کا ہے یعنی عقل محکم ہو اور حکم کو پیدا کرے۔ حکم الٰہی عقل کے مطابق ہو حکم عقل کے مطابق نہ ہو تو وہ حکیم کا فعل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ شبہ ہے۔ یہ چیز اصل میں غلط ہے۔ وہ سمجھا ہی نہیں۔ اگر وہ سمجھ جاتا تو مردود نہ کہا جاتا۔ اس نے کہا " خلقتنی من نار و خلقتہ من طین " مجھے پیدا کیا آگ سے اور آدم کو پیدا کیا مٹی سے اور آگ مٹی سے بہتر ہے (یہ مقدمہ قرآن میں محذوف ہے)۔ اور جو شے بہتر سے بنائی جائے گی وہ بہتر ہوگی، اس شی سے جو کمتر اور بدتر سے بنائی جائے گی۔ لہٰذا میں آدم سے بہتر ہوں یہ ہے شیطان کی دلیل۔ اس میں غلطی کیا ہے غور کریں۔ حسن و قبیح۔ خیر و شر۔ اچھائی برائی یہ تابع ہیں ان چیزوں کے جن میں یہ ہیں اگر وہ شے ہوگی تو یہ ہوں گے۔ اگر وہ شے نہیں ہوگی تو یہ بھی نہیں ہوں گے۔ یہ اشیاء کی صفت اور فرع ہیں۔ پھول حسین ہے یہ حسن پھول کے تابع ہے پھول ہوگا تو حسن ہوگا۔ پھول نہ ہوگا تو حسین بھی نہ ہوگا۔ اور اشیا سب تابع ہیں حکم الٰہی کے۔ کیونکہ وہ امر کن سے پیدا ہوئیں۔ اذا ارد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی شے کو شیئت دینے کا یعنی پیدا کرنے کا تو وہ کہتا ہے کن 'ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے۔ تو ہو جانا 'ہو' کے کہنے کے تابع ہوا۔ فلسفیانہ طریقہ پر یوں سمجھ لیں کہ ایک شے بنی دوسری شے سے اور دوسری بنی تیسری شے سے۔ تو یہ سلسلہ لا انتہا جائے گا۔ مگر مرکب بنا مفردات سے تو مرکب کے لئے اوّل ہو گیا۔ دم کبات کا سلسلہ لا انتہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ مفردات اس سے پہلے ہیں۔ مفردات پہلے ہوں گے۔ تو اس کے بعد مرکبات بنیں گے۔ مثلاً مکان جب بنے گا جب مٹی چونا گارا

ہوگا۔ تو مکان مٹی کے تابع ہوا اور مٹی متبوع ہوئی۔ اسی طرح انسان مٹی سے بنا۔ انسان بھی مٹی کا تابع ہے۔ انسانی سلسلہ لا انتہا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا جو شے کسی شے سے بنے گی۔ اس کے لئے اول ہوگا)۔ اب ہر شے دوسری شے سے بنے گی۔ یہاں تک کہ ایسی شے آجائے گی جو کسی شے سے نہیں بنی۔ اب وہ کیسے بنی وہ امر کن سے بنے گی۔ تو پوری کائنات امر کن کے تابع ہوگئی اور کائنات میں اچھائی اور برائی ہے۔ تو سلسلہ یہ ہوا کہ کن کے تابع کائنات اور کائنات کے تابع اچھائی برائی۔ یعنی اچھائی برائی تیسرے درجہ پر آئی اور شیطان نے امر کو تابع کیا اچھائی برائی کا یعنی بالکل الٹا سمجھا یہ غلطی ہوئی اس سے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھا کہ اچھائی برائی امر کے تابع ہے اور اسی ناسمجھی کی وجہ سے وہ خارج ہوگیا۔ اس نے تکبر کیا یعنی وہ حقیقت میں بڑا نہیں تھا۔ مگر بڑا بنتا تھا۔ وہ واقف نہیں تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ وہ واقف ہے۔ یعنی اپنے جہل سے بھی ناواقف تھا۔ یعنی جہل مرکب تھا۔ اس لئے نکال دیا گیا۔ غلطی کی اصل وجہ آپ کے سمجھ میں آگئی اب غور کریں۔ یہاں غلطی کیا ہے۔

جو قوت انسانی اچھائی برائی میں تمیز کرتی ہے۔ اس کو عقل کہتے ہیں۔ یہ غیر فطری شے ہے۔ اگر عقل فطری چیز ہوتی تو بچہ ماں کا دودھ چھوڑ کر کنکر منہ میں نہ رکھتا۔ یہ تمیز اس کو بعد میں آتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اختیار تو فطری شے ہے کہ وہ دودھ اور کنکر دونوں کو منہ میں رکھ سکتا ہے۔ خیر و شر، مفید اور مضر اچھائی اور برائی۔ حلال و حرام۔ نیکی و بدی دونوں پر اختیار ہے۔ مگر تمیز بعد میں آتی ہے۔ اسی تمیز کا نام عقل ہے۔ عقل بعد میں آئی اختیار پہلے آیا۔ پہلے آنے والا بعد کے آنے والے کے تابع نہیں ہو سکتا۔ ہاں بعد کا آنے والا پہلے آنے والے کا تابع ہوگا۔ پہلے کائنات

پھر انسان۔ پھر عقل آئی۔ تو کائنات عقل کے تابع نہیں ہو سکتی بلکہ عقل کو کائنات کے تابع ہونا چاہئے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ تمیز باپ نے سکھلائی لیکن ہر باپ پہلے ایسا ہی تھا انھوں نے اسی طرح اپنے باپ سے تمیز سیکھی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا باپ آئے گا۔ جس نے کسی باپ سے تمیز نہیں سیکھی۔ مگر اپنی اولاد کو بغیر کسی باپ سے سیکھے سکھائی یہی باپ نبی ہے۔ ایک انسان نے کسی انسان سے تمیز نہیں سیکھی۔ مگر سب انسانوں کو سکھائی۔ اسی کا نام نبوت ہے۔ اب دیکھئے ان لوگوں سے کیسی حماقت ہوئی اور یہ اس کو نہیں سمجھے۔

عقل کا تقاضہ کیا ہے۔ عقل چاہتی ہے حسن انجام۔ اگر کسی فعل میں فوری فائدہ ہو مگر یہ معلوم ہو کہ اس کا انجام خراب ہے تو کوئی عقلمند آدمی اس فعل کو اختیار نہیں کرے گا۔ مثلاً ایک آدمی گھر میں رات کو دیر سے داخل ہوتا ہے۔ اور سب گھر والے سو رہے ہیں۔ اس کو سخت بھوک لگی ہے۔ وہ کھانا اٹھاتا ہے اور کھانا چاہتا ہے کہ کسی کی آنکھ کھل جاتی ہے اور یہ کہتا ہے کہ کیا کرتے ہو۔ یہ کھانا نہ کھانا اس میں کتا منہ ڈال گیا ہے۔ اب بازار بھی بند ہے۔ بھوک کی شدت تو چاہتی ہے کہ وہ کھانے کو کھالے مگر کیا کرے گا۔ بھوکا سو جائے گا کتے کا جھوٹا ہرگز نہیں کھائے گا۔ اگر وہ کھالے تو آپ اس کو کیا کہیں گے۔ مجنون اور بے عقل کہیں گے تو عقل حسن انجام چاہتی ہے۔ اور حس فوری حسن چاہتا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کا نام رائے ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ یعنی فوری حسن اور حسن انجام کے لحاظ سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ فوری حسن مثلاً مٹھائی جب تک نوکِ زبان پر ہے میٹھی ہے۔ ذرا آگے بڑھی اور بے کار ہوئی۔ اس کا پیٹ میں جانا اور اس کا براز بننا وغیرہ سب قبائح ہی قبائح ہیں

ایک آن کی لذت باقی سب قبیح۔ اسی طرح ہر لذت کو دیکھ لیں کہ تھوڑی اس میں آسائش ہوتی ہے اور زیادہ قباحت ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر شے میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ تو ایسی شے جس میں خیر زیادہ ہو شر کم ہو وہ اختیار کی جائے گی اور جس میں خیر کم ہو شر زیادہ ہو وہ ترک کی جائے گی اور جس شے کو حس چاہتا ہے اس میں خیر کم ہے اور شر زیادہ ہے۔ حس کی تو یہ حالت ہے۔ اب عقل کو لیجئے اس کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ عقل کیا چاہتی ہے۔ حسن انجام چاہتی ہے اور یہاں انجام کیا ہے" موت" جو اقبح القبائح ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے اور چوبیس گھنٹے انسان اس سے بچنے کی فکر کر رہا ہے۔ کھانا بھی اسی لئے کھا رہا ہے۔ پانی بھی اسی لئے پیتا ہے۔ کپڑے بھی اسی لئے پہنتا ہے کہ گرمی سردی سے جو قبیح اثرات ہوں وہ اس کو موت تک نہ لے جائیں۔ تو جو کام موت تک نہ لے جاتے اس کو آپ بے تکان کر لیتے ہیں اور جو موت تک لے جائے اسے ہرگز نہیں کریں گے مثلاً تھوڑی بلندی سے آپ دس مرتبہ کود جائیں گے۔ کیونکہ جانتے ہیں۔ اس سے موت واقع نہیں ہوگی۔ مگر ایسی بلندی سے جہاں سے موت یقینی ہو آپ ہرگز نہیں کودیں گے تو عقل حس سے بھی بدتر ہو گئی کہ وہ ایسی شے کے نہ ہونے کی خواہش کرتی ہے جس کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ حالت عقل کی ہے۔ حس خاصہ حیوانی اور عقل خاصہ انسانی ہے تو انسان بدرجہ اولیٰ حیوانات سے بہت زیادہ بدتر ہو گیا۔ عقل کے مطابق اگر واقعات ہوتے تو انجام موت نہ ہوتا اور خیر کثیر ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موت ضرور آئے گی۔ تکلیفیں ضرور آئیں گی۔ راحتیں اور آسائشیں اور خیر کم ہے۔ شر کی کثرت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ پوری زندگی اور

کائنات انسان کے عقل کے خلاف ہے۔ جب پوری کائنات عقل کے خلاف ہے۔ تو اب اس میں جو احکام ہیں وہ کیا ہیں؟ عمل نام ہے حرکت وسکون کا اور حرکت وسکون صفت ہے متحرک اور ساکن کی۔ جب متحرک اور ساکن خلاف عقل ہیں تو احکام بھی اگر خلاف عقل ہوں تو کیا تعجب کی بات ہے تو یہ کہنا کہ شریعت خلاف عقل ہے غلط ہے بلکہ یہاں پورا وجود کائنات خلاف عقل ہے۔ عقل کہتی ہے کہ پہلے بننا اور پھر بگڑ جانا یہ زیادہ بُرا ہے اس سے کہ بنے ہی نہیں۔ پیدا ہو کر مرجانا زیادہ بُرا ہے پیدا نہ ہونے سے۔ اب اس میں بھید کیا ہے۔ عقل صفت ہے انسان کی اور انسان آخر کائنات ہے۔ یعنی کل کائنات انسان سے مقدم ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کل کائنات انسان سے مقدم ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کل کائنات اس میں صرف ہو رہی ہے اور یہ کسی میں صرف نہیں ہو رہا ہے خلق لکم مافی الارض جمیعا زمین میں تمام اشیاء تمھارے لئے بنائیں سخر لکم مافی السموات والارض جمیعاً زمین و آسمان میں جتنی چیزیں سب تمھارے لئے مسخر کر دیں: جمیع کائنات تم میں صرف ہوگی اور تم کسی میں خرچ نہیں ہوگے۔ تو جملہ کائنات انسان سے پہلے ہوئی اور انسان سب کے بعد ہوا۔ اور عقل انسان کی صفت ہے یعنی یہ انسان کے بعد آئی۔ یعنی کل کائنات کے بعد آئی۔ تو بعد میں آنے والی شے کے پہلے آنے والی چیز کیسے تابع ہوگی بلکہ بعد میں آنے والی چیز تابع ہوگی۔ پہلے آنے والی چیزوں کے۔ یعنی عقل کل کائنات کے تابع ہوگی۔ کائنات عقل کے تابع نہیں ہو سکتی تو یہ سوچنا کہ شریعت عقل کے مطابق ہو غلط ہے بلکہ عقل کو شریعت کے مطابق ہونا چاہئے جب وجود کو جو عقل کے خلاف ہے تسلیم کر لیا۔ تو احکام کائنات

کو تسلیم کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ اپنی کیسی خراب صورت ہو کسی کو بُری نہیں معلوم ہوتی۔ اپنا بچہ کیسا ہی بدصورت ہو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو مٹھائی دیتا ہے مرتا ہے تو جائداد اس کے نام منتقل کر دیتا ہے۔ دوسرے کے خوب صورت بچے کو نہیں دیتا۔ جب اس پر راضی ہوا تو اس کو شریعت سے بھی راضی ہونا چاہیئے اور عقل کو شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مصلحت کے تحت حکم وہاں ہوتا ہے جہاں حاکم ناقص ہو۔ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے اور جو حاکم جلب منفعت اور دفع مضرت سے پاک ہے اس کا حکم مصلحت کے تابع نہیں ہوگا بلکہ مصلحت اس کے حکم کے تابع ہوگی ایک بات اور سمجھ لیں کہ اس کے باوجود اس کو حکیم کہا جاتا ہے۔ حکیم خدا کا نام ہے۔ وہ اس حکمت سے جو ہمارے یہاں رائج ہے اس سے مشتق نہیں ہے۔ ہمارے یہاں حکمت کا مفہوم یہ ہے کہ جس فعل میں فائدہ ہو اس کو حاصل کرو اور جس میں نقصان ہو اس سے بچو۔ یہ حکمت مفید ہے۔ اور وہ علی الاطلاق حکیم ہے۔ علی الاطلاق کے یہ معنی ہیں کہ صانع کی منشاء کے مطابق شے بن جائے۔ چنانچہ تمام افعال اس کی منشاء کے مطابق ہو رہے ہیں چاہے وہ فائدہ کے ہوں یا نقصان کے اس لئے وہ علی الاطلاق حکیم ہے۔ مثلاً ایک مالک مکان ہے وہ دیوار توڑنا چاہتا ہے حالانکہ عقل کا تقاضہ نہ توڑنا ہے مگر ہوگا وہی جو مالک چاہے گا جو اس کی مشیت ہے۔ خلاصہ یہ نکلا حکیم وہ ہے جس کے فعل پر اعتراض نہ ہو سکے۔ حکیم کی یہ تشریح کہ جس کا فعل محکم ہو غلط ہے۔ یہ کہیں جاری ہے کہیں نہیں۔ مثلاً مکڑی اور شہد کی مکھی۔ اس کا جالا بنانا اور اس کا چھتہ بنانا دونوں محکم فعل ہیں مگر ان کو حکیم نہیں کہتے۔ عقل چاہتی ہے

سب مال دار ہو جائیں۔ کسی کو دکھ نہ پہنچے کوئی بیمار نہ ہو۔ کوئی مرے نہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ واقعات عقل کے مطابق نہیں ہیں۔ تو شریعت جو ایک ننھا سا حصہ عاقل بالغ کے عمل کا ہے وہ کیسے عقل کے مطابق ہوگا۔ اگر واقعات عقل کے مطابق ہونے لگیں تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ کیونکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ کائنات ہو ہی نہیں۔ کیونکہ عقل کہتی ہے کہ سرے سے نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ پہلے ہو پھر فنا ہو جائے اولاد نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ ہو پھر مر جائے۔ غریب رہنا اس سے بہتر ہے کہ پہلے مال دار ہو اور پھر غریب ہو جاتے۔ اس لئے نبوت پر جو یہ اعتراض کیا گیا ہے یہ غلط ہے۔ اب دیکھئے کہ عقل تنہا ادراک کے لئے کافی نہیں ہے۔ عقل مستفہم ہے۔ وہ دریافت کرتی ہے یہ کیا ہے۔ کیسے ہے کیوں ہے۔ یہ طالب فہم ہے، استفہام میں 'سین' طلب کا ہے۔ اور طلب اس شے کی ہوتی ہے جو حاصل نہ ہو۔ عقل برابر طالب فہم ہے۔ سوال کرتی ہے۔ کہاں ہے۔ کب سے ہے۔ اگر عقل طالب فہم نہ ہوتی اور عارف ہوتی تو یہ سوالیہ الفاظ کسی زبان میں نہ ہوتے لہٰذا عقل عارف نہیں ہے۔ مگر عقل موجود ہے تو یا تو یہ بیکار ہے۔ یا باکار ہے۔

اگر بے کار ہے تو تمام کائنات سے بدتر ہو گیا۔ کیونکہ عقل کے بغیر جتنی کائنات ہے۔ سب اپنے مقصد پیدائش کو پورا کر رہی ہے۔ یعنی کامیاب ہے اور اپنی زندگی کا فاصلہ عبور کر رہی ہے مگر انسان عقل کا بوجھ لاد کر پورا کر رہا ہے۔ تو عبور کرنے میں تو دونوں برابر ہیں۔ وہ ہلکے جا رہے ہیں۔ یہ بوجھل جا رہا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ کالانعام بل هم اضل یہ چوپائے جیسا بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اب اگر عقل کارآمد ہے تو کس طرح کارآمد ہے۔ اپنی رائے پر تو اپنی رائے کا یہ عالم ہے

کہ رائے ہمیشہ شہوت کے ماتحت ہوگی یا غضب کے تحت ہوگی۔ شہوت اس قوت کو کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی شے حاصل کی جاتے۔ مثلاً بھوک لگی کھانے کی طلب ہوئی اب طلب کے حصول کی کوشش عقل کرے گی۔ دوسری قوت غضب ہے۔ غضب وہ قوت ہے جو حصول طلب میں جو شے حائل ہو۔ اس کی مدافعت کرے۔ عقل مدافعت کی کوشش کرے گی۔ تو عقل تابع ہوگی شہوت کے غضب کے ارادے کے اور یہ سب عقل سے نیچے کے درجات ہیں تو عقل گویا اپنے نیچے کے درجات کے تابع ہوئی اور اسی کا نام اپنی رائے ہے۔ شہوت مقصود حاصل کرنا اور غضب مقصود کے حاصل کرنے میں جو مخل ہو اس کو دفع کرنا جب شہوت و غضب متبوع اور عقل تابع ہوئی تو معاملہ معکوس ہوگیا۔ الٹا ہوگیا اور حیوانات سے بدتر انسان ہوگیا۔ اگر بے کار ہے تو غلط ہے۔ بے کار تو ہے نہیں۔ اگر اپنی رائے کے تابع ہوئی تو غلط ہوگئی۔ اپنے مماثل جو چیزیں ہیں۔ ان کے تابع ہوئی تو غلط ہوگئی۔ اور تابع ہونا۔ اس کا ضروری ہے تو یہ کس کے تابع ہوگی۔ اپنے خالق کے تابع ہوگی۔ اور کسی کے تابع نہیں ہوگی۔ عقل اپنی طرف سے جتنے کام کرے گی وہ سب غلط ہوں گے۔ کیونکہ یہ اپنی رائے سے جو ایجاد کرے گی مثلاً عقائد وہ سب شہوت کے تابع ہوں گے یا تو وہ عوارض کے متعلق غور کرے گی یا مقادیر کے متعلق غور کرے گی جن علوم میں غور کرے گی وہ یا تو حساب ہے یا عدد ہے یا روحانیت ہے یا منطق ہے تو حساب تو لین دین میں ضروری ہے اور جتنے حیوانات ہیں وہ سب بغیر تبادلہ کے زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا زندگی گزارنے کے لئے تبادلہ کی ضرورت نہیں ہے بغیر تبادلہ کے زندگی گزر سکتی ہے اس کا دوسرا حصہ ریاضی ہے اس کی ضرورت مکان بنانے

اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں ہوتی ہے۔ مگر حیوانات میں انسان ایسا ہے جیسے بحر میں ایک قطرہ جب وہ سب بغیر انجنیئرنگ کے گذارہ کر رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ زندگی گذارنے میں اس کی بھی ضرورت نہیں ہے اس کے علاوہ جتنے بھی علوم ہیں وہ سب انسانی زندگی میں دخیل ہیں اور ان کے بغیر زندگی گزر سکتی تھی اب رہے روحانی علوم ان میں فلسفہ، معرفت، الہٰیات شامل ہیں اور یہ بھی سب غلط ہیں۔ فلاسفہ، حکماء، اہل معرفت سب کو دھوکا لگا ہے۔ جو مادی اشیاء ہیں ان ہی کی حقیقت کا اب تک پتہ نہیں لگ سکا ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کیا معلوم ہوگی جو سرے سے حس میں نہیں آتیں۔ جب حسی چیزوں کا صحیح حال معلوم نہیں تو غیر حسی چیزوں کا حال کیا معلوم ہوگا یہ فلسفہ اور الہٰیات کا جتنا علم ہے وہ سب پریشان خیالوں کا مجموعہ ہے۔ حقیقت سے اس کو کچھ بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اور آلۂ علم جس کو منطق کہتے ہیں وہ جزئیات سے نہیں بلکہ کلیات سے بحث کرتی ہے واقعات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ واقعات کی حکایتیں دفاع میں آیا کرتی ہیں منطقی.... ان میں جوڑ توڑ کیا کرتا ہے یہ صرف دھوکا ہے۔

حکایت، واقعہ کی تصویر ہوا کرتی ہے مثلاً آپ کسی کی تصویر کھینچیں تو یہ تصویر ذی تصویر کی حکایت ہوگی اور اس تصویر کا ذی تصویر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی طرح واقعہ کی تصویر ذہن میں آیا کرتی ہے اور اس تصویر کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ ایسی بات ہے جیسے بچہ کو تصویر دے کر بہلا دیا جائے ذی تصویر سے اس کا کوئی علاقہ نہیں لہٰذا منطق بھی غلط ہے تو فلسفیوں کے جتنے علوم ہیں وہ سب غلط ہیں یا کچھ صحیح ہیں اور وہ صرف اس زندگی میں دخیل ہیں اور یہاں

ان کی ضرورت نہیں ہے نتیجہ یہ نکلا کہ یا تو یہ غلط ہیں یا غیر ضروری تو عقل کا ہونا غلط ہو گیا لیکن خدا نے عقل کو پیدا کیا ہے اور خدا کی تخلیق باطل نہیں ہے۔ اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا" تو عقل کا ضرور کوئی کام ہے اور وہ کام کیا ہے جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اس کام آتی ہے اور اس کام میں صرف ہوتی ہے تو اس کا وجود صحیح ہے ورنہ بیکار ہے۔ اور جو حرکات ہیں یعنی حرکت و سکون یعنی ایک چیز کو چھوڑنا دوسرے چیز میں پہنچنا حرکت اور ایک جگہ کو نہ چھوڑنا بلکہ اسی چیز میں رہنا سکون کہلاتا ہے۔ ان حرکتوں کا انجام نہ محسوس ہیں نہ معقول ہیں حسی مقاصد جو ہیں وہ تو محسوس ہیں لیکن عقل کے مقاصد حسی نہیں ہیں اور عقل اور مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس زندگی میں حرکت بھی کرنی پڑے گی اور سکون بھی کرنا پڑے گا. اور عقلی حرکت سکون دونوں کے انجام اس جہاں میں موجود نہیں ہیں۔ تو وہ خود کو معلوم و محسوس نہیں ہو سکتا۔ تو جس کے سامنے وہ نتیجہ ہے وہ بتلائے گا کہ ان حرکات و سکون کا کیا نتیجہ ہے۔ اور وہ ذات خالق ہے جس کے سامنے وہ نتائج ہیں۔ اس لئے صرف خدا ہی اس کے نتائج سے آگاہ کر سکتا ہے اب خالق براہ راست خود نہیں بتا سکتا، کیونکہ اس کے بتاتے ہی اختیار ختم ہو جائے گا. اور اختیار ہی اصل انسان ہے تو لامحالہ ایسی صورت اختیار کی جائے گی کہ انسان کا اختیار اور انسانیت باقی رہے. اور وہ اسی صورت میں ہے کہ اس کا آدمی آکر بتائے۔ یہی آدمی نبی ہے۔ اس لئے یہ اعتراض غلط ہے اور نبوت حق ہے۔ آگ کو بتایا کہ تجھے گرم رہنا اور جلانا ہے۔ وہ اس کے خلاف ہرگز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح اگر انسان کو وہ براہ راست بتائے گا تو سب انسان

ایک حالت پر ہو جائیں گے۔ اختیار ختم ہو جائے گا اور انسان مجبور ہو جائے گا تو تعلیم صرف انسان ہی کر سکتا ہے اور وہ انسان نبی ہے ۔ اس لئے نبی کی اطاعت عین حکم الہٰی کی اطاعت ہے ۔ اور نبی نمونہ ہے تو اس کی سنت کے جس قدر مطابقت کرے گا۔ اتنی ہی راحت پائے گا۔ نیکی کرے گا تو راحت پائے گا بلکہ مطابقت ہی راحت ہے۔ نیکی کرے گا تو راحت پائے گا یہ نہیں ہے ۔ بلکہ نیکی کرنا ہی راحت ہے۔ بدی کرے گا تو دکھ اٹھائے گا یہ نہیں ہے بلکہ بدی کرنا ہی دکھ اٹھانا ہے مگر پردہ حائل ہے۔ اس کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا پردہ اٹھتے ہی سب نظر آنے لگے گا جس طرح کلوروفارم کے اثر میں تکلیف ہوتی ہے مگر محسوس نہیں کرتا ۔ مگر کلوروفارم کا اثر زائل ہوتے ہی تکلیف کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ تو یہ بدن کا کلوروفارم حاجب ہے محسوس نہیں ہونے دیتا حالانکہ نیکی کرنے کی خوشی اب بھی آپ کو ہو رہی ہے بدی کرنے کی تکلیف اب بھی آپ کو ہو رہی ہے تو بدن انسانی نفس انسانی کو راحتوں اور مضرتوں کے ادراک سے روک رہا ہے۔ لبعض اوقات ریاضتوں سے یہ پردہ کسی قدر اُٹھ جاتا ہے تو یہاں بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب پردہ اُٹھ جائے گا تو وہ وقت حسرت و افسوس کا ہو گا۔ جس طرح ایک باپ اپنے بچے کو منع کرے کہ سانپ کو نہ پکڑ یو یہ ڈس لے گا۔ وہ نہ مانے اور پکڑ لے اور سانپ اسے ڈس لے پھر وہ چیخے کہ باپ مجھے سانپ نے ڈس لیا تو باپ کہے گا کہ اب کیا فائدہ اب تو خمیازہ بھگتنا ہی ہو گا۔ اس سے مفر نہیں ہے۔ وہ عمل کا وقت نہیں ہے جزا کا وقت ہے۔ عمل کا وقت وہ ہے جب تک اس کو یہ شعور ہے کہ یہ میں کر رہا ہوں ۔ یہ میرا فعل ہے جب یہ شعور ختم ہو گیا تکلیف ختم ہو جاتی ہے جزا کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

نبی کی اتباع کرنی چاہئے۔ عبادت، ریاضت، معرفت یہ سب کوئی چیز نہیں ہے

یہ صرف اصطلاحی باتیں ہیں۔ یا ان میں تاویل کی جائے گی۔ صرف نبی کا اتباع کرنا چاہیئے نبی کی تتبع میں دوپہر کا قیلولہ کرنے کے مقابلے میں اپنی رائے سے رات بھر عبادت کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ نبی کی تتبع میں نفس پرستی کرنی راحت ہے ثواب ہے مفید ہے۔ اپنی رائے سے ریاضت کرنی خودکشی ہے موت ہے بے کار ہے۔ یہ بڑی مفید باتیں ہیں جو میں نے بتائی ہیں۔ مگر میری مثال ایسی ہے جیسے پارس پتھر کہ جو اس سے چھو جائے وہ تو سونا بن جاتا ہے۔ مگر وہ خود پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔ عمل کرنا چاہیئے کہنے والا اگر عمل نہ کرے تو بے کار اور سننے والا عمل نہ کرے تو بے کار اب آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

شبہات نبوّت (ب)

اہل شبہ کی یہ دلیل کہ عقل سے جس شے کی اچھائی ہم کو معلوم ہے اس کو اختیار کرلیا۔ جس شے کی بُرائی ہم کو عقل سے معلوم ہے اس کو ہم نے ترک کر دیا اور جس شے کی اچھائی بُرائی دونوں معلوم نہیں ہیں ان کو ہم نے اشد ضرورت کے تحت اختیار کرلیا۔ مجبوراً کہ اگر اختیار نہ کرتے تو بے قراری رہتی۔ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو ایسی شے کو ہم نے چھوڑ دیا کہ ایسا نہ ہو اس کے کرنے سے ہم کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ یہ اہلِ عقل کی دلیل ہے کہ نبوت کی ضرورت نہیں عقل کافی ہے۔ ہمارے علماء نے یہ جواب دیا کہ عقل کا یہ علم اچھائی اور بُرائی کا اجمالی ہے تفصیلی نہیں ہے۔ نبی اس کی تفصیل بتلاتا ہے۔ ان کی تعادیر تعداد اور مقداریں بیان کرتا ہے۔ جو عقل کو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بھی اور جو عقل کو بُری معلوم ہوتی ہیں ان کی بھی دونوں کی تفصیل بتلاتا ہے۔ اس لئے نبی

کی ضرورت ہے۔ یہ جواب متفقہ ہے مگر میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ کیونکہ اس
جواب میں یہ خرابی ہے کہ اجمالی علم نجات کے لئے کافی ہے۔ تفصیلی علم دین کا تو
صحابہ کو بھی نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے دریافت کرتے تھے۔ اس کے بعد بھی چند بندگان
خدا کو چھوڑ کر کسی مسلمان کو بھی دین کی تفصیلی معرفت نہیں ہے۔ آج بھی پوری دنیائے اسلام
میں دو چار سے زیادہ اشخاص کو دین کا تفصیلی علم نہیں ہوگا۔ لیکن مسلمان سب ناجی ہیں۔
عقیدہ میں اجمالی علم کی تصدیق کافی ہے وہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ تفصیلی علم کی
ضرورت نہیں۔ اگر عقل سے اجمالی علم خدا کی معرفت کا ہو جائے اور اجمالی طور پر علم
شریعت کا عقل سے ہو جائے تو نجات ابدی کے لئے یہ اجمالی تصدیق کافی ہے۔
نبوت کے تفصیلی علم کی حاجت نہیں رہتی۔ مگر توحید مستقل طور پر نجات کے لئے کافی
نہیں ہے بلکہ نبوت کی تصدیق اجمالی طور پر نجات کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ توحید ضمنی ہے
اور نبوت کے اندر شامل ہے۔ کیونکہ بہت سی غیر مسلم جماعتیں توحید کی قائل ہیں۔ مثلاً
یہودی برا ہمہ وغیرہ اور اس کے باوجود وہ ناجی نہیں ہیں۔ اس لئے مستقل توحید
حجت نہیں ہے۔ اسلام توحید کا علم بردار ہے۔ یہ کہنا غلط ہے توحید کی علم بردار اسلام
کے علاوہ اور جماعتیں بھی ہیں۔ اسلام اصل میں رسالت کا علم بردار ہے۔ توحید کی تصدیق
کے بعد نبوت کی تصدیق کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ مگر نبوت کی تصدیق کے
بعد توحید کی تصدیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس طرح وضو کے بعد غسل کی ضرورت
باقی رہتی ہے اور غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو نسبت وضو کو غسل سے
ہے وہی نسبت توحید کو رسالت سے ہے۔ محمد رسول اللہ کے کہنے سے اگر توحید کی
تصدیق کرے گا تو مفید ہوگی ورنہ اپنی عقل سے یا دیگر اشیاء کے کہنے سے بھی اس

وقت اگر توحید کی تصدیق کرے گا تو بے کار ہے۔ اعتقادیات اور شرائع میں نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ معاملات میں بھی مثلاً سچ اچھی چیز ہے۔ اگر نبی کے کہنے سے اور اس کی پیروی میں اگر سچ بولا تو مفید ہوگا اگر اپنی عقل اور رائے سے سچ کہا تو وہ مفید نہیں ہے سراب ہے۔ وہ ذریعہ نجات نہ ہوگا۔ عقل سے نبی کی بات کو قوت ضرور مل جائے گی. مگر نجات کے لئے مفید نہیں ہے۔

عیسٰی روح اللہ کی تصدیق اگر اس بناء پر کی جائے کہ رسول اکرم نے اس کی تصدیق کی تو یہ جزو ایمان ہے۔ اگر اپنی عقل سے تصدیق کرے گا تو وہ ایمان نہیں ہے۔ بلکہ وہ کفر ہی رہے گا جیسے عیسائی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کافر ہی ہیں۔ اسی طرح کرشن جی کی تصدیق حضور نے نہیں فرمائی تو ان کو نبی کہیں یا نہ کہیں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن ایک اور دلیل سے یہ ثابت ہے کہ وہ نبی نہیں ہیں کیونکہ جتنے انبیاء آئے انہوں نے عاقبت کی تصدیق کی اور آواگون کا ذکر کسی نبی نے نہیں کیا۔ ان کی کتاب گیتا میں عاقبت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ آواگون کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی کتاب صحیفہ آسمانی نہیں ہے۔ بلکہ حکمت کی کتاب ہے. اس لئے یہ نبی نہیں ہوسکتے۔ تو تمام ایمانی اعتقادی اور شرعی مقدمات نبی کے کہے بغیر معتبر نہیں ہیں۔ نبی کو اذیت دینے والا اگر بھوکا مر رہا ہو اور اس کو آپ کھانا کھلا دیں تو یہ کفر ہے۔ ماں باپ کو اذیت دینے والا بھوکا مر رہا ہو۔ اس کو کھانا کھلانا گناہ ہے۔ نبی کے کہنے سے اگر کھانا کھلا دیا تو یہ مفید ہے۔ کارآمد ہے۔ وہ سچ جس کو بولنے کی اجازت نبی نے دی ہے وہ مفید ہے اور جس سچ کے بولنے سے نبی نے منع فرمایا وہ مضر ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنے باپ کے ذکر کی طرف اشارہ کرکے کہے

کہ اس نے میری ماں کے ساتھ یہ عمل کیا تو یہ کہتے ہی وہ عاق ہو گیا۔ نبی کی جان اگر سچ بولنے سے جاتی ہو اور سچ بولا تو کافر ہو گیا۔ ایسے موقع پر جھوٹ بولنا فرض ہے۔ اور باعث نجات ہے۔ نبی سے آگے آگے چلنا یا نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کرنا منع ہے کہ اگر ایسا کرے گا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

مگر سامنے سے نبی پر کوئی حملہ کرے۔ نجاست پھینکے تو فوراً نبی کے سامنے آکر نبی کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ یا آواز پہچان کر دشمن حملہ کرے گا اور نبی کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت اپنی آواز کو بلند کرنا تاکہ نبی کی آواز دب جائے اور دشمن نبی کی آواز نہ پا سکے، فرض ہے۔ عین باعث نجات ہے۔ لہٰذا نبی کا احترام بہر حال اور بہر صورت فرض اور باعث نجات ابدی ہے۔ اسی بنا پر نبی کی نماز جنازہ ادا نہیں کی گئی کہ نماز کی دعاؤں میں نبی کی بے ادبی ہوتی تھی۔ صرف صلوٰۃ سلام پڑھ کر لوگ چلے آتے تھے۔ فرمایا نبی کی بے ادبی مت کرو یہ کس سے فرمایا ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ سے ہم تم کس گنتی میں ہیں۔

اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔ ورنہ تمہارے اعمال تباہ ہو جائیں گے۔ اور تم کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ کوئی عمل کوئی اعتقاد قابل قبول نہیں ہے جب تک نبی اس کی تصدیق نہ کر دے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں سب بے کار اور سراب ہے۔ تو عقل سے کوئی بات سمجھ میں آجائے۔ کہ یہ اچھی ہے اور یہ بُری ہے۔ تب بھی اس کا کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اب آپ اصولی بات سمجھ لیں۔

عقل سے یہ بات ہرگز نہیں معلوم ہو سکتی کہ خدا کا مقصد اس کام کو کرانا ہے اور اس کام سے روکنا ہے۔ اگر عقل سے معلوم ہوتا تو بداہتاً معلوم ہو جاتا یعنی بغیر

غور و فکر معلوم ہو جاتا جیسے ہمیں یہ معلوم ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ تو اس وقت سارا عالم اس پر متفق ہو جاتا ہے۔ مگر سارا عالم متفق نہیں ہے۔ اور اگر غور و فکر سے معلوم ہو جاتا تو جتنے غور و فکر کرنے والے ہیں سب متفق ہو جاتے مگر وحدانیت پر اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف ہے تو معلوم ہوا کہ غور و فکر سے بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جس طرح غور سے یہ معلوم ہوا کہ دو نقطوں کے درمیان جو سب سے چھوٹا خط کھینچا جا سکتا ہے۔ وہ خط مستقیم ہے اس پر کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اس کو سب مانتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وحدانیت کو بھی تسلیم کر لیتے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ یہ بدیہی ہے اور نہ نظری ہے۔ نہ حس سے معلوم ہو گی۔ نہ عقل سے معلوم ہو گی تو پھر سماعت سے ہی معلوم ہو گی۔ مخبر صادق خبر دے گا اور اس پر اعتبار کر کے اس کو قبول کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک برہان قہار ہے کہ اگر عقل تلاش کر سکتی اور کافی ہوتی تو عقل استفہام نہ کرتی۔ استفہام میں ’س‘ طلب کا ہے باب استفعال کا یہ قاعدہ ہے کہ اس میں سین طلب کا ہوتا ہے استفہام کے لغوی معنی ہوئے ’طلب فہم‘ اور طلب بغیر حاجت کے ہو نہیں سکتی۔ حاجت حرکت کا سبب اول ہوتا ہے۔ اور اسی حرکت کا نام طلب ہے تو عقل فہم طلب کر رہی ہے۔ یہ کیا ہے۔ کیوں ہے۔ کہاں ہے۔ اگر عقل کافی ہوتی تو کیا اور کیوں نہ کرتی۔ تو معلوم ہوا کہ عقل محتاج فہم ہے۔ تو ایک معلم ہونا چاہئے۔ جو عقل کے سوالات کا جواب دے۔ اور اس کو علم اور فہم دے۔ اسی معلم کا نام نبی ہے۔ یہ بڑا حسین طریقہ ہے اور میرا ایجاد ہے۔ ایک بچہ کے پیچھے سے چٹکی لی جائے تو فوراً مڑ کر دیکھے گا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ اس فعل کا کرنے والا کوئی ہے اور فریاد کرے گا کہ سننے والا انصاف کرے۔ انصاف

کاطالب ہوگا۔ اسی طرح عقل انصاف کی طالب ہے۔ تو انصاف دینے والا ہونا چاہیئے وہ عام انسانوں سے ماوراء ہوگا۔ وہ نبی ہوگا۔ اب یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ نبی بھی انسان ہوگا۔ غیر انسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ جتنی کائنات ہے۔ اور خود خالق کائنات دونوں میں سے کوئی معلم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر خالق معلم ہوگا تو اس کے دو ہی طریقے ہیں کہ یا تو دل میں بات ڈال دے جیسے ہر شخص کے دل میں ڈال دیا کہ ایک اور دو تین ہوتے ہیں۔ یعنی بدیہی علم دے دے یا سامنے آکر کہے کہ میں خدا ہوں۔ تمھارا خالق ہوں تم یہ کام کرو اور یہ نہ کرو تو اگر دل میں ڈال دے تو سارا مذہب بدیہی ہوجائے گا۔ اور سارا عالم متفق ہوجائے گا۔ اور اگر سامنے آکر کہے گا تو اس کی ہیبت اور جبروت ایسی ہوگی کہ وہ اس کے ماننے پہ مجبور ہوجائے گا۔ اور سارا عالم متفق ہوجائے گا۔ دونوں صورت میں اختیار جاتا رہے گا۔ خالق کا تو یہ حال ہے۔ اب رہی کائنات تو فرشتے چاند سورج زمین آسمان شجر و حجر لیل و نہار اگر یہ سب بولنے لگیں کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو کس کی مجال جو انکار کرے لہٰذا نہ خدا معلم ہوسکتا ہے اور نہ اس کے عملے یعنی کائنات میں سے کوئی ہوسکتا ہے ورنہ اختیار نہ رہے گا۔ مگر معلم ہونا ضروری ہے۔ جو عقل کو علم و فہم دے تو وہ معلم ایسا ہوگا جس کے بتانے کے بعد اختیار باقی رہے اور سننے والا سننے کے بعد چاہے انکار کرے چاہے اختیار کرے تو ایسا معلم انسانوں میں سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہی معلم انسان نبی ہے۔ یہ دلیل بہت واضح ہے کہ معلم عقل انسان ہی ہوگا انسان کے علاوہ نہ خالق ہوگا اور نہ کوئی دوسری مخلوق انسان کے علاوہ ہوگی۔ تاکہ وہ اقرار بھی کرسکے اور انکار بھی تب ہی تو لائق حمد و ستائش اور جزا ہوگا۔ ورنہ مجبوری میں اگر اقرار کیا تو موجب جزا کہاں ہوگا۔

ایک باپ اپنے بیٹے کو سمجھائے کہ سانپ نہ پکڑنا ورنہ کاٹے گا زہر چڑھ جائے گا اور ہلاک ہوجائے گا۔ اب وہ نہ مانے اور سانپ اس کو ڈس لے پھر وہ چلائے کہ باپ میں تیرا کہنا مانوں گا تو اس سے کیا فائدہ اب تو زہر چڑھ چکا۔ مشاہدہ ہوگیا۔ مشاہدہ کے بعد جس طرح یہاں فائدہ نہیں اسی طرح مشاہدہ کے بعد ایمان بھی معتبر نہیں ہے۔ خواہ اس عالم میں ہو خواہ عالم نزع میں ہو۔ کافر کہتے تھے کہ فرشتے آکر کیوں تعلیم نہیں دیتے۔ تو وہ کیسے آئیں گے۔ اگر اپنی اصلی حالت میں آکر کہیں گے تو مجبور ہوجاؤ گے۔ اگر انسان بن کر آئیں گے تو جس طرح اس انسان کا انکار کرتے ہو اس کا بھی انکار کروگے۔

اب اس بات کو فلسفیانہ طریقے سے سمجھیں کہ عمل نام ہے حرکت و سکون کا۔ جو کام آپ کریں گے۔ یا حرکت ہوگا۔ یا سکون ہوگا۔ یا دونوں کا مجموعہ ہوگا۔ ایک جسم کا اپنے حیز کو چھوڑ کر دوسرے حیز میں جانا حرکت اور جسم کا اپنے حیز کو نہ چھوڑنا اور اسی حیز میں رہنا سکون کہلاتا ہے۔ ایک حیز کو چھوڑ کر دوسرے حیز میں جانا اور وہاں سے تیسرے حیز میں جانا یہ دونوں انتقال یکساں ہیں۔ ان دونوں حرکتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی اس کے اجزا ماہیت میں متحد ہیں اور ان کی حقیقت ایک ہی ہے۔ ان میں فرق نہیں ہے۔ حسن و قبح دونوں الگ الگ شے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ تو حرکت تو شے واحد ہے اور اچھائی و برائی یہ دونوں چیزیں ہیں مختلف۔ مختلف چیزیں متحد چیز کی صفت نہیں ہوسکتیں۔ یعنی ایک چیز بیک وقت گرم بھی ہو اور سرد بھی یہ ممکن نہیں ہے۔ حرکت میں کہیں یہ گنجائش نہیں ہے۔ جس سے یہ پتہ چل جائے کہ یہ اچھی ہے اور یہ بری ہے۔ جہاں جاکر حرکت ٹھہرے گی اس کو جہت کہتے ہیں وہ اس حرکت کا مقصد یا انجام ہے تو متحرک کی اچھائی برائی اس جہت اعتبار سے ہوگی۔ اگر انجام

اچھا ہے تو حرکت اچھی کہلائے گی اور اگر انجام بُرا ہو گا تو حرکت بُری کہلائے گی۔ نفس حرکت میں کوئی اچھائی یا بُرائی نہیں ہے۔ نقب لگا کر داخل ہونے اور نماز میں سجدہ کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جگہ سر کو جھکایا جاتا ہے۔ مگر دونوں کی جہت مختلف ہے۔ اس لئے ایک حرکت اچھی ہے ایک بُری ہے۔ تو حسن و قبح نفس حرکت میں نہیں ہے۔ بلکہ جہت میں ہے اور حس و حرکت آخر سانس تک ہے کیونکہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے آگے موت کا پل ہے۔ اس کے آگے جہت ہے۔ وہ جہت یہاں سے نظر نہیں آتی تو مرنے کے بعد کیا اچھا نتیجہ ہو گا۔ اور کیا بُرا نتیجہ ہو گا۔ نہ یہ حس سے معلوم ہو سکتا ہے نہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا فعل کا حسن و قبح عقل سے قطعی معلوم نہیں ہو سکتا۔ ناممکن اور محال ہے۔ تو عقل بے کار ہو گئی مگر عقل بے کار بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر عقل بے کار ہو گی تو انسان حیوان کے برابر بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا اور اگر باکار ہو گی۔ تو سب ایک حالت پر ہو جائیں گے۔ اور دونوں باتیں نہیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ عقل محاکم ہے۔ محاکِم نہیں ہے خود حکم کرنے کے لائق نہیں ہے۔ یعنی وہ خطاب ربانی سنے گی اور اس پر عمل کرے گی۔ نہ وہ اس قابل ہے کہ وہ ضائع جائے نہ اس قابل ہے کہ وہ براہ راست خود حاکم ہو۔ وہ حاکم بننے کے قابل نہیں ہے۔ اور اختیار شروع سے لے کر آخر تک بچپن سے لے کر آخر عمر تک موجود ہے۔ بچے کے لئے کنکر حرام ہے۔ دودھ حلال ہے۔ بچے کو دونوں پر اختیار ہے بچے کو کنکر پر بھی اختیار ہے۔ دودھ پر بھی اختیار ہے۔ جو چاہے منہ میں رکھ لے۔ مگر اس کو تمیز حلال و حرام نہیں ہے۔ تو اختیار تو فطرت میں ہے مگر تمیز فطرت میں نہیں ہے۔ یہ باہر سے آئی ہے۔ اور جہاں سے آئی ہے وہی نبوت ہے۔ اگر کہو کہ تمیز ماں باپ نے

دی تو ان کو تمیز کس نے دی وہ بھی پہلے ایسے ہی تھے یہ سلسلہ چلتے چلتے ایسے باپ پر ختم ہوگا۔ جس نے کسی باپ سے تمیز نہیں سیکھی، وہی نبی ہے۔ اگر ختم نہیں ہوگا تو یہ سلسلہ لاانتہا جائے گا اور وہ جا نہیں سکتا کیونکہ ہر باپ یہ سمجھتا رہا ہے کہ زمین اس سے پہلے ہے اور جب کوئی شئے کسی شے سے پہلے ہو تو دوسری شے کے لئے اوّل ہوگا۔ تسلسل کے بطلان کی یہ دلیل کسی نے بیان نہیں کی۔ یہ دلیل میری ہی ایجاد ہے۔ نبیوں کا سلسلہ تو ہزاروں سال سے برابر چلا آرہا ہے۔ ایک نبی نے ایک بات بتائی۔ دوسرا نبی آیا اس نے جانی بات بھی بتائی۔ اور اس سے آگے کچھ اور بتائی۔ تیسرا آیا اس نے اور آگے بات بتائی یہاں تک کہ جو کچھ باتیں باقی رہی تھیں وہ خاتم النبیین نے آکر پوری کر دیں اور الیوم اکملت لکم دینکم آیت نازل ہوئی۔ تو افعال انجام نہ محسوس ہیں۔ نہ معقول ہیں۔ عقل خود سمجھ نہیں سکتی۔ اس کا درجہ محکومیت کا ہے اور اس لئے ہے جو کچھ سنے اس کو سمجھ لے۔ خود حاکم نہیں ہے۔ اس لئے شارع کی ضرورت ہے۔

شبہات نبوت (ج)

علم سے طبیعت کا لگاؤ ضروری اور مناسب ہے۔ اگر لگاؤ نہیں ہوگا تو سب بیکار ہے۔ یہاں بڑے علمی نکات بیان کئے گئے ہیں اور آج بھی بیان کئے جائیں گے اگر لگاؤ ہو تو ان کی قدر ہوگی اور مفید ثابت ہوں گے۔ ورنہ میرا کہنا اور آپ کا سننا دونوں بیکار ہیں۔ ایک جماعت اس کی تو قائل ہے کہ نبوت ہونی چاہیئے۔ اور معجزہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر یہ بات کہ ایک نبی آیا تھا اور اس نے معجزہ دکھایا۔ یہ خبر جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ معتبر اور قابل یقین نہیں ہے خبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ خبر جو ایک دو یا تین آدمی نقل کریں۔ اور برابر نقل ہوتی چلی آئے۔ اس کو خبر واحدہ کہتے ہیں۔ ایک خبر ایسی ہو کہ لوگ کہتے ہوں اور عام طور پر مشہور ہو مگر قابل یقین نہ ہو اس کو خبر مشہور کہتے ہیں۔ ایک خبر یہ ہوتی ہے کہ ایک گروہ مشاہدہ کرے اور وہ دوسروں کے سامنے بیان کرے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے سامنے برابر نقل کرتا چلا آئے۔ اور یہ اتنی بڑی جماعت ہو کہ جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ یہ خبر متواتر کہلاتی ہے اور یہ محسوسات میں معتبر ہے۔ غیر محسوس میں خبر متواتر معتبر نہیں ہے۔ ایک جم غفیر مشاہدہ کرے اور دوسروں کے سامنے نقل کرے اور اسی طرح دوسری جماعت تیسری جماعت کے سامنے نقل کرے اس طرح وہ ایک سے دوسرے کو نقل

ہوتی چلی آئے اور یہ تعداد گھٹے نہیں بلکہ بڑھے یا برابر رہے اور یہ اتنی بڑی تعداد ہو کہ اس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ یہ خبر متواتر کہلائے گی۔ مثلاً امریکہ ایک بڑی تعداد نے نہیں دیکھا لیکن سب کو یقین ہے کہ ایسا ملک ہے۔ یہ سب کو خبر متواتر کے ذریعہ ہی معلوم ہوا ہے۔ محمد رسول اللہ عرب کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے اور نبوت کا دعویٰ کیا یہ خبر ہم کو متواتر سے پہونچی اہل علم، اہل عقل سب کے نزدیک خبر متواتر موجب یقین ہے۔ اس پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ یہ سب کو یقین ہے۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہے اور اکبر کو کسی نے نہیں دیکھا کہ یہ ۵۰۰ برس پہلے کی بات ہے اور یہ خبر متواتر سے ہم کو معلوم ہوا۔ تو خبر خبر متواتر ناقابل شک ہے، موجب یقین ہے۔ تو اس جماعت نے کہا کہ نبوت کی ضرورت ہے۔ نبی ہونا چاہئے۔ اس کی تصدیق معجزہ سے ہوگی۔ مگر یہ خبر کہ نبی آیا تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور معجزہ دکھایا۔ اس کو ہم نہیں مانتے۔ یہ لوگ سومناتی ہیں یعنی ہندوستان کے براہمن یہ لوگ نبوت کے منکر ہیں اس بنا پر کہ خبر متواتر کو ماننے سے انکار کیا آواگون کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ خبر متواتر موجب یقین ہے تو ہر ہر واحد اپنی جگہ جھوٹ بول سکتا ہے جو جس مجموعہ کے یہ ممکن الکذب اجزاء ہیں تو وہ مجموعہ بھی ممکن الکذب ہوگا۔ اس لئے وہ موجب یقین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی بات غیر معتبر ہے یعنی ہر ہر واحد جب جھوٹ بول سکتا ہے۔ تو جھوٹ بول سکنے والے واحدوں کا مجموعہ بھی جھوٹ بول سکتا ہے مثلاً ہر ہر واحد حبشی کالا ہے۔ تو حبشیوں کا مجموعہ بھی کالا ہوگا۔ جب مجموعہ

محتمل کذب ہو گیا۔ تو یہ خبر کہ نبی آیا اور اس نے دعویٰ کیا یہ خبر بھی محتمل کذب ہو گئی۔ اور قابل یقین نہ رہی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ آیا ہو اور لوگوں نے مشاہدہ کیا ہو تو یہ ان کے لئے ہے۔ مگر بعد کے آنے والوں کے لئے اس پر یقین کرنا ضروری نہیں اور اس کی دلیل میں سند وہ یہ لائے کہ تم کہتے ہو کہ یہ کائنات لا اول نہیں ہے اور یہ تم اس طرح ثابت کرتے ہو کہ کائنات کے لئے جتنے اجزا ہیں سب فرداً فرداً ذی اول ہیں تو ان کا مجموعہ یعنی کائنات بھی ذی اول ہوگی۔ یہ دلیل اہل کلام نے کائنات کے ذی اول ہونے کی بیان کی ہے۔ اس کو وہ اپنی سند میں لاتے ہیں اور اس سے امداد لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہی کہ کونسی تعداد ہے جو جھوٹ پر متفق نہ ہو سکے۔ اسے مقرر کرو۔ اور یہ مقرر نہیں ہو سکتی کیونکہ جو تعداد مقرر کی جائے گی۔ اس سے ایک کم جھوٹ بول سکتا ہے۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ ایک تعداد جھوٹ بول سکتی ہو۔ اور اس میں ایک کا اضافہ کرنے سے جھوٹ پر اتفاق نہ کر سکے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک بات انھوں نے یہ بھی کہی کہ جھوٹ بولنے کا جو سبب ہے وہ انسان خواہ اپنے ارادہ سے بولے یا خدا کی طرف سے اس کے دل میں ڈالا جائے یا بغیر کسی سبب کے ارادہ پیدا ہو جائے جس ارادہ سے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ وہ ارادہ ان سب میں مشترک ہے۔ یعنی وہ ارادہ جو جھوٹ بولنے کا موجب ہے بسبب اس کا کچھ ہو لیکن وہ مجموعہ کہ ہر ہر واحد میں مشترک اور موجود ہے یہ اور بات ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں۔ مگر بول سکتے ہیں۔ اور جو جھوٹ بول سکتا ہے۔ اس کی بات موجب یقین ہو نہیں سکتی۔ ہمارے علمائے اس کا جواب نہیں دیا۔ یہ کہا کہ یہ قطعی اور یقینی ہے اور یقین کے مقابلے میں جو شبہ آئے

گا۔ وہ شبہ معتبر نہیں ہے مثلاً ایک اگالدان سامنے رکھا ہے۔ اب اگر دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ غیر اگالدان ہے تو وہ دلیل نظری ہو گی۔ غور طلب ہو گی۔ اور ایسی چیز کے مقابلے میں جو بغیر غور کے حاصل ہو۔ اس کے خلاف ایسے دلائل جو نظری ہوں غور طلب ہوں معتبر نہیں ہیں۔ وہ نہیں تسلیم کئے جائیں گے۔ مثلاً دن ہے اور دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ رات ہے تو دن ہی تسلیم کیا جائے گا۔ رات نہیں کہیں گے۔ مگر یہ بات جو ہمارے علماء نے فرمایا صحیح نہیں ہے۔ جواب دینا چاہئیے تھا دیکھئے دلیل سے اور شرع سے دونوں سے یہ ثابت ہے کہ بندہ کے فعل کا خالق خدا ہے۔ اور بداہتاً یہ معلوم ہے کہ بندہ کے فعل کا خالق بندہ ہے۔ تو کیا اس بداہت کے مقابلے میں دلیل اور شرع ختم ہو جائے گا چھوڑ دیا جائے گا۔ بہت بڑی غلطی نہیں ہوئی۔ تمام علماء سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ تو سارے عالم پر اعتراض ہے۔ اتنی بڑی بات کہہ دی۔ چور چوری کرتا ہے۔ بداہتاً یہ چور کا فعل ہے وہ پکڑا جاتا ہے۔ اور سزا پاتا ہے لیکن دلیل سے ثابت ہے کہ اس فعل کا خالق خدا ہے۔ بداہت ہو دلیل پر ہر جگہ ترجیح نہیں دی جائے گی۔ تمام ائمہ نے یہی جواب دیا۔ اور بالکل غلط ہے میں نے اس کا رد کر دیا۔ اصل میں تو جو خامی معترضین کی دلیل میں ہے۔ وہ بتانی چاہیئے۔ جب بحث عقلی ہو رہی ہے تو عقلی جواب دینا چاہیئے تھا۔ اس کا بداہت سے مقابلہ کرنے سے عقلی اور شرعی دونوں نظام بگڑ گئے۔ مستدل نے جو دلیل بیان کی ہے۔ اس دلیل میں جو خامی ہے۔ وہ نکالنی چاہیئے۔ مناظر کا کام یہ ہے۔ یہ جلیل القدر اماموں کی بات ہے معمولی آدمی تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس لئے وہ شبہ اپنی جگہ پر بحالہ ہے۔

ہم اصل رہنے والے لال کنویں کے ہیں. کچھ دن سے چاندنی چوک آگئے تھے
لال کنویں میں ہمارے ایک رشتہ دار جواہرات کا کام کرتے تھے۔ وہاں ایک نیم کا درخت
تھا. اس کے نیچے پہاڑی لوگ آکر ٹھہرا کرتے تھے. ایک پہاڑی کچھ سنگریزے لیکر
آیا اور ان صاحب کو دکھلائے کہ یہ لے لو اور اس کی قیمت دے دو. انہوں
نے اٹھا کر پھینک دیئے کہ یہ صبح ہی صبح کیا اٹھا لایا۔ اس نے کہا کچھ بھی دے دو۔
انھوں نے کہا کچھ نہیں۔ دو چار پیسے کا مال ہے. اس نے کہا لاؤ وہی دے دو
مجھے بھوک لگی ہے. روٹی کھا لوں گا. چنانچہ انھوں نے ہزاروں روپیہ کا مال
چند پیسوں میں اس سے خرید لیا. میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ان سے میرا کیا تعلق تھا
بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دو چار پیسے میں قیمتی چیز پھینکنی نہیں چاہیئے۔ یہ
بہت قیمتی بات ہے. جو میں آپ کو بیان کر رہا ہوں پہلی بات انھوں نے
یہ کہی کہ ہر ہر واحد جھوٹ بول سکتا ہے تو ان کا مجموعہ بھی جھوٹ بول سکتا ہے
اس کا جواب انھوں نے دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ہر واحد ایک بھاری شئے کو نہیں
اٹھا سکتا. مگر ان واحدوں کا مجموعہ اس بھاری شئے کو بآسانی اٹھا سکتا ہے۔ یہ
جواب صحیح ہے. مگر شبہ حل نہیں ہوا اور اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ دیکھو
ہر ہر حبشی کالا ہے. تو سب کا مجموعہ بھی کالا ہے۔ بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔
پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ غلط عقیدوں کی بنیاد کیا ہے. شک۔ شبہہ۔ اور شہوت
بداعمالیوں کا سبب اول شہوت ہے. جو اپنے نفس پہ چلے گا. غلط اعمالیوں کا
مرتکب ہوگا۔ اور بدعقیدوں کا سبب اول شک ہے. سارے غلط عقیدے شک کی بناء
پر پیدا ہوتے ہیں. اسی لئے خداوند تعالے نے شروع کلام میں فرمایا۔ ذالک الکتاب

لاریب فیہ ۔سب سے پہلے شک کی نفی فرمائی ۔قابل شبہ کوئی چیز نہیں ہے شبہ
جب بھی پیدا ہوگا۔ غیر محسوس چیز میں پیدا ہوگا۔ اور جو چیز محسوس ہو جائے گی۔ اس میں
شبہ پیدا نہیں ہوگا مثلاً رسی لٹک رہی ہے ضعیف البصر آدمی ہے جھپٹا ہو گیا ہے اب
رسی ہلی تو سانپ کا شبہ ہوگا جس صحیح نہیں ہے جس اگر صحیح ہوگا شبہ پیدا نہیں
ہوگا چنانچہ قرآن کریم میں جتنے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ سب حسی ہیں غیر حسی
دلائل بیان نہیں کئے گئے تاکہ شک پیدا ہو۔ سوچنے کی ضرورت نہ ہو۔ یہی کمال
قرآن کا ہے کہ سب دلائل حسی بیان کئے گئے ہیں۔ علما نے جو قرآن کی فضیلت
بیان کی ہے کہ قرآن میں معقول دلیلیں بیان کی گئی ہیں غلط ہے۔ قرآن میں
عقلی باتیں بیان نہیں کی گئی ہیں۔ اگر عقلی باتیں بیان کی جاتیں تو صرف اہل عقل
ہی کے کام آتا۔ اور اہل عقل کے علاوہ جو لوگوں سے سوال کیا جاتا تو کہہ دیتے
کہ عقلی باتیں ہماری سمجھ سے باہر تھیں ایسی باریک باتیں ہم سمجھ ہی نہیں سکتے تھے
لیکن حس میں نبی سے عام انسان تک سب برابر ہیں اس لئے دلیلیں سب
حسی رکھی ہیں تاکہ کسی کو کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اب غور کرنا یہ ہے کہ شبہ کیا
ہے۔ ہر ہر چیز کے لئے جز ہونا ثابت ہے۔ مگر ان اجزا کے مجموعے کے لئے جز
ہونا ثابت نہیں ہے۔ وہ کل ہے۔ بوجھ اٹھانے والی بات صحیح ہے مگر دلیل
کو رد نہیں کرتی۔ پہلے ایک ضابطہ سمجھ لیں جو میں نے وضع کیا ہے جو کل مشکل
حل کر دیتا ہے۔ اس پر ایک رسالہ بھی میں نے لکھ دیا تھا۔ غالباً سید
شوکت علی دہلوی کے پاس ہے۔ ضابطہ ایک لائن کی چیز جب بھی دوسری
لائن کی چیز میں مل جائے گی تو یہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور ان کا کوئی حل

نہیں ہے۔مشکل اور لاینحل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ایک راستے میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کو دوسرے راستے میں تلاش کیا جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ وہاں ہے ہی نہیں تو ملے گی کیسے۔ مثلاً انڈے کی مثال۔

اب یہ جان لیجئے کہ عالم کے حدوث کے متعلق جو علماء نے دلیل دی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ہر ہر واحد محدود ہو تو پورا مجموعہ محدود ہو یہ غلط ہے۔ ایک غلط دلیل سے مخالف نے فائدہ اٹھایا ہے۔ محدود میں جب محدود ملایا تو محدود ضرور ہو جائے گا۔ مگر کتنی مرتبہ ملایا اگر محدود مرتبہ ملایا تو محدود ہو گا۔ اگر غیر محدود مرتبہ ملایا تو لامحدود ہو گا۔ دفعات خود محدود ہیں اس لئے مجموعہ محدود ہو گا۔ اور اگر دفعات لامحدود ہو جائے گا۔ اس لئے عالم کے لئے اول ثابت نہیں ہوتا۔ دلیل غلط ہے۔ اس کا نام ان لوگوں نے برہان عرشی رکھا ہے۔ مگر یہ استدلال غلط ہے۔ تم اپنی وسعت کے مطابق اس کو محدود مرتبہ اضافہ کر رہے ہو۔ اس لئے مجموعہ محدود ہو گیا۔ ورنہ اس میں تو صلاحیت ہے کہ لامحدود ہو جائے۔ اسی طرح اور تمام دلیلیں غلط ہیں۔ اس پر میں نے ایک رسالہ لکھ دیا تھا۔ اس میں سب کا رد بیان کر دیا۔ رسالہ کا نام تحقیق الکلام ہے۔ دلیل زوج و فرد یعنی باپ دادا پردادا۔ دن رات۔ ایک کے بعد ایک سلسلہ برابر چلا جا رہا ہے۔ زوج ہے یا فرد یعنی دو پر برابر تقسیم ہو سکتا ہے یا نہیں۔ فرد اس کو کہتے ہیں جس پر ایک کا اضافہ کرنے سے زوج بن جائے۔ یعنی دو پر تقسیم ہو جائے تو اگر یہ سلسلہ جفت یا زوج ہے تو جب اس کو ۲ پر تقسیم کریں گے تو ۲ آدھے بن گئے اور دونوں محدود ہوئے تو ان کا مجموعہ بھی محدود ہو گیا۔ اور اگر یہ فرد

ہے اور طاق ہے تو آج کا دن نکال کر باقی کو نصف کر دیا تو ہر نصف محدود ہو کر مجموعہ محدود ہو گیا۔ اس محدود پر ایک بڑھا دیا وہ بھی محدود ہو گیا۔ یہ دلیل کی تقریر ہے۔ امام غزالی نے بھی یہ ہی دلیل دی ہے مگر یہ غلط ہے۔ طاق یا جفت وہ سلسلہ ہو گا۔ جو طاق و جفت پر مشتمل ہو جس سلسلے میں ایک اور دو موجود ہے وہ سلسلہ طاق یا جفت ہو گا۔ یقیناً اور جو سلسلہ ایک اور دو پر مشتمل نہ ہو یعنی لا اوّل میں ایک دو نہیں ہے۔ تو وہ سلسلہ نہ طاق ہو گا نہ جفت ہو گا۔ وہاں یہ دلیل جاری نہیں ہو گی۔ تو محدود کو لامحدود میں شامل کر دیا۔ اس لئے حل نہیں ہوا۔ سلسلہ لااوّل ایک اور دو پر مشتمل نہیں ہے۔ اس لئے جو قانون ایک اور دو سے متعلق رہے گا۔ وہ وہاں لاگو نہیں ہو گا۔

اس دلیل میں خامی کیا ہے :۔

واحد و واحد مل کر اگر شے واحد بن گئی ہے یعنی کثرت وحدت میں آگئی ہے۔ جیسے لال ٹوپی کہ اس کا ہر ہر جز لال ہے تو سب اجزا مل کر ٹوپی بھی لال ہو گی۔ مرتبہ جز میں کثرت ہے۔ مرتبہ ٹوپی میں وہ سب واحد واحد مل کر ایک وحدت بن گئی ہے۔ تو ایسی صورت میں جو حکم جز و پر لاگو ہو گا وہ ہی حکم کل پر بھی لگے گا۔ اور جہاں یہ صورت نہ ہو یعنی مرتبہ کل میں وحدت نہ ہو بلکہ اس مجموعہ کی وحدت باہر سے آئی ہو۔ وہ مجموعہ شے واحد نہیں بنا۔ بلکہ وہ مجموعیت باہر سے آئی ہے۔ ان اجزا سے نہیں بنی ہے۔ بلکہ عارض ہوئی ہے۔ وہاں اجزا کا حکم کل کے لئے ثابت نہیں ہو گا۔ تو یہ جو امکان کذب کہ ہر ہر واحد جھوٹ بول سکتا ہے۔ تو چاہیئے کہ پورا مجموعہ بھی جھوٹ

بول سکے۔ مگر یہ پورا کا پورا مجموعہ درحقیقت شے واحد نہیں ہے۔ بلکہ افراد ہیں۔ یہ کل سب کے معنوں میں ہے اور سب کے معنی واحد کے نہیں ہیں بلکہ ہر ہر واحد الگ الگ کے ہیں۔ اگر ہر ہر واحد مل کر ایک شے ہو جاتی تو ہر واحد کا حکم اس ایک شے پر ثابت ہوتا۔ مگر ایک شے نہیں بنی تو وہ حکم یہاں لاگو نہیں ہوگا۔ اگر ۲۰۰ آدمی مل کر ایک آدمی بن جاتا تو اس ایک آدمی میں وہ صفات موجود ہوتیں مگر یہاں ہر آدمی الگ الگ ہے۔ اس میں وہ صفت نہیں پائی جائے گی یہ صفت ثبوتی نہیں ہے۔ یہ مغالطہ ہوا ہے۔ اب دوسری بات لیجئے کہ وہ کتنی تعداد ہو جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس میں سے ایک کم تو جھوٹ بول سکتے ہیں۔ تو ایک کے بڑھانے سے صداقت نہیں آسکتی۔ یہ بہت باریک بات ہے۔ سارا عالم نہیں سمجھا یہ کیا قصہ ہے۔ ایک ہزار آدمی بھی جھوٹ بول سکتے ہیں بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ بھی بول سکتے ہیں اور شروع میں تو اتنی تعداد بھی نہیں تھی پھر کونسی تعداد ہے۔ جو جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتی اس کے باوجود کہ اس سے بہت کم تعداد موجود تھی۔ مگر جو کچھ انھوں نے کہا اس کا یقین ہے۔ بڑی اہم بات ہے اسے سمجھئے۔ یہ قرآن اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس کو چھوڑنے کی پاداش ہی میں مسلمان اتنی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا حنیف وہ ہے جو باطل سے منہ پھیر کر حق کی طرف آئے۔ دین حق کی طرف اپنا منہ کرے۔ یعنی دین حق اختیار کرلے وہ دین حق کیا ہے۔ وہ فطرت نہیں جس کو انھوں نے پیدا کرلیا

ہے۔ وہ فطرت اور خلقت جس میں سب لوگ مشترک ہیں وہ دین حق ہے۔ لاتبدیل لخلق اللہ۔ اللہ کی خلقت ناقابل تبدیل ہے ذالک الدین القیم یہی سچا دین ہے۔ ولکن لایشعرون، لیکن اکثر عوام علمار اور ائمہ نہیں جانتے کہ دین حق کیا ہے، وہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو اب گواہی کس کی معتبر ہوگی۔ خبر متواتر ہیں۔ ہزار دو ہزار دس ہزار میں ہر ہر آدمی جھوٹ بول سکتا ہے وہ فطرت نہیں ہے۔ فطرت وہ ہے جس پر تمام لوگ مشترک اور متفق ہیں۔ تو ایسے دس آدمی خبر دے دیں کہ ان دس آدمیوں کو چھوڑ کر باقی سارا عالم انکار نہ کرسکے۔ بس ان کی گواہی خبر متواتر میں معتبر ہوگی۔ ان دس آدمیوں کی گواہی سارے عالم کی گواہی ہوگی۔ اور ایسی ہی خبر کا نام خبر متواتر ہے تو یہ دس آدمی کل کے برابر ہیں اور کل جو ہے۔ وہ فطرت اللہ ہے جھوٹ اور کذب اختیاری شے ہے۔ اور فطرت اللہ غیر اختیاری ہے تو غیر اختیاری کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور اس کو سب تسلیم کریں گے ایک آدمی بھی اگر ایسی بات کہہ دے کہ باقی آدمی کل کے کل اس کا انکار نہ کرسکیں۔ بس یہی فطرت اللہ اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔ ایک نے کہا باقی نے اقرار کرلیا۔ ان سے اقرار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ساکت رہے تو یہ بھی اقرار ہی ہے اور معتبر ہے۔ کتنی تعداد چاہیئے۔ کل عالم چاہیئے۔ کل عالم موجود نہیں ہوسکتا پھر کیا تدبیر ہو۔ کل عالم انکار نہ کرسکے۔ لہذا خبر متواتر صحیح اور معتبر ہے۔ لہذا یہ خبر کہ محمد رسول اللہ صلعم عرب میں پیدا ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور شق القمر کا معجزہ دکھلایا اور ان پر قرآن نازل ہوا یہ ہم کو خبر متواتر

کے ذریعہ معلوم ہوا تو گو ہم نے نہیں دیکھا مگر اس پر ہم کو اس طرح یقین ہے کہ گویا ہم نے دیکھ لیا یہ مکمل حجت ہے۔ اگر انکار کرے گا تو اللہ پناہ میں رکھے جو اس کا انجام ہوگا جس طرح مکہ ہم نے نہیں دیکھا مگر خبر متواتر سے ہم کو یہ معلوم ہوا کہ مکہ ایک شہر ہے۔ اور ہم کو یقین ہے کہ یہ ایک شہر ہے۔ لہذا خبر متواتر کا صحیح ہونا ثابت ہوگیا اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ اب ایک ذرا سا جزو یہ رہ گیا کہ بعض ملحد صوفیہ کا قول ہے کہ تکلیف شرعی اور امر و نہی میں مشغول ہونے سے استغراق فی اللہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی محبت فنا ہو جاتی ہے۔ اس لئے شریعت نہیں آنی چاہیئے۔ لہذا نبوت نہیں آنی چاہیئے۔ اس کا رد یہ ہے کہ استغراق قلبی اور محبت الہیٰ عقل سے معلوم نہیں ہوتا جس طرح نبی نے جسمانی شرائع اور احکام بتائے ہیں۔ اسی طرح قلبی احکام بھی نبی نے بتلائے ہیں یہ بھی اسی لئے مفید ہے۔ رسول اللہ صلعم نے بتایا کہ یہ مفید ہے اگر وہ نہ بتلاتے اور صرف عقل سے معرفت الہیٰ کا علم ہوتا تو یہ بے کار تھا۔ اس کا کوئی نفع نہیں تھا جب تک نبی نہیں بتلائے۔ استغراق معرفت کتنا بھی گہرا ہو مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوش رہتا ہے۔ مگر ایک شخص جو سو رہا ہے وہ دنیا سے زیادہ بعد رکھتا ہے۔ استغراق کے مقابلے میں اور الصلوۃ خیر من النوم نماز یعنی شریعت نوم سے زیادہ بہتر ہے۔ تو استغراق جو نوم سے کمتر درجے کا ہے اس سے شریعت کہیں زیادہ بہتر ہوگئی۔ اس کے علاوہ آپ دیکھیں کہ انسان کو خدا نے دو چیزیں عطاء فرمائیں ایک عقل جو معرفت کی طرف لے جانے والی ہے۔ دوسری شہوت و غضب جو معرفت

سے دوسری سمت کو لے جاتی ہیں۔ تو اگر معرفت الٰہی مقصود ہوتی تو یہ دو آلہ شہوت و غضب نہ دیئے جاتے۔ ان کا دینا اس کا ثبوت ہے کہ مقصود الٰہی صرف معرفت ہی نہیں ہے بلکہ معرفت سے دوری بھی ہے جس طرح ایک برتن میں دو راستے ہوں ایک اوپر اور دو نیچے تو یہ ظاہر ہے کہ بنانے والے کا مقصد صرف اوپر سے پانی بھرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد نیچے کے دونلوں سے خالی کرنا بھی ہے۔ معرفت ہی مقصود ہوتی تو اس کی ضدیں پیدا نہ کرتا۔ جیسا معرفت کی ضدیں پیدا کردیں تو معلوم ہوا کہ ضدیں میں اعتدال مقصود ہے اور اعتدال عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا تو وہ خود بتائے گا اور خود وہ آ نہیں سکتا تو اس کا آدمی آکر بتائے گا اس وقت بھر و اور اس وقت خالی کرو اور وہ آدمی نبی ہے۔ لہذا نبوت کا آنا اور شرائع کا آنا ضروری ہے۔

نبوت کے شبہات اور ان کا رد

ایک جماعت تو نبوت کی قائل ہے۔ وہ مومنین کی جماعت ہے۔ یہ مسلمان ہیں باقی متعدد جماعتیں ہیں۔ جو نبوت کی قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ نبوت سے کیا فائدہ ہے۔ (۱) ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ تکلیف فی نفسہ محال ہے۔ نبی آتا ہے تو امر و نہی کرتا ہے۔ یہ کرو اور یہ نہ کرو شرع میں اس امر و نہی کو تکلیف کہتے ہیں۔ قرآن میں جگہ جگہ آتا ہے۔ مثلاً لا یکلف اللّٰہ نفساً الّا وسعہا لہا ما کسبت یہ

تکلیف یہی امرونہی ہے۔ تکلیف سیاست کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ وہ بھی امرونہی کرتی ہے۔ سائس اسی سے مشتق ہے۔ وہ بھی گھوڑے کو امرونہی کرتا ہے۔ اردو میں تکلیف ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اردو میں اس کا مفہوم دکھ۔ درد ہے شرع میں یہ معنی نہیں ہیں۔ نبی آنے کے بعد امرونہی کرتا ہے۔ یعنی تکلیف دیتا ہے۔ اور تکلیف محال ہے اور چونکہ نبوت کی فرع ہے اس لئے نبوت بھی محال ہے۔ کیونکہ نبوت تکلیف کا ذریعہ یہ قدملتے فلسفہ کی دلیل ہے۔ کہ تکلیف ہی سرے سے محال ہے۔

(۲) دوسرا گروہ کہتا ہے تکلیف تو ممکن ہے لیکن نبوت کی ضرورت نہیں ہے خدا کی معرفت کے لئے عقل کافی ہے

(۳) تکلیف ممکن ہے۔ عقل کافی نہیں ہے۔ مگر جس طریقے سے نبوت ثابت ہوتی ہے۔ وہ طریقہ محال ہے۔ وہ معجزہ ہے۔ معجزہ خرق عادت فعل ہے۔ اور خرق عادت محال ہے بغیر معجزہ کے نبوت ثابت نہیں ہوگی۔ اس لئے نبوت ثابت نہیں ہوسکتی لہذا نبوت باطل ہے۔

(۴) ایک گروہ کہتا ہے۔ تکلیف ممکن ہے۔ عقل کافی نہیں ہے۔ خرق عادت بھی ممکن ہے۔ مگر معجزہ نبوت کی دلیل نہیں ہے۔ ایک شخص مردے کو زندہ کردے۔ یہ ممکن ہے۔ مگر اس سے اس کا من جانب اللہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

(۵) ایک گروہ کہتا ہے۔ کہ تکلیف ممکن ہے۔ عقل کافی نہیں ہے۔ معجزہ ممکن ہے۔ اور نبوت کی دلیل ہے۔ مگر ہم نے صرف سنا ہے۔ اور سماعت موجب یقین نہیں ہے ظنی ہے۔ اس لئے ہمیں پتہ نہیں معجزہ ہوا یا نہیں ہوا۔ ظن سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

(۶) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ تکلیف ممکن عقل ناکافی۔ معجزہ ممکن اور دلیل

ثبوت نبوت ہے۔ مگر معجزہ خدا کی رحمت کے خلاف ہے۔ اور خدا ارحم الراحمین ہے۔ خلاف رحمت فعل اس کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے معجزہ محال ہے۔ اس لئے نبوت محال ہے۔ نبوت زحمت ہے۔ اور خدا زحمت دینے سے پاک ہے۔ وہ رحیم ہے لہٰذا نبوت باطل ہے۔

(۷) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ مقصد خدا سے محبت اور استغراق ہے اور جتنی شریعتیں اور عبادتیں ہیں یہ استغراق قلبی کو روکنے والی ہیں۔ استغراق کے منافی ہیں جو چیز خدا کی محبت کو روک دے وہ صحیح نہیں ہے۔ اور نبی آکر احکام شرعی بتلائے گا۔ اور دل خدا کی محبت سے ہٹ کر اس طرف چلا جائے گا۔ لہٰذا نبوت صحیح نہیں ہے یہ ایک جماعت صوفیا کی ہے۔ میں ان کو نہیں جانتا لیکن بزرگوں نے یہی لکھا ہے۔ کہ یہ صوفیوں کی ایک جماعت ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہے۔

(۸) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امر و نہی یعنی تکلیف میں ایسی باتیں ہیں جو بے معنیٰ ہیں۔ اور حکیم کی شان سے بعید ہے کہ ایسی باتیں کہے جو عبث اور بے فائدہ ہوں۔ یہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ایسی فعل ہیں۔ کہ اس سے نہ خدا کو کوئی فائدہ ہے اور نہ بندے کو کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ بندہ کے لئے سراسر مشقت ہے۔ وقت کی تضیع ہے۔ مال کی تضیع ہے۔ سب بے معنی اور عبث ہیں اور حکیم کی شان سے یہ بعید ہے کہ ایسا حکم کرے جو عبث ہو لہٰذا نبوت باطل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو آئندہ فائدہ پہنچے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان مشقتوں کے بغیر بھی فائدہ پہنچانے پر قادر ہے۔ لہٰذا ایک ایسا فعل جو بغیر واسطے کے ہو سکتا ہے۔ اس میں واسطہ کو شامل کرنا یہ انتہائی سفاہت بے وقوفی اور جہالت ہے۔

یہ بنیادی الحاد ہیں۔ یہ اس کی اصل چیزیں ہیں۔ اور یہ بغیر دلیل اور غور کے عوام میں پھیل گئی ہیں۔ جیسے یورپ میں ایسی چیزیں پھیل گئی ہیں۔

(۹) اور ایک جماعت سب باتیں تسلیم کرتی ہے۔ مگر یہ کہتی ہے کہ یہ محمدؐ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔ یہ یہودی اور نصرانی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شرع موسوی منسوخ نہیں ہوئی۔ اس لئے نئی شریعت کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) براہمہ کا گروہ جو ہندوستان میں ہے وہ یہ کہتا ہے کہ نبی کے آنے سے پہلے سب ناجی تھے۔ کیونکہ فرمایا (وماکنا معذبین حتٰی نبعث رسولاً) جب تک ہم رسول نہیں بھیجتے عذاب نہیں دیتے۔ اور نبی کے آنے کے بعد جس نے اس کا انکار کیا جہنمی ہوا بڑی جماعت نے انکار کیا اور جہنمی ہوا سب کا ناجی ہونا اس سے بہتر ہے چند ناجی ہوں اور باقی جہنمی ہوں۔ تو نبی کا آنا باعث رحمت ہوا۔ اور یہ رحمت کے خلاف ہے۔ اور خدا رحیم ہے۔ اس کا یہ فعل جو منافی رحمت ہو نہیں سکتا اس لئے نبوت باطل ہے۔

یہ سب شبہات اہل علم کے ہیں جو غور کرتے ہیں ان میں سے جاہل کوئی نہیں ہے۔ اب یہ سمجھنا ہے کہ ان کو غلطی کہاں لگی۔ سوائے یہود کے جو جاہل ہیں۔ اور ہٹ دھرم یہ کہتے ہیں کہ موسٰی علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کی شریعت ابدی ہے۔ اگر وہ ایسا کہہ دیں تو ان کا فرمانا ہمارے لئے بھی حجت ہوگا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ یہ آگے بتائیں گے۔ باقی سب بڑے بڑے حکیم اور دانشمند لوگ ہیں۔ عقلمند لوگ ہمیشہ گمراہ ہی رہے ہیں۔ جو جتنا بڑا عقلمند ہے اتنا ہی زیادہ گمراہ ہوا ہے ضلالت میں رہا۔

۱۔ پہلا فرقہ یہ کہتا ہے کہ تکلیف ناممکن ہے یہ چرچا نوح علیہ السلام کے

زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس وقت ایک جماعت نے یہ کہا تھا۔ پہلی بات یہ کہی کہ تمام افعال انسانی یہ امر و نہی سب خدائی مخلوق ہے۔ انسان کے افعال کا خدا خالق ہے بندہ مجبور ہے۔ اور مجبور کو تکلیف دینی محال و ناممکن ہے۔ انسان کے افعال جبری ہیں۔ اور جبری افعال کے خلاف کرنے کا حکم دینا محال ہے مثلاً آدمی ہوا میں نہیں اڑ سکتا۔ اب اس کو یہ حکم دیا جائے کہ تو ہوا میں اڑ ورنہ دائمی عذاب دوں گا۔ یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح بندہ سے کہا ایمان لا اور ایمان لانے پر قادر نہیں ہے۔ تو اس سے یہ کہنا کہ تو ایمان لا اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اس سے کہا جائے کہ تجھے ایسا دائمی عذاب دوں گا جس کا تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات عقل کے نزدیک محال ہے۔ لہٰذا تکلیف دینی محال ہے۔ یہ دلیل کی تقریر ہے۔

یہ اعتراض صرف ان لوگوں پر وارد ہوتا ہے جو بندے کے افعال کو جبری مانتے ہیں۔ یعنی جبریہ اور ان کے ہم خیال لوگ۔ اس میں غلطی یہ ہے کہ جبر کو جو تقدیر کیا گیا ہے یہ غلط ہے بندہ مجبور نہیں ہے۔ (وما منع الناس ان یو منوا اذ جاء ھم الھدیٰ) ہدایت آنے کے بعد لوگوں کو کس نے منع کیا ایمان لانے سے۔ ماذا علیھم لو آمنو۔ ان کا کیا بگڑتا جو وہ ایمان لے آتے۔ یہ تو شرعی بات تھی باقی عقلی بات یہ ہے کہ ہر انسان جانتا ہے۔ کہ وہ مجبور نہیں ہے۔ جانور بھی جانتا ہے کہ انسان با اختیار ہے۔ کتا پتھر سے نہیں ڈرتا مگر آدمی کے ہاتھ میں دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ چوہا لاٹھی سے نہیں ڈرتا۔ مگر انسان کے ہاتھ میں دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ دونوں جانتے ہیں کہ پتھر اور لاٹھی با اختیار

نہیں ہے۔ مگر بااختیار ہاتھ میں جاکر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ عالم جبر سے عالم اختیار میں آگئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے بعض فرقوں نے بندہ کو مجبور کرکے قوم کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر بندہ کو مجبور بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی وہ تکلیف کے منافی نہیں ہے۔ یہاں کیا ہے۔ نبی آکر امر ونہی کرتا ہے نا۔ تو جس طرح انسانوں کے تمام افعال کا خدا خالق ہے۔ اور انسان مجبور ہے۔ اسی طرح نبی کے افعال کا بھی خدا خالق ہے۔ اور نبی تبلیغ پر مجبور ہے۔ جس طرح ماننے والا ماننے پر اور انکار کرنے والا انکار پر مجبور ہے۔ اسی طرح نبی امر ونہی اور تبلیغ پر مجبور ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ اعتراض اس وقت ہوتا اگر نبی مختار ہوتا اور دوسرے لوگ مجبور ہوتے۔ جس طرح اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھکتا ہوا آتا ہے اور راستے میں چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کو بھی ساتھ لڑھکا کر لیتا چلا جاتا ہے۔ اب ان سنگریزوں میں سے کچھ لڑھک کر گڈھے میں جا گرتے ہیں۔ اور کچھ ہرے بھرے میدان میں آگرتے ہیں۔ اسی طرح جبر کی تقدیر پر بھی تبلیغ اور دوزخ اور جنت صحیح ہے لہٰذا تکلیف جائز اور صحیح ہے۔

دوسری دلیل انہوں نے یہ بیان کی کہ خدا کو معلوم ہے کہ یہ بندہ ایمان نہیں لائے گا تو اس کا ایمان لانا محال ہے۔ اور محال کی تکلیف دینا محال ہے لہٰذا تکلیف صحیح نہیں ہے۔ اگر اس کے علم میں بندہ کا ایمان لانا ہے۔ تو وہ ایمان لاکر رہے گا۔ ایسی حالت میں بھی تکلیف صحیح نہیں ہے۔ اور اس کو ازل میں بندہ کا کفر و ایمان نیکی بدی دونوں معلوم ہے۔ اس حالت میں تکلیف کی ضرورت نہیں رہی۔ اور تکلیف باطل ہوگئی اور چونکہ اصل تکلیف ہے۔ نبوت اس کی فرع ہے۔ تو جب

اصل باطل ہوگئی توفرع بدرجہ اولیٰ باطل ہوگئی۔ لہٰذا نبوت باطل ہے۔ اس کا جواب مجھے کہیں نہیں ملا۔ بڑا بڑا عالم اس مغالطہ میں مبتلا ہے۔

جواب میں کہتا ہوں۔ اس نے جو یہ جانا کہ یہ ایمان لائے گا اور یہ نہیں لائے گا۔ تو اس نے اس کے اسباب کو بھی جانا۔ اور یہ ایمان لانے اور نہ لانے کا وقوع آخر میں ہوگا۔ ازل سے سلسلہ واقعات کا چلا آرہا ہے اور چلتے چلتے انسان پیدا ہوا پھر یہ انسانوں کا سلسلہ چلتے چلتے اس شخص تک آیا اور پھر یہ ایمان و کفر اس سے واقع ہوا۔ جو شے آخر میں واقع ہوگی۔ اس کو جانا تو اس نے اس آخر سے پہلے تک کی اس لڑی کو بھی جانا جو ازل سے چلی آرہی ہے۔ اس نے صرف یہ ہی نہیں جانا کہ یہ کفر کرے گا۔ بلکہ اس نے ایمان نہ لانے کے جتنے بھی اسباب ہیں ان سب کو جان لیا اور جملہ اسباب میں تکلیف بھی ہے۔ کہ جب اس کے سامنے یہ پیش کی جائے گی تو انکار کردیگا۔ کفر بغیر تکلیف کے متحقق ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں اس نے یہ جانا کہ ابوجہل ایمان نہیں لائے گا۔ اس نے یہ بھی جانا کہ رسول اکرمؐ پیدا ہوں گے۔ نبوت کا دعوٰی کریں گے اور میں تصدیق کروں گا اور جب یہ تکلیف اس کے سامنے پیش کریں گے۔ تو ابوجہل انکار کرے گا۔ جہاں اس نے مشیت کو جانا اس نے سبب کو بھی جانا۔ جس طرح انکار ضروری ہے اسی طرح تکلیف ضروری ہے۔ اگر تکلیف نہ ہوتی تو انکار کیسے کرتا انکار ہو ہی نہیں سکتا بغیر تکلیف کے۔

تیسری دلیل : تکلیف دینے سے خدا کو کیا فائدہ۔ اگر خدا کو فائدہ ہوگا۔ تو خدا محتاج ہوکر خدا ہونے سے خارج ہوجائے گا اور بندہ کو فائدہ ہوگا۔ تو بندہ کا

اس میں ظاہر کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ سراسر نقصان تکلیف اور مشقت ہے۔ زحمت ہے۔ ٹھنڈے پانی سے سردیوں میں وضو کرو۔ ۱۲، ۱۴ گھنٹے بغیر پانی اور کھانے کے رہو۔ روپیہ صرف کرکے حج کو جاؤ تو نہ خدا کو فائدہ نہ بندے کو۔ اب اگر کہو کہ اس کے بدلے اس کو جنت ملے گی۔ تو بغیر اس کے پہلی ہی بار جنت دینے پر قادر تھا اس واسطے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر اس واسطے کی ضرورت تھی تو خدا ناقص ہو گیا محتاج ہو گیا۔ قادر نہ رہا کیونکہ بغیر اس کے وہ فعل نہیں کر سکتا۔ جس طرح چھت پر چڑھنے کے لئے انسان کو سیڑھی کی ضرورت ہے۔ یعنی سیڑھی کا محتاج ہے۔ اسی طرح اگر خدا کو جنت دینے کے لئے یہ مشقت کرانا لازمی ہے تو خدا اس مشقت کا محتاج ہو گیا۔ اور تکلیف جو ہے۔ وہ ایک درمیانی چیز ہے۔ تو جس طرح خدا کا محتاج ہونا محال ہے تو تکلیف دینا بھی محال ہو گیا۔ کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ لیکن یہ غلط ہے، دھوکہ ہے۔ شیطان کی سکھائی ہوئی بات ہے۔ ہر شبہ کا قرآن کریم میں ایک ایک لفظ میں خدا نے جواب دے دیا ہے۔ آگے مناسب جگہ اس کو بیان کریں گے۔ میں کہتا ہوں پہلے یہ سمجھ لیں کہ 'عقلی' چیز کیا ہے۔

جو فعل یہاں ہو رہا ہے وہ ناقابلِ شک ہے۔ سورج ہے۔ زمین ہے۔ آسمان ہے۔ سونا ہے۔ جاگنا ہے۔ بھوک ہے۔ پیاس ہے۔ ان واقعات کا انکار کفر ہی نہیں جنون ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا اس بات پر قادر تھا کہ پکا پکایا کھانا ہم کو پہنچا دیتا مگر ذرائع مقرر کیئے۔ محنت کرو۔ کماؤ۔ سودا سلف لاؤ پکاؤ کھاؤ۔ تو باوجود قادر ہونے کے یہ ذرائع مقرر کئے یہ محال نہیں ہیں بلکہ بالکل عقل کے مطابق ہیں۔ تو جس طــرح یہ عقل کے مطابق ہیں اسی طرح وہ بھی عقل

کے مطابق ہے۔ یہ بات میں نے کہی ہے۔ مجھ سے پہلے کسی شخص نے نہیں کہی (اور میں
یہ جو کہتا ہوں کہ "میں کہتا ہوں" یہ نفس پرستی ہے اس فقرے کو کہنے کی ضرورت نہیں
ہے مگر دکسی شخص نے نہیں کہی" اس کہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ صحیح عمل نہیں ہے۔ یہ
بات صدیوں سے مسلمانوں میں سے چلی آئی ہے۔ میرا نفس اس قدر قوی ہے موٹا ہے کہ میں
اس بات کو ظاہر کر دیتا ہوں۔ اگر نبی کی تعلیم پر صحیح چلے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گا۔ بہت
روکتا ہوں مگر پھر بھی منہ سے نکل جاتا ہے۔ اس میں نفس کی آمیزش ہے۔ نفس کے
واسطے سے شیطان کا اثر ہے۔ خدا برابر کہہ رہا ہے۔ (ان الشیطان عدوا
لکم فاتخذوہ عدوا) شیطان تمھارا دشمن ہے تم بھی اس کو دشمن ہی سمجھو
کتنی بڑھیا بات ہے۔ شیطان کہتا ہے کہ میری بات سے لوگوں کو فائدہ ہو یا نہ ہو
اس کو تو گمراہ کرو۔ یہ بات اچھی طرح میں نے سمجھ لی۔ مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ مجھ سے
پہلے یہ بات کسی نے نہیں کہی)۔ جب یہاں اس کے فعل وسائط سے ہو رہے ہیں۔
اور وہ اس کی حکمت رحمت اور خداوندی کے منافی نہیں ہے تو وہاں کیسے منافی
ہوں گے۔ یہاں نفع کے لئے کاروبار لازمی ہوا اور وہ قطعی اس بات پر قادر تھا کہ
بغیر کاروبار کے نفع پہنچا دیتا کاروبار بھی تو ذریعہ ہے نفع کا بلکہ نفع سے جو چیزیں
حاصل ہوتی ہیں وہ چیزیں سب کو حاصل کرا سکتا تھا۔ مگر یہاں اس نے ترتیب دیا
اور جب یہ ترتیب یہاں اس کی شان کے خلاف نہیں ہے تو یہی فعل دوسری جگہ اس کی
شان کے خلاف کیوں کر ہو گا۔ اس شبہ کی حقیقی وجہ کیا ہے اصل میں جو بات کسی
کے سمجھ میں نہیں آئی یہ ہے کہ وہ لغو کے معنیٰ نہیں سمجھے لغو کس شے کو کہتے ہیں اور یہ
کہاں ہوتا ہے۔ اگر چھت پر بغیر سیڑھی کے پہنچا جا سکتا ہے تو سیڑھی کی ضرورت نہیں

ہے مگر پھر بھی اگر سیڑھی لگائی جائے گی تو یہ فعل لغو کہلائے گا۔ کیونکہ چھت پر پہنچنا مقصود ہے اور بغیر سیڑھی کے مقصد حاصل ہے۔ انسان کی ذات چھت پر پہنچنے کی محتاج ہے۔ اس کو سیڑھی کی ضرورت ہے۔ یہ ذریعہ ہے چھت پر پہنچنے کا۔ اگر اس ذریعے کے بغیر احتیاج پوری ہو سکتی ہے اور پھر ذریعے کو تلاش کیا جائے تو یہ فعل لغو کہلائے گا۔ اسی طرح روپیہ کے لئے ملازمت ہے اگر روپیہ بغیر ملازمت کے حاصل ہو تو ملازمت بے کار ہے۔ اسی طرح بغیر چراغ کے روشنی ہو گئی تو چراغ کی ضرورت نہیں۔ بغیر آگ کے سالن گرم ہو گیا تو آگ کی ضرورت نہیں۔ تو جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وسائط کو لغو اور غلط کہا جائے گا۔ اگر ضرورت بغیر وسائط کے پوری ہو سکتی ہو۔ مگر خلاق عالم کہ وہ واسطے سے پیدا کرے تو بغیر واسطے کے پیدا کرے تو ہزاروں اور لاکھوں واسطوں سے پیدا کرے تو اس کے لئے سب برابر ہے۔ ہم چونکہ ضرورت مند ہیں اور ہماری احتیاج اگر پوری ہوتی ہو پھر ہم واسطے اختیار کریں یا تلاش کریں تو یہ غیر ضروری۔ لغو اور عبث ہو گا۔ لیکن خدائے تعالیٰ ضرورت مند نہیں ہے۔ اس کا فعل کا حاجتی نہیں ہے وہ غنی ہے۔ اس کا جو فعل ہو گا۔ بغیر احتیاج اور ضرورت کے ہو گا۔ لہٰذا وہ واسطے سے ہو یا بلا واسطہ دونوں برابر ہیں۔ یہاں دیر لگتی ہے وہاں دیر نہیں لگتی۔ ایک واسطہ پیدا کرنا یا لاکھوں واسطے پیدا کرنا یا بغیر واسطے کے پیدا کرنا سب بیک آن ہوتا ہے۔ کوئی لاگت نہیں لگتی۔ کوئی مشقت نہیں ہوتی کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے پیدا کرے تو بغیر ماں باپ کے پیدا کرے تو بالکل فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیا سب انسانوں کو اسی طرح پیدا کر سکتا تھا اگر اس کو مشقت کرنی

پڑتی اور بغیر مشقت کے حاصل ہوتا اور پھر مشقت کرتا۔ تو یہ مشقت کرنا لغو ہوتا۔

چوتھی دلیل انہوں نے یہ بیان کی یہ بتاؤ کہ وہ کس وقت تکلیف دے رہا ہے کسی جگہ جانا ہے؟ نہیں جانا ہے۔ قصہ ختم۔ اگر جانا ہے تو ایک نقطے سے چلے گا چلتے چلتے جاتے جاتے ایک مسافت طے کرنے کے بعد مقصود نقطے پر پہنچے گا تب فعل منقطع ہوگا۔ ترک کے بعد کا جو زمانہ ہے اس میں دھوکہ لگتا ہے۔ وہ عدم فعل نہیں ہے۔ ترک اور چیز ہے۔ عدم فعل اور چیز ہے۔ ترک کرنے کے بعد کا جو زمانہ ہے۔ وہ نہ فعل کا زمانہ ہے نہ ترک فعل کا ہے۔ وہ اصلی عدم ہے۔ وہاں فعل ہے ہی نہیں۔ اس کے ساتھ عدم کے ساتھ امر متعلق نہیں ہو سکتا۔ چوری ہے۔ کہا ترک کر۔ ترک کر دی ختم اب ترک یعنی چوری کی نفی ابد تک رہے گی اور ابد تک کی جو نفی ہے۔ وہ عدم محض ہے وہ ترک چوری نہیں ہے۔ شراب نہ پی۔ ترک کر دیا۔ ختم ہوگیا اب ساری عمر شراب اس کے بعد نہیں پی تو یہ نہ پینا شراب کا۔ ترک فعل نہیں ہے۔ وہ تو اسی وقت ختم ہوگیا۔ جب ترک کیا۔ اب یہ نہ تو پینا ہے اور نہ ترک پینا ہے۔ ہمارے یہاں کے تمام علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ تم جو نفی تکلیف کی تکلیف دے رہے ہو تو گویا تکلیف نہ ہونے کی تم ہم کو تکلیف دے رہے ہو۔ تمھاری دلیل سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ تکلیف کی نفی ہے۔ تو نفی تکلیف کی تکلیف دے رہے ہو۔ یہ ضابطہ کا جواب نہیں ہے۔ سب کا جواب صرف یہی دیا ہے۔ نہیں ہمارا یہ اصول نہیں ہے۔ قاعدہ کے اندر دیکھنا چاہئے گیا قائمی ہے۔ یہ غلط ہے مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ تکلیف دی تو یہ تکلیف

کس وقت دی۔ ترکِ فعل کے وقت یا فعل کے وقت یا درمیانی حالت کے
وقت یہ مغالطہ ہے۔کسی ایک وقت نہیں بلکہ تینوں وقت میں تکلیف دی
اور اس میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی فعل کرنے کے وقت تکلیف دی۔ اگر برا فعل
کر رہا ہے تو کہا چھوڑ دے۔ اگر اچھا فعل کر رہا ہے تو اس سے کہا کہ اس کو
دائمی کرنا ہو گا۔ پہلے اپنی عقل سے کر رہا تھا۔ وہ فعل غلط تھا۔ اب میرے
کہنے سے کر۔ سچ بول۔ نماز پڑھ وغیرہ اور یہ جو ایجاد ہو گا یہ باالاختیار
ہو گا۔ اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ اگر تکلیف محال ہو گی تو نظام عالم
درہم برہم ہو جائے گا۔ کوئی شخص کسی سے یہ نہیں کہے گا تو یہ کر یہ نہ کر کوئی
کام نہیں ہونے کا۔ یعنی اگر امر و نہی محال ہو جائے گا۔ تو امر و نہی کے بغیر
دنیا کی زندگی کا گذارنا ناممکن ہو جائے گا۔ نہ باپ بیٹے کو نہ بھائی بھائی کو۔
نہ شوہر بیوی کو کہے گا کہ یہ کر یہ نہ کر۔ حاکم محکوم کو مالک نوکر کو۔ نہیں کہہ سکتا۔
تو زندگی کا نظام بگڑ جائے گا۔ اور ختم ہو جائے گا۔ اور سارے عالم میں
تکلیف جاری ہے۔ بغیر تکلیف کے ایک دن نہیں گذر سکتا۔ یہ کہنا کہ تکلیف
محال ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ تکلیف واقع ہے۔ دلیل کی تقریر یہ ہوئی کہ اگر
تکلیف محال اور باطل ہو گی تو نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور نظام کا
درہم برہم ہونا محال اور ناممکن ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تکلیف محال ہے یہ
ناممکن ہے۔ لہٰذا تکلیف واجب ہے۔

معجزہ اور کرامت میں فرق

بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جو عادتِ انسانی کے خلاف ہوتے ہیں۔ جیسے رستم پہلوان اور گاما پہلوان سے ایسے فعل صادر ہوئے جو عام آدمی ایسے فعل نہیں کر سکتا اور جو شخص ایسے افعال پر قادر ہو گیا۔ جیسے بھوک میں کھانا نہ کھانا۔ پیاس کے وقت پانی نہ پینا۔ یہ افعال سب خرقِ عادت ہیں۔

اللہ نے عادتِ انسانی یہ بنائی ہے کہ بھوک کے وقت کھانا کھائے اور نہ کھایا تو یہ عادتِ انسانی کے خلاف ہوا۔ روزہ میں نماز میں نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ تو بھوک خوب لگ رہی ہے اور کوئی شے حلال کھانا کھانے سے روکنے والی بھی نہیں ہے اور پھر نہ کھایا تو یہ خلافِ عادت فعل کیا یا نہایت قوی آدمی ہے۔ صحت بھی اچھی ہے۔ بُرے فعل میں بھی نہیں اور نکاح ترک کر دے۔ جب بھی فعل خرقِ عادت ہوگا تو اس فعل کا جو اثر مرتب ہوگا وہ بھی خرقِ عادت ہوگا۔ مثلاً بغیر کھائے پیٹ بھر گیا۔ بغیر پانی پئے پیاس بُجھ گئی۔ یا کئی آدمیوں کا کھانا کھا گیا یا بہت سا پانی پی گیا یہ سب خرقِ عادات اثرات ہیں۔

خرقِ عادت افعال کی ایک مقدار ہے اس کے بعد اثر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اثر کیسی

ہے وہی نہیں ہے۔ اسی اثر کا اظہار اگر کسی ولی سے صادر ہو تو کرامت اور اگر کسی غیر مسلم سے صادر ہو تو اس کو استدراج کہیں گے۔ مرشد حاذق اس مقدار کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ سن لیں۔ محمد نامی ایک مرید اپنے مرشد کی بڑی خدمت کرتا تھا مگر اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اتفاق سے پیر صاحب کی آنکھ میں تکلیف ہوئی اور اللہ سے انھوں نے دعا کی تو مراقبہ میں انھوں نے محسوس کیا کہ اللہ نے کہا کہ نماز میں ایک نیا شخص آئے گا وہ دوا بتائے گا چنانچہ ایک اجنبی مسجد میں آیا۔ جب وہ نماز پڑھ کے جانے لگا تو انھوں نے اس کو روکا۔ دریافت کرنے پر اپنا حال بتایا۔ اس نے کہا کہ اگر انسان کا گوشت مل جائے تو دوا بنا دوں "۔ چنانچہ محمد نے اپنا گوشت ہاتھ کاٹ کر اس کے پاس بھیجا۔ دوا بن آئی اور اس سے آنکھ کی تکلیف رفع ہوگئی۔ پیر صاحب نے سوچا ایسا کونسا شخص ہے جس نے اپنا گوشت میری خاطر اس کو دیا۔ محمد کو بلوایا تو ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھی۔ اس کو بہت سخت سست کہا۔ آخر محمد نے سوچا کہ انھوں نے میری اس قربانی کی بھی قدر نہ کی۔ اب تو میں اللہ ہی سے طلب کروں گا۔ اگر دینا ہوگا تو وہی دے گا۔ یہ دیکھ کر وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ ادھر پیر صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس کو بلوایا اور جو اس کی قسمت کا تھا دیا۔ اور کہا کہ یہ تو سمجھتا تھا کہ میں توجہ نہیں دیتا ہوں۔ میں اصل میں یہ دیکھ رہا تھا کہ تجھ کو خدا سے تعلق کی استعداد کب پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا مناظرہ جے پال جوگی سے ہوا۔ وہ روحانیت میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ مگر جب روحانیت میں ہار گیا تو آپ نے اس کو اسلام پیش کیا تو اس نے انکار کیا تو خواجہ صاحب نے اس سے اپنے اور اس کے اپنے نفس کو دیکھنے کیلئے کہا۔ مراقبہ میں اس نے دیکھا کہ حضرت خواجہؒ کا نفس مثل سورج کے روشن ہے اور اس کے نفس کی بھی یہی کیفیت ہے مگر اس میں ایک سیاہ داغ ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے کہا "یہ داغ اس لئے ہے کہ جو تمام عالم کے لئے روشنی لیکر آیا تو اس پر ایمان نہیں لاتا۔"

اُس نے جواب دیا "مگر میرا دل نہیں چاہتا، میں کیا کروں؟"

آپ نے فرمایا "اچھا یہ تو بتا کہ یہ کمال تجھے کیوں کر حاصل ہوا کہ تیرا نفس روشن ہوگیا اس کو طرارہ آگیا اور کہنے لگا "۵۰ سال میں نے نفس کی مخالفت کی ہے تب یہ حاصل ہوا ہے۔"

خواجہ نے کہا "تو بس اب تو خود ہی سمجھ لے اب بھی نفس کی مخالفت کر۔" وہ فوراً مسلمان ہوگیا۔ تو مرشد چونکہ حاذق تھا اس نے اسی کی لائن میں اس کو داب لیا۔

جتنے علوم باطنی ہیں ترک لذت پر موقوف ہیں۔ ان کا کوئی تعلق شریعت سے نہیں ہے۔ نہ یہ آخرت کی آسائش کے لئے مفید ہیں۔ وہ آسائش ظاہری شریعت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس میں یہ مدد دے مگر تنہا ایسی کوئی شے جو غیر مسلم میں پائی جاتی ہے۔ عاقبت کے لئے مفید نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ پھر کسی موقع پر بتائی جائیگی طریقہ یہی ہے جو میں نے بتایا۔ علم میں نے آپ کو بتا دیا۔ رہا عمل کا طریقہ وہ تجربہ کار آدمی ہی بتا سکتا ہے۔ جیسے نسخہ اور حکیم، کہ اس کا صحیح طریقۂ استعمال حکیم ہی بتا سکتا ہے۔

تو معجزہ اور کرامت کی تعریف جو کی جاتی ہے۔ وہ تمام کتابوں میں یہی ہے کہ خرقِ عادت فعل اگر نبی کے ہاتھ پر صادر ہو تو معجزہ اور ولی کے ہاتھ پر صادر ہو تو کرامت اور غیر مسلم کے ہاتھ پر ہو تو استدراج۔ مگر یہ غلط ہے۔ نبی تو خود معجزے سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ اس صورت میں صحیح ہو کہ پہلے ہی معلوم ہو۔ پھر خرقِ عادت فعل صادر ہو تو معجزہ سمجھیں گے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ نبی کی نبوت کی تصدیق ہی جب کی جائے گی جب وہ

معجزہ دکھلائے گا۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو دور لازم آئیگا کہ نبی سے معجزہ ہو اور معجزے سے نبی ہو۔ تو معجزہ کی یہ تعریف نہیں ہے۔ اصل تعریف معجزہ کی یہ ہے کہ مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر ایسا خرقِ عادت فعل صادر ہو، جو انسانی جسم اور رُوح کے خلاف ہو۔ یعنی پوری جسمانیت اور رُوحانیت ایسے فعل کے کرنے سے عاجز ہو تو یہ خرق عادت فعل معجزہ کہلائے گا۔

معجزہ کا معارضہ نہیں ہو سکتا۔ کرامت کا معارضہ ہو سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ولی کی ہمت نہیں جو دعویٰ کرے۔ جس طرح ایٹم بم ایجاد کرنے والے نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس جیسا یا اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا۔ مگر نبی دعویٰ کرتا ہے یہ اس کی تقویتِ قلب کی بناء پر ہے۔

دعویٰ کا مادہ قوت قلبی ہے۔ فرمایا۔ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا... (بقرہ آیت) اگر تم نہیں کر سکے اور ہرگز نہیں کر سکو گے۔ قیامت تک تو نہیں کر سکتا مگر کرامت کسبی چیز ہے۔ جو محنت کرے گا جو مشقت کرے گا وہ حاصل کرے گا۔

ولی کے ہاتھ سے جو خرق عادت فعل ہو گا وہ عادتِ جُسمانی کے خلاف ہو گا — عادتِ رُوحانی کے خلاف نہیں ہو گا۔ اگر جسمانی اور رُوحانی دونوں کے خلاف ہو گا تو تمام عالم کی عادت کے خلاف ہو گیا۔ یہ فعل نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ یہی معجزہ ہے۔ دونوں کا فرق واضح ہو گیا۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحقیق

سوال:۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا؟

جواب:۔ علم غیب تھا، ثبوت، اللہ تبارک وتعالے نے فرمایا۔

ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء
اللہ تعالے غیب پر تم کو مطلع نہیں کرتا ولیکن اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے
(غیب پر مطلع کرنے کے لئے) چن لیتا ہے اور فرمایا فلا یظہر علی غیبہ احدا
الا من ارتضی من رسول اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ بجز اس رسول کے
کہ جس سے وہ راضی ہو یعنی رسول مرتضٰی کے علاوہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں
کرتا اور فرمایا وما ھو علی الغیب بضنین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب پر بخیل
نہیں ہیں ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب
پر اللہ تعالے نے اطلاع کر دی تھی اور علم غیب کا ان پر اظہار کر دیا تھا۔ اور ان
غیب کی باتیں بتانے میں آپ بخل بھی نہیں کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ علم
غیب ہر رسول کو نہیں تھا چہ جائیکہ صدیقین اور عرفا و صلحا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا فلا یظہر علی غیبہ احداً کسی پر بھی غیب کا اظہار نہیں کرتا بجز
رسول مرتضٰی اور رسول مجتبیٰ کے۔ تو یہ کہنا کہ علم غیب غیر نبی کو بھی ہوتا ہے یہ

بالکل غلط ہے کیونکہ نبیوں میں سے ہر نبی کو علم غیب نہیں ہوتا، میں کہتا ہوں کہ علم غیب اور چیز ہے اور وحی اور چیز ہے کیونکہ ہر نبی صاحب وحی ہے بغیر وحی کے نبی ہو ہی نہیں سکتا اور ہر نبی صاحب علم غیب نہیں ہے جیسا کہ اوپر کی دونوں آیتوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سے صاف واضح ہو گیا ہے کہ وحی اور چیز ہے اور علم غیب اور چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غیب کا اظہار ہوتا وحی ہی سے ہے بہر حال غیب پر مطلع ہونا یہ خاصہ رسول مجتبیٰ اور رسول مرتضیٰ کا ہے اور اجماع سے یہ ثابت ہو چکا کہ رسول مجتبیٰ اور رسول مرتضیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب پر مطلع تھے یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مطلع ہونا اور چیز ہے مطلع کرنا اور چیز ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مطلع کرنے والا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مطلع ہونے والے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب علم غیب ثابت ہو گیا تو اس وقت آپ کو عالم الغیب کہنا درست ہے یا نہیں۔

جواب: علم غیب کا ثبوت یہ نہیں چاہتا کہ جو شخص غیب جانتا ہو اس پر عالم الغیب بولا جا سکے کیونکہ اسما کا اطلاق شرعی ہے عقلی نہیں ہے یعنی فعل کا ثبوت یا مصدر کا ثبوت اسم فاعل کے اطلاق کو عقلاً چاہتا ہے اور یہ عقلی اقتضا شرعی اقتضا کو مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً یرید اللہ کے معنی اللہ ارادہ کرتا ہے کے ہیں تو ارادہ کرتا ہے کا اللہ کے لئے ثبوت یہ نہیں چاہتا کہ ارادہ کرتا ہے کا اسم فاعل یعنی مرید کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق ہو اور اللہ کو مرید کہا جائے اگرچہ عقلاً یہ صحیح ہے کہ جس کے لئے "ارادہ کرتا ہے" ثابت ہو اس پر مرید کا اطلاق درست ہو لیکن شرعاً درست

نہیں ہے جس طرح کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سوئر کو پیدا کیا تو سوئر کے پیدا کرنے کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بات نہیں چاہتا کہ اس کا اسم فاعل یعنی سوئر کے پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ پر بولا جائے جس طرح مکر اللہ اللہ نے مکر کیا تو "مکر کیا" کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ اس کا اسم فاعل ماکر اللہ تعالیٰ پر بولا جائے اور اللہ تعالیٰ کو ماکر کہا جائے۔ جس طرح یعذب اللہ ۔ اللہ عذاب کرے گا کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ عذاب کرنے والا یعنی معذب اللہ تعالیٰ پر بولا جائے اور اللہ تعالیٰ کو معذب کہا جائے سیدخلھم اللّٰہ فی رحمتہ اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو رحمت میں داخل کرے گا تو داخل کرے گا کا ثبوت یہ نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ پر مدخل بولا جائے غرضیکہ بے شمار افعال اور مصادر اللہ تعالیٰ کے لئے قرآن شریف میں ثابت ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے اسم فاعل بھی اللہ تعالیٰ پر بولے جائیں۔ بالکل اسی طرح علم غیب کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حق ہے لیکن لفظ عالم الغیب کا اطلاق شرع سے ثابت ہوئے بغیر ہم عقل سے نہیں کر سکتے۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا (اور آپ کے علاوہ بعض دیگر انبیاء تک کو بھی علم غیب نہ تھا اور غیر انبیاء خواہ وہ صدیقین ہوں خواہ اولیائے کرام ہوں کسی کو بھی علم غیب نہ تھا) اور لفظ عالم الغیب کا اطلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شرع سے ثابت نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت میں آیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفتی نام جب تک کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی دوسرے کے لئے اطلاق نہ کئے جائیں اس وقت تک دوسرے پر اطلاق شرعاً صحیح نہیں ہے۔

سوال:۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہیں ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر۔ اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو بہت کچھ بھلائی حاصل کر لیتا۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علم غیب نہیں تھا اور نیز فرمایا قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ کہہ دو کہ آسمانوں والے اور زمین والے کوئی بھی اللہ کے علاوہ غیب کو نہیں جانتے اس آیت سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کو علم غیب نہیں تھا۔ اس کا حل یہ ہے کہ دونوں کلام اللہ ہیں دونوں حق ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی علم غیب نہیں جانتا یہ بھی حق ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو اطلاع کر دے اور جس پر اظہار کر دے یہ بھی حق ہے لہٰذا دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ علم غیب کے ثبوت کی آیت علم غیب کی نفی کی آیت کے بعد نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ ایک آیت جو سورۃ آل عمران والی ہے وہ تو قطعی بعد میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ مدنی ہے اور ایک آیت سورۃ جن والی اگرچہ مکی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کے بعد نازل ہوئی ہو کیونکہ یہ دونوں آیتیں بھی مکی ہی ہیں یعنی شروع میں کسی کو علم غیب نہ ہو۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب دیا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علم غیب سے یہاں مراد پورے علم سے ہو اور جزوی علم چونکہ پورا علم نہیں ہے اس لئے اپنی ذاتی علم کی نفی کی کیونکہ اللہ نے جتنا چاہا اپنے نبی کو علم دیا ما یعلم جنود ربک الا ھو پورا علم نہیں دیا۔

سوال:۔ علم غیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی تھا یا جزوی تھا۔

جواب:۔ اس کی کوئی تفصیل ان آیتوں میں نہیں ہے جن آیتوں سے

ان کے لئے علم غیب ثابت ہے اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ غیب سے اشیاء غائبہ اگر مراد ہوں تو ان اشیاء کا علم اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ اللہ کے غیب کا علم اہم ہے کیونکہ یہ تمام اشیاء نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمتر ہیں اور آیت فلا یظہر علی غیبہ میں غیب کا لفظ اللہ کی طرف مضاف ہے تو آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بھید اور اپنے غیب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر کر دیا کیونکہ کائنات سماوی اور ارضی تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر بھی ظاہر کر دی تھی لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا لنریہ من آیٰتنا تاکہ ہم اپنی نشانیوں میں سے اس کو دکھا دیں۔ اس میں صراحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آیات اللہ دکھائی گئیں اور ابراہیم خلیل اللہ کو آیات سماوی و ارضی دکھائی گئیں۔ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب پر نبی کو مطلع کر دیا اپنے بھید پر نبی کو مطلع کر دیا۔ جس پر دیگر انبیاء کو نہیں مطلع کیا۔ اگرچہ ہو سکتا ہے کہ مخلوق غیب اور مخلوق کے بھیدوں کو دیگر انبیاء کو بھی مطلع کر دیا ہو۔ لیکن اپنا غیب کسی کو نہیں تبلایا۔ سوائے رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اولیائے کرام اکثر آنے والے واقعات کی خبر دے دیا کرتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولیاء کو خبریں معلوم ہوتی ہیں وہ خود ان اولیاء کے لئے بھی ظنی ہوتی ہیں اس لئے اس کا کچھ بھی تعلق علم غیب سے نہیں ہے اور نبی کو یقین ہوتا ہے نبی کا علم یقینی ہوتا ہے اور وہ علم یقینی ہمارے علم یقینی سے بالکل مختلف ہوتا ہے کیونکہ اولیاء کو جو یقین ہوتا ہے وہ اس نبی کے ہی واسطے سے ہوتا ہے خواہ وہ علم مکاشفہ سے ہو خواہ دلیل سے ہو۔ ہر صورت میں نبی کا واسطہ ہوتا ہے۔ اس لئے اولیاء کی توحید کا یقین بھی انبیاء کے یقین کی مثل نہیں ہوتا۔

لہٰذا نبی کے علم غیب کے علاوہ جو نبی کا عام علم ہے اس کی شکل بھی دیگر صدیقین کے لئے محال ہے چہ جائیکہ علم غیب میں غیر نبی شامل ہو۔ ہاں بےشک انبیاء کے لئے غیب مخلوق کا اظہار ممکن ہے لیکن غیب خالق سو وہ ان کے لئے بھی نہیں ہے جیسا کہ آیت سے ظاہر ہے۔ اب یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ عام انسانوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یا تو حواس کے ذریعہ اولاً ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس علم میں جانور بھی شریک ہیں اور کبھی حس کی تکرار سے علم حاصل ہوتا ہے یعنی بار بار کے مشاہدہ سے اس کو تجربہ کہتے ہیں اور کبھی عقل سے اولاً علم حاصل ہوتا ہے جیسے کل بڑا ہے جز سے اور کبھی عقل کے عمل کی تکرار سے علم حاصل ہوتا ہے یہ علم نظری و کسبی کہلاتا ہے بس عام انسانوں کو یہ دو قسم کا علم ہوتا ہے۔ بدیہی اور نظری بدیہی تو بالفعل ہوتا ہے اور کسبی بالقوۃ ہوتا ہے لیکن عرفاء اور اولیاء کو ان دو قسموں کے علاوہ علم ہوتا ہے یعنی حس اور عقل کے علاوہ روح سے علم حاصل ہوتا ہے یہ علم مکاشفہ کہلاتا ہے جو صرف روح سے حاصل ہوتا ہے اور روح ہی کو حاصل ہوتا ہے مگر حس اور نظر سے حاصل نہیں ہوتا (ارباب نظر اور علماء ظاہر کو یہ علم حاصل نہیں ہوتا اور نظر سے یہ علم حاصل بھی نہیں ہو سکتا) اور نبی کو ان تینوں قسموں کے علاوہ علم حاصل ہوتا ہے۔ نبی ارءۃ الٰہی سے علم حاصل کرتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰىكَ اللّٰهُ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم صادر کرو۔ اس علم کی بناء پر جو تم کو ارءۃ الٰہی سے حاصل ہوا ہے۔ یعنی اللہ نے تجھے دکھایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے علم کی روشنی میں نبی کو ہر شے کی رویت کرا دیتا ہے۔ یعنی نبی اپنی ان دونوں

آنکھوں سے ان اشیاء کو دیکھتا ہے جو عوام حسی آنکھوں سے اور علماء عقلی آنکھ سے اور عرفاء روح کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ نبی اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ نبی ملائکہ کو جنت کو دوزخ کو۔ جنتی۔ دوزخی کو دیکھ سکتا ہے۔ پس پشت چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اس بیان سے ظاہر ہوگیا کہ صدیقین انبیاء کے علوم کا اندازہ مکاشفات صدیقیہ سے بھی نہیں کر سکتے۔ جس طرح حیوانات انسانی علوم کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تمام انسان نبی کے علوم کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

تحقیق

نبی کس کو کہتے ہیں؟ نبی اس بشر کو کہتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کلام کرے

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ

اور اللہ تعالیٰ بشر سے تین طریقے سے کلام کرتا ہے اور یہ تینوں طریقے وحی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشاء یعنی اللہ تعالیٰ بشر سے کلام کرتا ہے۔ وحی سے۔ پردہ کے پیچھے سے۔ یا ایک رسول فرشتہ کو بھیجتا ہے۔ وہ فرشتہ اللہ کی مشیت کے مطابق اللہ کی اجازت سے وحی کر دیتا ہے یہ تینوں طریقے وحی ہیں۔ پہلی وحی میں اور تیسری میں وحی لفظ صراحتاً موجود ہے اور من وراء حجاب بھی وحی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا فاستمع لما یوحی سن جو وحی ہو رہی ہے پس پردہ وحی ہے بس ان تینوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے کلام کرنا ہی نبوت ہے اور جس بشر سے کلام ہو وہ بشر نبی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا آدم

یا نوح، یا ابراهیم، یا موسیٰ، یا داؤد، یا زکریا، یا یحییٰ یا عیسیٰ

بس اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب ہی نبوت ہے اور مخاطب نبی ہے اب اگر اس قسم
کے خطاب کے بعد لوگوں کی تبلیغ کے لئے دوسرا خطاب ہو تو یہ دوسرا خطاب ہی
رسالت ہے۔ جیسے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلا خطاب ہوا اقراء باسم ربک
اپنے رب کا نام پڑھ بس یہ خطاب ہی نبوت ہے۔ اور اس کے بعد جب یہ
خطاب ہوا وانذر عشیرتک الاقربین اپنے قرابت دار کنبے کو
ڈرا۔ یہ خطاب رسالت ہے۔ نبی اور رسول کا یہی فرق ہے۔ یہ صحیح اور انتہائی تحقیق ہے
جیسا کہ فرمایا وکم ارسلنا من نبی فی الاولین اگلوں میں بہت سے انبیاء کو رسول کر کے
بھیجا تھا یعنی پہلے وہ حضرات صرف انبیاء تھے پھر ان کو اگلوں میں رسول مقرر کر کے
اگلوں کی نصیحت کے لئے بھیجا تھا جن لوگوں نے صاحب کتاب کو رسول کہا اور بے کتاب
والے کو نبی کہا۔ انہوں نے غلط کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ولقد آتینا موسیٰ الکتاب
وقفینا من بعدہ بالرسل ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد رسولوں کو بھیجا
اور ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو حضرات رسل تشریف لائے ان میں سے
بیشتر صاحب کتاب نہ تھے۔ اور رسول تھے فرمایا انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی ونور
یحکم بھا النبیون ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اس تورات کے
ساتھ انبیاء احکام صادر فرمایا کرتے تھے۔ یہ انبیاء موسےٰ کے بعد تھے۔ اور رسول تھے
جیسا کہ اوپر کی آیت میں تصریح ہے۔ لیکن یہ انبیاءؑ اس آیت کے مطابق صاحب کتاب
نہ تھے بلکہ تورات ہی پر عمل کرایا کرتے تھے۔ نیز علماء کا اجماع ہے کہ حضرت اسحٰق اور حضرت
یعقوب علیہ السلام رسول تھے اور صاحب کتاب نہ تھے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے
کہ کتابیں ۱۰۴ نازل ہوئیں اور رسل ۳۱۳ تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول کے

لئے کتاب کا ہونا لازم نہیں ہے ورنہ جتنے رسول ہوں گے اتنی ہی کتابیں ہونگی۔ حالاں کہ حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں رسول تھے فرمایا انا رسولا ربک تیرے رب کے ہم دونوں رسول ہیں تو چاہیئے کہ ان دونوں رسولوں کو دو کتابیں ملیتں۔ حالانکہ دونوں کو ایک ہی کتاب ملی۔ فرمایا وآتینا ھما الکتاب المبین۔ ہم نے دونوں کو ایک روشن کتاب دی متقدمین علماء کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص ہے یعنی جو رسول ہے وہ نبی ہے اور یہ نہیں ہے کہ جو نبی ہو وہ رسول ہو۔ میں کہتا ہوں کہ جب نبی کے معنی ہی نہ معلوم ہوں تو پھر عام اور خاص کے کیا معنی۔ پہلے نبی کے معنی بتاؤ پھر اس میں تخصیص کر کے اس نبی کو رسول بتاؤ غرضیکہ اس وقت تک رسول اور نبی کا صحیح فرق نہیں معلوم ہوا۔ صحیح وہی ہے جو میں نے بیان کیا یعنی جس بشر پر وحی ہو وہ نبی ہے پھر اس کے بعد تبلیغ کی وحی ہوا شروع ہی سے تبلیغ کی وحی ہو تو وہ رسول ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ نبی اگر کسی شخص کو نبی کہدے تو وہ نبی ہے۔ یہ بات فی نفسہ اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن نبی کی یہ تعریف نہیں ہو سکتی کیوں کہ نبی کو تو بہت سے نبیوں کا علم ہی نہیں ہوتا اور جبکہ علم ہی نہیں تو پھر وہ اس کی نبوت کی خبر کیا دے گا فرمایا ورسلا لم نقصصھم علیک کچھ ایسے رسول ہیں کہ جن کا ہم نے تجھ سے ذکر نہیں کیا۔ تو یہ حضرات قطعاً نبی ہیں لیکن نبی نے ان کے نبی ہونے کی خبر نہیں دی کیونکہ نبی اس کو جانتا ہی نہیں۔ نیز جس نبی نے خبر دی ہے وہ کیونکر نبی ہوگا۔ یہ تو اس نبی کے کہنے سے نبی ہو گیا مگر کہنے والا کیونکر نبی ہو گیا اور کہنے سے نبی ہو گیا تو یا دور لازم آئے گا یا تسلسل اور یہ دونوں محال ہیں اور ایسا بھی کہا گیا ہے کہ خواب میں اگر وحی ہو تو نبی ہے بیداری میں ہو تو رسول ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ نبی کا خواب اور بیداری ایک ہی درجہ کی چیز ہے نبی کیلئے

خواب کی کمزوری اور بیداری کی قوت متصور نہیں ہے۔ علامہ ابی سعود کی تفسیر میں نبی اور رسول کا فرق اس طرح بتایا ہے کہ رسول تو وہ ہے جو شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے اور نبی وہ ہے جو جدید شریعت کی بھی تبلیغ کرے اور قدیم کی بھی تبلیغ کرے یعنی خواہ جدید کی کرے خواہ قدیم کی کرے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے رسول کی یہ تعریف کی کہ وہ جدید شریعت کی تبلیغ کرے تو یہ تعریف ان رسولوں پر صادق نہیں آتی جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وقفینا من بعدہ بالرسل ہم نے موسیٰ کے بعد یکے بعد دیگرے رسولوں کو بھیجا۔ اور یہ سب رسول شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ شریعتِ قدیمہ کی تبلیغ کرتے تھے جیسا کہ یحکم بہا النبیون سے ظاہر ہے یعنی توراۃ کے ساتھ حکم دیا کرتے تھے کہ یہ انبیاء جدید شریعت نہیں پیش کرتے تھے اس کے باوجود ان کو اللہ نے رسول کہا اور تم نے رسول کی یہ تعریف کی تھی کہ وہ جدید شریعت پیش کرے اور نیز تبلیغ ہی رسالت ہے اور اس وقت رسول اور نبی میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ رسول کی دو قسمیں ہو گئیں ایک وہ جو جدید شریعت کی تبلیغ کرے اور ایک وہ جو عام شریعت کی۔ یعنی جدید کی یا قدیم کی تبلیغ کرے۔ غرضیکہ یہ تعریف بھی صحیح نہیں ہے۔ اس زمانے کے ایک اردو تفسیر اور ترجمے کے مفسر نے یہی بات لکھی ہے اور کہا ہے کہ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدید پہنچادے خواہ وہ رسول نبی ہو یا نہ ہو جیسے ملائکہ کہ ان پر رسل کا اطلاق کیا گیا ہے اور وہ انبیاء نہیں ہیں اور وہ نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو خواہ شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ کی تبلیغ کرے جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل کہ شریعت موسوی کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس مفسر نے اس میں خرابی پیدا کر دی۔ پہلی خرابی تو یہ تھی کہ انبیاء بنی اسرائیل کو اللہ نے رسول کہا ہے۔ وقفینا من بعدہ بالرسل ہم

نے موسیٰ کے بعد پیچھے بعد دیگرے رسول بھیجے اس مفسر نے رسول کی تعریف میں یہ لفظ بڑھا
کر کہ خواہ وہ رسول نبی ہو یا نہ ہو۔ جیسے ملائکہ کہ ان پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے اس
عبارت کے بڑھانے سے اور خرابی پیدا ہو گئی اور وہ یہ ہے کہ فرشتہ پر وحی آتی ہے اور فرشتہ
جدید اور قدیم شریعت کی تبلیغ رسول بشری اور نبی بشری دونوں کو کرتا ہے اور تم نے
یہ تعریف نبی کی کی ہے کہ نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو۔ خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ
کرے خواہ قدیمہ کی۔ یہ تعریف بالکل فرشتہ پر صادق آتی ہے۔ فرشتہ کو وحی ہوتی ہے۔ فرمایا
اذ یوحی ربک الی الملائکۃ جب تیرے رب نے ملائکہ کو وحی کی اس سے تو فرشتہ
صاحب وحی ہو گیا۔ اور حضرت موسیٰؑ کو فرشتہ نے جدید شریعت کی تبلیغ کی اور بنی اسرائیل
کے نبیوں کو قدیم شریعت کی تبلیغ کی تو اس وقت فرشتہ رسول نہ رہا بلکہ نبی ہو گیا اور تم کہتے
ہو کہ فرشتہ نبی نہیں ہے۔ اور نیز نبی کی اس تعریف پر خواہ یہ علامہ ابی مسعود کی ہو یا اس
اردو کے مفسر کی ہو حضرت عیسیٰؑ رسول نہیں رہتے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
قدیم شریعت یعنی توراۃ اور جدید شریعت یعنی انجیل دونوں کی تبلیغ کرتے تھے اور تم
نے نبی کی یہ تعریف کی کہ خواہ قدیم شریعت کی خواہ جدید شریعت کی تبلیغ کرے وہ نبی ہے
تو عیسیٰ علیہ السلام توریت و انجیل دونوں کی تبلیغ کرتے تھے۔ ویعلمہم الکتاب
والحکمۃ والتوراۃ والانجیل وہ یعنی عیسیٰؑ کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتے
تھے تو اس تعریف پر وہ نبی ہوئے رسول نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا
ما المسیح ابن مریم الا رسول مسیح ابن مریم رسول ہی ہے۔ الغرض جس
نے مبلغ شریعت جدیدہ کو رسول کہا اور مبلغ شریعت جدید اور قدیمہ کو نبی کہا غلطی کی۔
دیکھو حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا ان یونس لمن المرسلین یونس

علیہ السلام رسول ہیں حالانکہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور تمہاری تعریف کے مطابق شریعت قدیمہ کے مبلغ تھے۔ اور اسی اردو تفسیر کے مفسر نے جیسی مثال رسول غیر نبی کی ملک کی دی ہے ایسی ہی مثال اذجاءها المرسلون میں جو رسول ہیں ان کو بھی رسول غیر نبی بتایا ہے۔ حالانکہ کوئی رسول اللہ بشری غیر نبی نہیں ہو سکتا معتزلہ نے کہا ہے کہ رسول اور نبی ایک ہی چیز ہے۔ ان کا یہ قول قرآن اور حدیث دونوں کے خلاف ہے حدیث تو وہ جو اوپر گذری اور قرآن کی یہ آیت وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی رسول پر نبی کا عطف مغایرۃ کو چاہتا ہے۔ اگر مغایرۃ نہیں ہوگی تو معنی یہ ہو جائیں گے کہ ہم نے تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول اور نہ کوئی رسول نہیں بھیجا یا نہ کوئی نبی اور نہ کوئی نبی نہیں بھیجا۔ اور یہ معنی صحیح نہیں ہیں اس سے ظاہر ہو گیا کہ رسول اور چیز ہے اور نبی اور چیز ہے۔

نبی وہ انسان اور بشر ہے جس پر وحی ہو اور تبلیغ نہ کرے اور رسول وہ نبی ہے جو تبلیغ بھی کرے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدعت

بدعت کیا چیز ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو فعل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہوا، اور پھر ہوا وہ بدعت ہے۔

یہ تعریف صحیح نہیں ہے کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں کچھ ایسے افعال ہوئے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھے اور وہ بدعت نہیں کہلائے جیسے جمعہ کی دوسری آذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے رائج ہوئی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو فعل نبی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہوا اور پھر ہوا وہ بدعت ہے۔ یہ تعریف بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اجتہاد صحابہ رضی اللہ عنہ کے بعد رائج ہوا اور وہ بدعت نہیں ہے، احادیث کی تدوین صحابہ رضی اللہ عنہم کے بہت بعد ہوئی اور یہ تدوین بدعت نہیں کہلائیگی۔ میں کہتا ہوں کہ بدعت کا حکم دین کے حکم کے خلاف ہے تو لا بد جب تک دین کا حکم معلوم نہ ہو دین کے خلاف کا حکم معلوم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً نماز ۵ وقت کی فرض ہے۔ روزے پورے رمضان کے مہینے کے فرض ہیں تو جو شخص یہ نہیں جانتا کہ یہ دینی حکم ہے وہ یہ نہیں جان سکتا کہ چار یا چھ وقت کی نماز کا حکم بدعت ہے یا رمضان کے مہینہ سے کم یا مہینہ سے زیادہ روزے رکھنے کا حکم بدعت اور لادینی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دینی احکام کی صحیح تعریف معلوم ہو جائے۔ تاکہ دینی احکام کے خلاف جتنے احکام ہیں وہ سب لادینی اور

بدعت قرار دیے جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

یا ایھا الذین امنو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی
الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ
والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر
ذالک خیر واحسن تاویلا ؕ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جو
اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پھر تمہیں اگر کسی شے میں اختلاف
ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
طرف اس کو رجوع کرلو۔ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ اور روز جزا پر
ایمان ہے۔ یہ بہترین شے ہے اور اس کا بہترین انجام ہے۔

اس آیت شریف میں اللہ تعالیٰ نے دینی احکام کی مکمل تصریح فرمادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔ اللہ کی اطاعت کرو چونکہ ذی شعور کی اطاعت مطاع کی ذات کی نہیں ہوتی۔ بلکہ مطاع کے قول اور حکم کی اطاعت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قول کی اطاعت کیجائے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اطاعت درحقیقت کلام اللہ اور قرآن شریف کی اطاعت ہے پس جو حکم قرآن شریف سے ثابت ہو وہ قطعاً دین ہے۔

پھر فرمایا:۔ واطیعوا الرسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

کرو۔ یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت درحقیقت قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرو۔ پس جو حکم حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو وہ قطعاً دین ہے۔

پھر واولی الامر منکم فرمایا ہے تم سے جو اولوالامر ہیں انکی اطاعت کرو۔ تم میں سے کی قید سے غیر مسلم کی اطاعت خارج ہوگئی۔ اور اولو چونکہ ذو کی جمع ہے اس لئے ذوالامر یعنی واحد کی اطاعت خارج ہوگئی۔ اگر ذوالامر واحد واحد ہیں تو ان کی اطاعت واجب نہیں ہے خواہ ذوالامر یکے بعد دیگرے ہو خواہ نہ ہو، اکیلا ہو ہر صورت میں واحد ذوالامر واجب الاتباع نہیں ہے۔ بلکہ ذوالامراور اولوالامر کی اطاعت واجب ہے۔ اور امر کے معنی شوریٰ کے ہیں۔ وامرھم شوریٰ بینھم اور ان کا امر ان کا آپس میں مشورہ کرنا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اہل مشورہ جن کو ارباب حل وعقد کہا جاتا ہے اور جو دینی معاملات میں مشورہ دینے کی قابلیت رکھتے ہیں وہ سب کسی مسئلہ پر متفق ہوکر کوئی حکم صادر کریں تو انکی اطاعت کرو اور اس حکم کو مان لو اور اس پر عمل کرو۔ اور یہ وہ مسئلہ ہوگا جس کا ذکر قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ یا مسئلہ کا ذکر ہو اور اس کا حل نصاً یا استدلالاً مذکور نہ ہو۔ ایسے مسئلہ میں اولوالامر کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔ اور اس کا نام اجماع ہے۔ جیسے شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ حدیث میں مذکور ہے اور حدیث کا حکم ظنی ہے اور رجم قطعی ہے۔ لہٰذا رجم قطعی درحقیقت اجماع سے ثابت ہے۔ اور جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی خفائیت مع حضرت علیؓ اجماع سے ثابت ہے۔ پھر فرمایا اگر کوئی حکم قرآن وحدیث سے صراحتاً ثابت نہ ہو

اور اجماع بھی نہ ہو یا نہ ہوسکے تو پھر اس کو اللہ اور رسول کی طرف یعنی اللہ کے قول اور رسول کے قول کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ اس قسم کے مسئلہ کا قرآن وحدیث نے کیا جواب دیا ہے۔ اور کیا حل بتایا ہے اور بس وہی حل اس مسئلہ کو دیدو اور وہی جواب اس مسئلہ کا دیدو مثلاً افیون چانڈو اور بھنگ کی حرمت یا حلت کا مسئلہ پیش ہو تو اس سے ملتا جلتا مسئلہ قرآن وحدیث میں تلاش کرو۔ اور جو حکم اس مسئلہ کا ہے وہی حکم اس کا ہے۔ بھنگ چانڈو وغیرہ شراب سے نشہ میں ملتے جلتے ہیں اور شراب کا حکم حرمت کا ہے لہذا ان اشیاء کا حکم بھی حرمت کا ہے یہ بھی حرام ہے اس کا نام قیاس ہے جو تمام مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کیا کرتے ہیں یعنی احکام شرعیہ کو ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک سے ثابت کرنا بہترین عمل ہے

اس کے بعد فرمایا یہ بہترین چیز ہے۔ اور اس کا انجام بھی بہترین ہے۔

اور اس کی بہترین جزاء ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کی چاروں دلیلوں کا ذکر کیا ہے۔ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔ لہذا دین وہ ہے جو ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہو۔ اور جو شئے ان چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو وہ دین نہیں ہے۔ اب رہا بدعت۔ تو بدعت وہ چیز ہے جو ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور پھر دین کی طرف منسوب ہو۔ اور جو شئے ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور دین کی طرف بھی منسوب نہ ہو تو یہ بات بدعت نہیں کہلاتی۔ مثلاً تین تیجے پندرہ ہوتے ہیں۔ یہ حق ہے اور کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے مگر دین کی طرف منسوب بھی نہیں ہے تو یہ بات بدعت نہیں کہلائیگی۔ لیکن یہ بات کہ اللہ تعالےٰ کا دیدار قیامت کے دن مومنوں کو نہیں ہوگا۔ یہ بات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے اس کے باوجود ایک جماعت نے اسے دینی

مسئلہ قرار دیا ہے۔ سو یہ بدعت ہے۔ لب لباب یہ ہے کہ ادلۂ اربعہ شرعیہ سے کوئی مسئلہ
ثابت نہ ہو اور پھر اس کو دین کا مسئلہ قرار دیا جائے یہ بدعت ہے۔ تنبیہ اس آیت میں
اولوالامر سے مراد اجماع ہے۔ خلفاء یا امراء یا آئمہ مراد نہیں ہے کیونکہ خلفاء اور امراء
اور آئمہ کی اطاعت مشروط ہے۔ اس شرط سے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔ جیسے
ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔ اسی طرح اکابر
آئمہ، خلفاء اور امراء کی اطاعت قرآن وحدیث سے مطابقت کے ساتھ مشروط ہے اور
اولوالامر کی اطاعت مشروط نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت مشروط نہیں ہے
کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔ اور جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت مشروط
نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو اسی طرح اولوالامر کی اطاعت میں قرآن وحدیث کی مطابقت
شرط نہیں ہے۔ ورنہ پھر اس صورت میں اولوالامر کی اطاعت درحقیقت قرآن وحدیث
کی اطاعت ہوگی اور اولوالامر کی اطاعت کوئی مستقل دلیل اور حجت نہیں رہیگی۔ اور
اسی طرح اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں قرآن کی مطابقت شرط ہوتی تو
اس وقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستقل حجت نہیں ہوگی۔ بلکہ قرآن ہی
حجت ہوگا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں عقل کی مطابقت شرط ہوگی تو کتاب اللہ مستقل
حجت نہیں رہے گی بلکہ عقل مستقل حجت ہو جائے گی پس حق یہ ہے کہ کتاب اللہ مستقل حجت ہے بلا شرط۔
قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستقل حجت ہے بلا شرط اور اولوالامر کا اجماع مستقل حجت ہے
بلا شرط۔ ہاں بیشک قیاس مشروط حجت ہے کیونکہ اس میں تنازعہ کی قید لگی ہوئی ہے۔
اگر تنازعہ نہیں ہے تو پھر وہی تینوں حجتیں کافی ہیں۔ اور تنازعہ اور اختلاف اس وقت
ہوتا ہے کہ جب مسئلہ کیلئے دلیل نہ ہو۔ لہٰذا دلیل پیدا کرنے کیلئے قیاس کی ضرورت پڑتی ہے

تنبیہ بعض تو بعض منکرین قیاس نے فردوہ اِلی اللہ وَالرسُول سے قیاس کی نفی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی طرف رجوع ہونا چاہیئے نہ کہ قیاس کی طرف ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن وحدیث کی طرف رجوع تو اطیعوا اللہ وَاطیعوا الرسُول۔ سے ثابت ہے اور یہ رجوع بلا شرط ہے اور فردوہ میں رد اور رجوع بشرط تنازعہ ہے تو یہ رجوع مشروط غیر مشروط رجوع کا غیر ہے۔ حاصل یہ ہے۔ رجوع اوّل اور رجوع غیر مشروط تو نص کی طرف ہے۔ اور رجوع ثانی اور رجوع مشروط بشرط تنازعہ نص کیطرف نہیں ہے۔ بلکہ نص میں جو علت پنہاں ہے اس کی طرف یہ رجوع ہے۔ اور اسی کا نام قیاس ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے۔

اب یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت بغیر مطابقت عقل کے ہے یا نہیں اس کو ہم علم کلام میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ حکم الٰہی عقل کے تابع نہیں ہے کیوں کہ عقل کا وجود امر الٰہی یعنی کُن سے ہوا ہے۔ امر الٰہی عقل اور جملہ کائنات سے مقدم ہے اس لئے امر کے ساری کائنات اور عقل تابع ہوگی۔ امر کسی کائنات اور کسی عقل کے تابع نہیں ہوگا۔ اس لئے حکم الٰہی اور امر الٰہی کیلئے عقل کی مطابقت شرط نہیں ہے دیکھو آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر روح پھونکی حوا علیہا السلام کو آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو مریم علیہا السلام سے پیدا کیا۔ باقی تمام انسانوں کو مرد اور عورت کے اجتماع سے پیدا کیا۔ یعنی ایک مرد کے بدن کو مٹی سے پیدا کر کے اس میں روح پھونکی۔ ایک عورت کو زندہ مرد سے پیدا کیا۔ ایک مرد کو صرف عورت سے پیدا کیا باقی تمام عورت و مرد کو عورت مرد کے اجتماع سے پیدا کیا۔ بس یہی چار طریق سے انسانوں کی پیدائش معقول ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا منھا خلقنٰکم

اسی مٹی سے تم کو پیدا کرینگے تو زمین سے نباتات کی طرح زندہ انسان اگیں گے عقل سے
تو صرف وہی چار طریقے آرہے تھے۔ اب یہ پانچواں طریقہ ہے کہ مٹی سے زندہ انسان پیدا
کیا جائیگا۔ لہٰذا ہم اس پر بغیر مطابقت عقل کے ایمان لے آئے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم
انکی اطاعت میں قرآن شریف کی مطابقت شرط نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
پر جس طرح قرآن شریف کی وحی ہوتی تھی اسی طرح قرآن شریف کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی۔
کتاب فتنہ انکار حدیث میں اس کے دلائل ہم نے بیان کئے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ کبھی
قرآن کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان فرماتے ہوں اور کبھی وحی غیر قرآن کے
مطابق بیان فرماتے ہوں کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف وحی کے تابع ہیں
خواہ وحی قرآنی ہو یا غیر قرآنی۔ اور اسی وحی غیر قرآنی کا نام حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ہے۔ دیکھو قرآن شریف میں جہاں بھی تَوَفّی کا لفظ بغیر قرینہ کے آیا ہے وہاں توفی کا
لفظ موت ہی کے معنیٰ میں ہے۔ اور لغت عرب میں بھی توفی کا لفظ بغیر قرینہ کے
موت ہی کے معنیٰ میں ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا کہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام حیات ہیں اور اَللّٰہُ یَصطَفِی مِنَ المَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ
اللہ فرشتوں میں سے اور انسانوں سے رسولوں کو چنتا ہے اور چنے گا کیونکہ یصطفی
مضارع اور مستقبل دونوں کیلئے آتا ہے۔ تو مستقبل میں اصطفاء رسالت اس صیغہ مضارع
سے ثابت ہوتی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی
نہیں ہوگا۔ نبوت ختم ہو چکی۔ الغرض بے شمار باتیں ایسی ہیں جو قرآن شریف سے ثابت
نہیں ہیں۔ حدیث شریف سے ثابت ہیں۔ اسی طرح اجماع میں بھی مطابقت قرآن

حدیث کی شرط نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر مطابقت شرط ہوتی تو پھر اجماع کی حجت کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ جب قرآن و حدیث سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے پھر تیسری شے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو مسئلہ خلافت اولیٰ نہ قرآن سے ثابت ہے نہ حدیث سے۔ صرف اجماع سے ثابت ہے۔ اور اسی طرح بے شمار مسائل دینی اجماع سے ثابت ہیں لہٰذا قرآن حدیث اجماع یہ تینوں مستقل حجتیں ہیں یعنی بلا شرط مطابقت۔ ہاں بیشک قیاس غیر مستقل حجت ہے۔ مشروط ہے اور اس کی معنوی مطابقت قرآن و حدیث سے ضروری ہے۔ اس طرح قیاس کو بھی بدعت نہیں کہا جائے گا۔

مثلاً نماز کہ وہ کتاب اور سنت، اور اجماع تینوں دلیلوں سے ثابت ہے اور اس نماز کے بے شمار افراد ہیں تو ہر فرد نماز کے ثبوت کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں نماز کلی کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ لیکن بعض افراد کی نفی کے لیے بھی دلیل کی ضرورت ہے۔ اگر اوقات مکروہہ کی نمازیں منع نہ ہوتیں تو ہر فرد نماز جائز ہوتا۔ اسی طرح تمام مامورات اور منہیات ہیں کہ ان کے کلیات ثابت اور منفی ہیں جو تمام افراد کو لئے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد مثبت منفی میں سے اور منفی مثبت میں سے جب ہوں گے جب مزید دلیل ان بعض کے لئے ہوگی ورنہ ضرورت نہیں ہے۔ ثبوت جزی کے لئے ثبوت کلی کافی ہے۔ نفی جزی کے لئے نفی کلی کافی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کلی کا جواز اس کے ہر فرد کا جواز ہے۔ فرد کے جواز کے لئے مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ ہاں بیشک عدم جواز کے لئے مزید دلیل کی ضرورت ہے مثلاً نماز جائز ہے۔ یہ دلیل سے ثابت ہو گیا اب نماز کے جتنے افراد ہیں وہ سب جائز ہو گئے۔ افراد میں سے ہر ہر فرد کے جواز کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہاں بعض افراد کے عدم جواز کے لئے بے شک

دلیل کی ضرورت ہے. جیسے اوقات مکروہہ کی نماز تو اس نماز کے ناجائز ہونے کے لئے دلیل چاہیئے. اگر اوقات مکروہہ کی نماز کی دلیل یعنی ممانعت نہ آتی تو اوقات مکروہہ میں بھی نماز جائز ہوتی اور جیسے کہ روزہ کہ وہ جائز ہے تو اس کا ہر فرد جائز ہے اور ہر فرد کے جواز کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہے. ہاں بعض افراد ناجائز ہیں. ان کے عدم جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہے. جیسے صوم یوم النحر اور صوم یوم الفطر کہ ان کے عدم جواز کے لئے دلیل چاہیئے. اگر ممانعت نہ آتی تو ان ایام میں بھی روزہ صحیح ہوتا اور جیسے جھوٹ کہ وہ ناجائز ہے تو اس کا ہر فرد ناجائز ہے. ہر ہر فرد کے ناجائز ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہے. ہاں کذب کے بعض افراد کے جائز ہونے کے لئے دلیل چاہیئے. جیسے بے گناہ کا مال اور جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے اگر اس جھوٹ کی اجازت نہ ہوتی تو یہاں بھی جھوٹ ناجائز ہوتا. بدعت اور جیسے کہ اجرار کلمۃ الکفر ناجائز ہے تو اس کا ہر فرد ناجائز ہے ہر فرد کے ناجائز ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں. دلیل تو صرف اجراء کلمۃ الکفر کے ناجائز ہونے کی ہے. ہر فرد کے لئے دلیل نہیں ہے. ہاں اس کے بعض افراد کے جائز ہونے کے لئے بیشک دلیل چاہیئے جیسے اجرار کلمۃ الکفر اکراہ اور جبر کے وقت جائز ہے. اگر اس کی اجازت نہ آتی تو اس وقت اکراہ پر بھی اجرار کلمۃ الکفر ناجائز ہوتا حاصل یہ ہے کہ کلی کا جواز درحقیقت اس کے ہر فرد کا جواز ہے. سوائے ان بعض افراد کے کہ جن کے عدم جواز کی دلیل آگئی یعنی ممانعت اسی طرح کلی کا عدم جواز اس کے ہر فرد کا عدم جواز ہے. سوائے ان بعض افراد کے جن کے جواز کی دلیل آگئی یعنی اجازت مل گئی. اور جب تم یہ ضروری ہدایت سمجھ گئے تو یہ بات پھر خوب سمجھ لو کہ جو کلی جائز ہے. اس کے افراد کے لئے یا اس کے کسی فرد خاص کے جواز کے لئے مزید دلیل کی ضرورت نہیں اس کی دلیل

اس کی کلی ہی کی دلیل ہے۔ ہاں اس کے عدم جواز کے لئے دلیل چاہئے۔ اس کے کسی فرد
کے لئے دلیل نہ ہونے سے اس کا بدعت یا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا بدعت جب ہوگا
کہ جب بدعت اس کی کلی کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ ہوا ورنہ ہی اس فرد کی ممانعت ہو مثلاً
اگر کوئی کہے کہ منگل کے دن جو روزہ رکھے گا۔ اس کو ۲ محل جنت میں ملیں گے۔ تو منگل کے
دن روزہ رکھنے پر ۲ محل ملنے پہ ایسی کلی ہے کہ چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے
ثابت نہیں ہے اور نہ منگل کا روزہ ممنوع ہے لہٰذا اگر کوئی اس نیت سے روزہ رکھیگا کہ اس کو منگل کے روزہ
پر ۲ محل ملیں گے تو یہ روزہ بدعت ہے کیوں کہ بغیر ثبوت شرع کے شرع کی طرف منسوب کردیا کیونکہ جزا
کا اظہار شریعت ہی کی طرف منسوب ہے اور ہم نے جو یہ قید لگائی ہے کہ اس دن کا روزہ ممنوع نہیں ہے
یہ اس لئے کہ اگر ممانعت منگل کے روزے کی ہوتی تو روزہ قطعی حرام ہوجاتا۔ اور یہ ظاہر حرام ہے نہ کہ
بدعت بدعت میں کلی کا عدم ثبوت چاہیے اور جزوی کی عدم ممانعت چاہیے اور پھر یہ حکم شریعت
کی طرف منسوب ہوجانا چاہیے۔ تب جاکے بدعت ہوگی۔ اور اگر کل کا ثبوت نہ ہوا در شرع کی طرف منسوب
نہ ہو تو یہ بدعت نہیں ہے۔ اور اگر شرع خلاصہ بدعت وہ حکم ہے جو دلائل شرعیہ اربعہ میں سے کسی
ایک دلیل سے بھی ثابت نہ ہوا در پھر اس کو دینی اور شرعی جز سمجھا جائے بس بدعت اسی کا نام ہے۔ خواہ یہ
حکم عقائد میں ہو خواہ اعمال میں ہو۔ مثلاً بعض قدما رکا یہ عقیدہ ہے کہ جنت اور دوزخ فنا ہو
ہوجائیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ یہ بدعت ہے۔ کیونکہ کسی دلیل شرعی سے تباہی جنت دجہنم ثابت
نہیں ہے۔ اور پھر اس کو شرعی حیثیت دی گئی۔ اور جیسے بعض اکابر اور ایک اور جماعت سے منقول
ہے کہ دوام عذاب کی وعید کے خلاف کرنا یعنی خلف فی الوعید حق ہے۔

لہٰذا حقانیت خلف فی الوعید بدعت ہے کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے اور اس کے باوجود
شریعت کی طرف منسوب ہے۔ عملی بدعت جیسے کسی مہینے کی کسی معین تاریخ کا روزہ رکھنا اور اس پر

ہزار یا کم و بیش روزوں کا ثواب ظاہر کرنا یہ بدعت ہے۔ کیونکہ یہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے اور اس کے باوجود شریعت کی طرف منسوب ہے۔ یا جیسے کہ ایصال ثواب میں تقرر وقت کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے اس سے قبل یا اس کے بعد ایصال ثواب ہو ہی نہیں سکتا۔ تو بے شک یہ بدعت ہے۔ ہاں تقرر وقت سہولتوں اور آسانیوں اور دیگر مفاد کے پیش نظر صحیح ہے۔

سوال:- صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل کے خلاف بدعت ہے یا نہیں:

جواب:- جن مسائل پر اجماع صحابہ ہے ان کا خلاف بدعت اور ضلالت ہے اور جن مسائل میں اجماع نہیں ہے یا صحابہ کی ایک جماعت یا ایک فرد کسی ایک طرف ہے اور دوسری جماعت یا فرد کسی دوسری طرف ہے وہاں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اکثریت صحابہ پر عمل ہو۔ اور اس میں بدعت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس وقت لازم آتا ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم معاذ اللہ بدعتی ہو جائیں۔ جیسے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک عورت اگر مر جائے اور شوہر اور ماں باپ چھوڑے تو ماں کو ایک تہائی ملنا چاہئے۔ دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کے نزدیک ماں کو شوہر کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اس میں سے ایک تہائی ملنا چاہئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ باقی کی تہائی کتاب اللہ سے ثابت نہیں ہے۔ دیگر حضرات صحابہ نے فرمایا اگر اس صورت میں ماں کو کل کی تہائی دیجائے گی، تو باپ کو چھٹا حصہ ملیگا۔ اور اس وقت عورت کو مرد سے دگنا مل جائے گا۔ اور یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے بلکہ مثل حظ الانثیین یعنے مرد کو عورت سے دگنا ملنا چاہئے۔ اور اسی طرح کلالہ کے معنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ماسوا والدین اور ولد کے ہیں۔ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک ماسوا ولد کے ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے نزدیک معراج جسمانی ثابت نہیں ہوتی اور دیگر اصحاب کے نزدیک معراج جسمانی ثابت ہے۔ اور بہت سے معاملات میں حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے۔ سو معلوم ہونا چاہئے کہ صحابہ سے اختلاف بدعت نہیں ہے۔ ہاں بے شک

اجماع صحابہ سے اختلاف قطعی بدعت ہے

سوال :- صحابہ کا تقابل صحابہ کا عمل حق ہے۔ دین ہے یا نہیں۔

جواب :- صحابہ کا عمل حق ہے۔ دین ہے۔

سوال :- پھر جب صحابہ کا عمل دین ہے اور حق ہے تو لا بد صحابہ کے خلاف قطعی لادینی ہے اور ناحق ہے۔

جواب :- عمل صحابہؓ حق ہے دین ہے۔ لیکن دین اور حق کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ عمل صحابہؓ ہو۔ یعنی عموم خصوص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر عمل صحابہؓ دین ہے حق ہے۔ لیکن ہر حق دین کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ عمل صحابہؓ ہی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ دین کا انحصار عمل صحابہ رضؓ میں نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کے عجائب لامتناہی ہیں اور کبھی بھی منقطع نہیں ہوں گے۔ ہر زمانہ میں برابر عجائبات منکشف ہوتے رہیں گے۔ نیز حوادث وقائع حالات لامتناہی ہیں۔ صحابہ رضؓ کے زمانے کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان کے مطابق ان حالات کے مطابق آئمہ مجتہدین نے فیصلے کئے اور یہ تمام فیصلہ جات صحابہ رضؓ کے زمانہ میں نہ تھے۔ اس کے باوجود کہ یہ اجتہادات صحابہ رضؓ کے زمانہ میں نہ تھے بدعت نہیں کہلائے گئے۔ ورنہ آئمہ مجتہدین بھی بدعتی کہلائے جاتے۔ اور اگر منکرین اجتہادات ان کو بدعتی قرار دیں بھی تو تدوین کتب احادیث تو قطعی صحابہؓ کے زمانہ میں نہ تھی تو یہ تدوین اور مدونین قطعی بدعت اور بدعتی ٹھہرے حالانکہ یہ نہ بدعت ہے اور نہ ان کے مدون بدعتی تھے۔ تنبیہ صحابہؓ بعض اشیاء کو کرتے تھے اور بعض اشیاء کا ترک کرتے تھے یعنی بعض اشیاء کا فعل تھا اور بعض اشیاء کا ترک تھا جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح کا فعل تھا۔ چوری زنا جوئے کا ترک تھا تو یہاں صحابہؓ کے فعل نماز کے خلاف اور ترک زنا و چوری کے خلاف قطعی حرام ہے نہ کہ بدعت۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن افعال کے وہ فاعل تھے یا جن افعال کے وہ تارک تھے تو ان کے فعل و ترک

کی مخالفت عملاً حرام اور اعتقاداً کفر ہے۔ بدعت کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں بحث یہ ہے کہ صحابہ نے نہ فعل کیا نہ ترک فعل کیا۔ یعنی اس وقت کوئی واقعہ ایسا نہ تھا کہ جس کے متعلق وہ فعل یا ترک فعل کا حکم لگاتے۔ بعد میں وہ واقعہ پیدا ہوا۔ اس وقت کے مجتہدین نے اور علماء محققین نے اور اولیاء کرام نے اس کے فعل یا ترک فعل کا حکم لگایا۔ تو چونکہ یہ حکم صحابہ رضؓ کے زمانے میں تھا ہی نہیں تو اس حکم کو دیکھا جائے گا۔ اگر یہ ادلہ شرعیہ سے ثابت ہوگا تو دین ہے اگر ثابت نہ ہوگا اور پھر دین کی طرف منسوب کیا جائے گا تو قطعی بدعت ہوگا۔ مجرد صحابہؓ کا نہ کرنا اور نہ کرنے کے معنے ترک کرنا نہیں ہے بلکہ عدم فعل نہ ترک فعل تو یہ عدم فعل صحابہ رضؓ محض عدم فعل ہونے کی حیثیت سے بدعت نہیں ہے۔ جب تک کہ اس عدم فعل کے ساتھ عدم دلیل شرعی اور نسبت شرعی جمع نہ ہوں اس وقت تک یہ عدم فعل صحابہؓ بدعت نہیں ہے۔

سوال :۔ میلاد شریف کی محفل مُرتب کرنا بدعت ہے یا نہیں۔

جواب :۔ بدعت نہیں ہے۔

ثبوت، اللہ تعالےٰ نے فرمایا وذکرھم بایام اللہ ایام الہٰی کا ذکر کرا اور ذکر کر۔ یوم الہٰی وہ یوم ہے کہ جس دن اللہ تعالےٰ نے کوئی اہم فعل کیا ہے اللہ تعالےٰ کا اہم فعل یا رحمت ہے یا عذاب ہے۔ اور رحمت عذاب سے افضل اور اہم ہے تو رحمت بڑا دن ہے اور آپؐ کی ذات بابرکات رحمۃ للعالمین ہے تو جس وقت آپؐ کی ولادت باسعادت ہوئی وہ دن درحقیقت یوم الہٰی ہے۔ اور الہٰی دن ہے۔ لہٰذا اس کی تذکیر واجب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یوم میلاد النبیؐ یوم الہٰی ہے۔ اور یوم الہٰی واجب التذکیر ہے

لہٰذا یوم میلاد النبیؐ واجب التذکیر ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ان فی ذلک لآیٰت لکل صبار شکور، ہر صابر و شاکر کے لئے اس یوم کی تذکیر میں نشانیاں ہیں۔ یا اس یوم میں نشانیاں ہیں، غور کر۔

سوال: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مناجات کے وقت سامنے شیرینی رکھنی بدعت ہے۔؟

جواب:۔ بدعت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَۃً

اے ایمان والو، جب تم رسولؐ سے مناجات کرو تو اپنے سامنے صدقہ رکھ لیا کرو۔

سوال:۔ یہ الفاظ کہنے کہ یہ اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کے لئے ہے ایسا کہنا بدعت یا شرک ہے۔

جواب:۔ نہ بدعت ہے نہ شرک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ اللہ: اور اس کا رسولؐ زیادہ حقدار ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو خوش رکھا جائے۔

سوال:۔ یہ الفاظ کہنے کہ نذر اللہ و نیاز پیغمبر یعنی پیغمبرؐ کی خوشنودی اور پیغمبرؐ کی شایانِ شان حاصل کرنے کے لئے اور پیغمبرؐ کو اپنی طرف نظر عنایت کرانی اور پیغمبرؐ کی دعا کی نیت وغیرہ یہ بدعت اور شرک ہے۔

جواب:۔ نہ یہ بدعت ہے نہ شرک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
ومن الاعراب من یومن باللہ والیوم الآخر ویتخذ ما ینفق قربٰت عند اللہ وصلوٰت الرسولؐ

کچھ ایسے بدو ہیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو وہ نذر اللہ اور نیاز پیغمبر قرار دیتے ہیں۔ الا انھا قربۃ لھم سیدخلھم اللہ فی رحمتہ آگاہ ہو جاؤ کہ ان کی یہ نیاز و نذر قبول ہے۔ عنقریب اللہ تعالےٰ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

سوال :۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالےٰ کا نبیؐ زندہ ہے۔ یہ بدعت ہے۔

جواب :۔ نہیں۔ نبی اللہ حیی یہ حدیث ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کا نبی زندہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا :

"ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاءٌ

ولکن لا تشعرون"

۔ مقتول فی سبیل اللہ کو مردے مت کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے۔ اس آیت میں مقتول فی سبیل اللہ کو حیی اور زندہ کہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مقتول حیی نہیں ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ حکم حیات اس مقتول پر ہے جو مقید ہے۔ فی سبیل اللہ کے ساتھ اور مقید پر جو حکم ہوتا ہے۔ اس کی کم کی وہ قید علت ہوتی ہے لہٰذا فی سبیل اللہ یت درحقیقت علۃ حیاۃ ہے۔ اور اس کی مثال ہے کہ جیسے طبیب کہے کہ ٹھنڈا پانی مضر ہے۔ تو مضرت کا حکم اس پانی پر ہے جو ٹھنڈک کے ساتھ مقید ہے۔ لہٰذا علت مضرۃ ٹھنڈک ہوئی۔ اسی طرح یہاں حیی کی علت فی سبیل اللہ ہوئی اور فرمایا : قل اِنّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین ۔ کہدے کہ میری نماز اور قربانی اور میری حیاۃ اور ممات سب اللہ کے لئے ہے۔ تو شہید کی تو موت صرف للہ ہے اور نبیؐ کی تو ہر چیز للہ ہے۔ اور فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی نبی کی حیات اور حیاتی حالات جملۃ

اور مماتہ اور مماتی حالات سب کے سب للہ اور فی سبیل اللہ ہیں۔ تو جبکہ فی سبیل اللہ ہونا اور للہ ہونا ہی حیاۃ ہے۔ تو لا بد نبی کی حیات شہید کی حیات سے بدرجہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ کیونکہ اس کی تو صرف موت ہی فی سبیل اللہ اور للہ ہے۔ اور نبی کی تمام حالتیں فی سبیل اللہ اور للہ ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ نبی کی للہیت شہید کی للہیت سے لامتناہی افضل اور ارفع ہے۔ لہذا للہیت نبی کی حیاۃ شہید کی حیاۃ سے لامتناہی افضل اور ارفع اور اطیب ہے۔ اور چونکہ ہمکو جبکہ ادنیٰ حیات شہید کا شعور نہیں ہے تو اعلیٰ اور ارفع حیات کا کیسے شعور ہو سکتا ہے۔ لہذا نبی اللہ حیی ہے اور یہ عقیدہ بحث ہے نہ شرک ہے۔

اب رہا سوال ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا کہ اس صورت میں شرک لازم آتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا موجب شرک نہیں کیونکہ شیطان ہر انسان کے ساتھ ہیں اور اس کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالے نے فرمایا اَنَّہٗ یَرَاکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ اور نیز ملائکہ ہر انسان کے ساتھ اور اس انسان کے اعمال سے باخبر ہیں۔ کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون محترم کاتب تمہارے افعال سے باخبر ہیں۔ تو جس طرح شیطان و ملائکہ کا حاضر و ناظر ہونا شرک نہیں ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ نبیؐ کا حاضر و ناظر ہونا بھی شرک نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہؐ یہ قضیہ ہر وقت ہر جگہ صادق ہے اور جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ اور یہ قضیہ موجبہ یعنی مثبتہ ہے۔ منفیہ سالبہ نہیں ہے۔ اور قضیہ موجبہ کا صدق وجود موضوع کو چاہتا ہے۔ یعنی اس قضیہ کا مضمون یہ ہے کہ رسالت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اس وقت ثابت ہے اور رسالت کا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیلئے ثبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی فرع ہے مطلب یہ ہے کہ قضیہ موجبہ کا صدق یہ چاہتا ہے کہ اس کا موضوع یعنی مُبتدا موجود ہوا ور یہاں اس صادق قضیہ کا موضوع محمدؐ صلعم ہیں۔ لہٰذا اس وقت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو موجود ہونا چاہیئے۔ تب یہ قضیہ صادق آئے گا۔ اور یہ قضیہ تمام فرق اسلامیہ کے نزدیک صادق ہے ہر وقت۔ لہٰذا اس وقت بلکہ ہر وقت جب بھی یہ قضیہ صادق ہوگا تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم موجود ہوں گے۔

اور یہ اصل کہ ثبوت شئی شئی فرع ہے ثبوت مثبت لہٗ کی اس اصل پر حکماء فلاسفہ اور تمام علماء اسلام متفق ہیں لہٰذا اس اصل کے متفق علیہ ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم جہاں بھی یہ قضیہ اور جس جگہ بھی یہ قضیہ صادق آئیگا اس وقت اور اس جگہ آپؐ کی ذات بابرکات موجود ہوگی۔ نیز آپ تمام عالموں کے لئے رحمۃ ہیں اور رحمۃ تمام اشیاء سے وسیع ہے۔ اسلئے آپؐ تمام اشیاء اور تمام عالموں میں جاپہنچ گر ہیں۔ اب اگر تو کہے کہ شیاطین کفار اور فساق نجاسات میں آپؐ کی ذات پاک کیسے جلوہ گر ہو سکتی ہے تو میں کہوں گا کہ جس طرح آفتاب کا نور آفتاب کی ضوء شیاطین کفار فساق نجاسات پر پڑنے کے بعد نجس نہیں ہوتا۔ اور ان سب میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی طرح آفتاب رسالت کا نور تمام منجسات پر پڑنے کے بعد نجس نہیں ہوتا۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اس وقت شرک لازم آتا ہے تو میں کہوں گا کہ شرک لازم نہیں آتا جس طرح شیطان وشیاطین کا ہر انسان میں حاضر ہونا موجب شرک نہیں ہے جیسا کہ فرمایا: اَنَّہٗ یَرَاکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ شیطان اور شیاطین تمکو دیکھتے ہیں اور جس طرح ملائکہ ہر انسان کے ساتھ ہیں۔ یعلمون ما تفعلون تمہارے افعال سے ملائکہ باخبر ہیں تو جس طرح شیاطین وملائکہ کا حاضر وناظر ہونا موجب شرک نہیں ہے۔ اسی طرح آپکی ذات بابرکات کا حاضر اور ناظر

ہونا موجب شرک نہیں ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ گمراہ کرنے والی جماعت اور رپورٹ کرنے والی جماعت تو حاضر اور ناظر ہو اور تمام عالم کو ہدایت کرنے والا غیر حاضر اور غیر ناظر ہو۔ اب اگر تو یہ کہے کہ آپؐ کی ذات مبارک دکھائی کیوں نہیں دیتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ملائکہ اور شیاطین باوجود حاضر ہونے کے دکھائی نہیں دیتے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں دکھائی دیتے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میت کے پاس دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں، تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے، میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ دریافت کرتے ہیں، تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے، میرا دین اسلام ہے، پھر وہ پوچھتے ہیں، یہ ہستی کون ہیں جو تم میں مبعوث کیے گئے؟ وہ کہتا ہے یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۵)

لوگ ہر آن مر رہے ہیں اور ہر آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں تشریف لا رہے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا اس طرح حاضر و ناظر ہونا نہ شرک ہے نہ بدعت۔

میں کہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومن کے ساتھ ہیں ثبوت النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم نبی کو مومنوں سے اتنی محبت ہے کہ خود مومنوں کو اپنے آپ سے اتنی محبت نہیں۔ اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ نبی محب المؤمنین ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المرء مع من احب۔ آدمی اپنے محبوب کے ساتھ ہے۔ آیت اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبیؐ محب مومنین ہے۔ اور محب مع المحبوب ہے۔ نتیجہ نبی مع المؤمنین ہے اور یہ غایت درجہ کی تحقیق ہے کہ ہم نے عقلاً اور شرعاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ثابت کر دی ہے۔ غور کرو۔

اب اگر تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ھو معکم این ما کنتم یعنی جہاں تم ہو اللہ

تمہارے ساتھ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صفت معیت اللہ تعالے کی صفت ہے اور اسی
طرح حاضر و ناظر ہونا بھی، اللہ تعالے کی صفت ہے اور صفات الٰہیہ کو غیر اللہ کے لئے ثابت
کرنا شرک ہے۔ تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالے موجود ہے حیّ ہے۔ فاعل بالاختیار ہے عالم
ہے قادر ہے، سمیع ہے۔ بصیر ہے، مالک ہے۔ رحیم ہے وغیرہ۔ اور یہ تمام صفتیں بندوں
میں موجود ہیں تو جس طرح ان تمام صفتوں کی بندوں میں موجودگی موجب شرک نہیں ہے
اسی طرح حاضر و ناظر ہونا شرک نہیں ہے۔ شرک کیا چیز ہے۔؟

جاننا چاہیئے کہ کوئی مصنوع اپنے صانع کے مثل نہیں ہوتی۔ جیسے مکان معمار کی مثل نہیں
ہے۔ موٹر اپنے صانع کی مثل نہیں ہے۔ غرض کہ ہر مصنوع ایسا ہے کہ وہ اپنے صانع کی مثل نہیں
ہے۔ اس لئے تمام کائنات اور تمام کائنات میں سے کوئی کائن بھی اپنے صانع کی مثل اور برابر
نہیں ہے۔ اس لئے کسی مصنوع کو صانع کی برابری دینی اور اس کا مثل قرار دینا ہے شرک۔
حاصل یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات بلا قدرۃ ہیں۔ یعنی اللہ تعالے کی ذات وصفات کسی
قدرۃ کا بھی نتیجہ نہیں ہیں اور اللہ تعالے کے افعال محض بالمشیۃ ہیں۔ مشیت کے علاوہ کسی
داعی، باعث، سبب، وجہ، علۃ غائی، غایت، آلات، مادہ، مدّت کسی کے محتاج نہیں ہے لہٰذا کسی
مخلوق کو یا اس کی صفت کو یا اس کے فعل، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات و افعال کے مشابہ
اور مماثل قرار دینا یہ شرک ہے۔

مثلاً اللہ تعالے کی ذات لا بالقدرۃ ہے۔ اب مصنوعات سے کسی کو لا بالقدرۃ
ٹھہرانا یہ شرک ہے۔ اسی طرح اس کی صفات لا بالقدرۃ ہیں۔ اب مخلوں میں سے کسی کی حیات
اور علم کو لا بالقدرۃ ٹھہرانا یہ شرک ہے۔ اور ہمارا علم و قدرۃ وحیات و سمع و بصیر و حکمت
و رحمت سب بالقدرۃ ہیں۔ اور بالقدرۃ لا بالقدرۃ کے مشابہ اور مماثل ہوتا نہیں ہے اس

لئے جتنے بھی بندوں کے کمالات ہیں وہ سب کے سب بالقدرۃ ہونے کی وجہ سے لا بالقدرۃ کمالات کے مساوی برابر مماثل مثل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا بالقدرۃ کمال والے اس ذات کے کہ جس کے کمالات لا بالقدرۃ ہیں مماثل اور شریک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وہ کمال جو قدرۃ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کو صاحب کمال کی طرف نسبت کیا جائیگا تو یہ شرک نہیں ہوگا۔ کیونکہ صانع کا کمال اصلی ہے اور یہ کمال مصنوعی مخلوق ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ حاضر و ناظر ہونا یہ نبیؐ کی صفت غیر مخلوق ہے اور یہ نبی کی صفت ذاتی ہے کسی کا عطیہ نہیں ہے تو اس وقت یہ شرک ہوگا۔ مثلاً قلم سے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ لکھ۔ اس نے کہا کیا لکھوں، کہا جو قیامت تک ہونے والا ہے وہ لکھ دے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قلم کو قیامت تک کی تفصیلی جزئیات کا علم تھا اور یہ شرک نہیں ہے کیونکہ عطیۂ الٰہی ہے۔ خوب سمجھ لو کہ شرک اس وقت ہوگا جب مصنوع میں صانع کی ذات وصفات کے مشابہ ذات وصفات پیدا کر دی جائیں گی۔ غور کرو۔

سوال :۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ دینا بدعت ہے یا نہیں جبکہ آپؐ اس جہاں سے تشریف لے گئے ہوں۔

جواب : بدعت نہیں ہے۔

جاننا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعض دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ غیر حیّ کا وسیلہ درست نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنے ان یہودیوں کی حالت یہ ہے کہ کل کی بات ہے کہ خاتم النبیین کا وسیلہ دیکر دعا مانگتے تھے کہ یا اللہ تو ہم کو کافروں پر فتح اور غلبہ عنایت کر پھر جب خاتم النبیین جسے وہ خوب اچھی طرح پہچانتے تھے آگیا تو انکار کر بیٹھے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت موجود نہ تھے اور وسیلہ

اس وقت دیا جاتا تھا اور آپ کی غیر موجودگی کے اس وسیلہ کو اللہ تعالےٰ نے ناجائز نہیں قرار دیا۔ غور کرو۔

سوال :۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر یا کہہ کر سلام پڑھنا بدعت ہے یا نہیں۔

جواب : بدعت نہیں ہے۔ ہر ہر نماز میں السلام علیک ایہا النبی پڑھا جاتا ہے۔ ایہا النبیؐ یا ایہا النبیؐ ہے۔ جیسے توبوا الی اللہ ایہا المومنون یعنے اے مومنوں اللہ کی طرف رجوع کرو۔ نیز روضۂ اقدس پر برابر یا کہہ کر سلام پڑھا جاتا ہے۔ اور جو چیز نماز میں پڑھی جا سکتی ہے۔ وہ بیرون نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ اور نیز جس طرح روضۂ اطہر پر سے سلام سنا جا سکتا ہے اسی طرح دیگر مقامات پر سے بھی سنا جا سکتا ہے۔ قرب و بُعد کا سوال اس عالم سے تعلق نہیں رکھتا۔

ہاں اس عالم مادی میں قرب و بعد کو سُننے نہ سُننے میں دخل ہے۔ اس کے علاوہ اکابرین حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت شمس الدین تبریزؒ نے یا کہہ کر پکارا ہے۔ یا صاحب الجمال و یا سید البشرؐ اور یا رسول اللہ کریمی سیدی وغیرہ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر معدوم کی طرف خطاب ناجائز ہوگا تو عالم قدیم ہو جائے گا۔ کیونکہ عالم ازل سے معدوم تھا۔ پھر کن سے مخاطب ہوا۔ نیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل وغیرہ کو ان کے مرنے کے بعد یا ابوجہل ابن ہشام کہہ کر پکارا۔ لہٰذا یا کا لفظ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں بھی صحیح ہے۔

سوال :۔ کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنا بدعت ہے۔ ؟

جواب :۔ ہرگز نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قوموا الی سیدکم اپنے سردار یعنی

سید کے استقبال کے لئے کھڑے ہو جاؤ تو پھر صلوٰۃ و سلام میں کھڑا ہونا کیسے شرک یا بدعت ہو سکتا ہے۔

سوال:۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی مثال محال ہے کیا یہ کہنا بدعت ہے۔

جواب:۔ بدعت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا و خاتم النبیین ہے۔ نبوت آپؐ پر ختم ہو چکی اب اگر نبی واقع ہوگا تو یہ قول جھوٹا ہو جائے گا۔ اور اگر ممکن الوقوع ہوگا تو یہ قول ممکن الکذب ہو جائیگا اور پوری اُمّت کا اجماع ہے کہ خداوند تعالےٰ پر کذب محال ہے۔ معتزلہ اور اہل سُنّت دونوں استحالہ کذب باری تعالےٰ پر متفق ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امکان کذب کی نقیض ضرورۃ صادق ہے اگر امکان کذب حق ہوگا تو ضرورۃ صدق باطل ہو جائے گا۔ یعنی اگر یہ بات حق ہے کہ اللہ تعالےٰ نعوذ باللہ کاذب بالامکان ہے تو بے شک یہ بات ناحق اور باطل ہوگی کہ اللہ تعالےٰ صادق بالضرورۃ ہے اور کوئی فرقہ بھی جو اللہ تعالےٰ کو مانتا ہے یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالےٰ صادق بالضرورۃ نہیں ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔ یعنے اللہ تعالےٰ اصدق القول ہے۔ صادق القول تو ہر کوئی ہو سکتا ہے۔ لیکن اصدق القول اللہ تعالےٰ ہی ہے۔ اور یہ اصدقیۃ ہی ضرورۃ صدق ہے۔ اور ضرورۃ صدق ہی کے معنے یہ ہیں کہ کذب محال ہے۔ نیز وقوع کذب وقوع لعنت کو اور امکان کذب امکان لعنت کو مستلزم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کذب عدم مُطابقت واقعے کا نام ہے۔ یعنی صدق و کذب میں واقعے کی مُطابقت اور عدم مطابقت ملحوظ ہے اور یہ معنے مخلوقین اور کائنات کے لئے ہیں خالق کائنات کے لئے یہ معنی نہیں ہیں۔ خالق کے صدق کے معنی یہ ہیں کہ واقعات اس کے قول کے تابع ہوں نہ کہ اس کا قول واقعے کے تابع ہو کیونکہ قولہ الحق حق کس کو کہتے ہیں اس کے قول کو جو وہ کہدے وہ حق ہے یہ نہیں ہے کہ اسکا قول حق کے تابع ہو بلکہ اسکے قول کے حق تابع ہوگا لہٰذا یہاں کذب

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس وقت بھی وہ واقعے کے خلاف کہیگا وہ واقعہ ہو جائے گا۔
مثلاً آگ گرم ہے۔ یہ واقعہ ہے لیکن اگر اس نے کہہ دیا یا نار کونی برداً تو اس وقت آگ ٹھنڈی
ہو گی گرم ہونا محال ہے۔ اب اگر تو کہے کہ تعمیم قدرۃ باری تعالے کذب کے امکان کو چاہتی
ہے۔ میں کہتا ہوں ہرگز نہیں کیونکہ متعلق قدرۃ امکان ہے نہ واجب نہ ممتنع اور کذب
نقص ہونیکی وجہ سے امکاناً اور وقوعاً اللہ تعالے کی صفت نہیں ہو سکتا۔ یعنی اللہ تعالے ہر
شئ پر قادر ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالے ہر ممکن پر قادر ہے اور واجب اور محال پر
قدرۃ کا سوال نہیں ہے۔ کیونکہ واجب و محال لا بالقدرۃ ہے۔ اور لا بالقدرۃ کو کہنا کہ وہ
بالقدرۃ ہے یا نہیں یہ حماقت ہے یعنی جو شئی لا بالقدرۃ ہے اسکو کہنا کہ آیا وہ بالقدرۃ ہے یا نہیں یہ صحیح نہیں ہے
یہ تخلیط ہے چونکہ صدق باری تعالے لا بالقدرۃ ہے۔ یعنی وہ صادق بالذات ہے۔ اس لئے
قدرۃ کے تعلق کا سوال ہی یہاں نہیں پیدا ہو سکتا۔ اب اگر تو یہ کہے کہ بولو کیا کہتے ہو کہ اللہ تعالے
نے خبر دی کہ زید جمعہ کو فوت ہو جائے گا۔ اللہ تعالے زید کو جمعرات کو موت دے سکتا ہے یا نہیں اگر
نہیں دے سکتا تو قطعی عاجز ہو گیا۔ اگر دے سکتا ہے تو یہی معنی امکان کذب کے ہیں۔ میں کہوں گا کہ نہیں
امکان کذب کے معنے یہ ہیں کہ جمعہ کو موت نہ آ سکے۔ اور جمعہ کو موت نہ آئے۔ تو یہ وقوع کذب
ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ محال ہے کہ جمعہ کو موت نہ آئے۔ جمعہ کو موت آنا واجب اور ضروری
ہے۔ لہذا جمعہ کو موت نہ آنا محال ہے۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ جمعرات اور جمعہ اور ہفتہ تینوں
دن موت کا آنا فی نفسہ ممکن ہے۔ لیکن جب جمعہ کی موت کی خبر دی تو جمعہ کے دن فی نفسہ موت کا آنا
ممکن تھا۔ لیکن اس خبر سے یہ موت واجب ہو گئی۔ اور جمعرات اور ہفتہ کی موت ممکن فی نفسہ
ہوتے ہوئے اس خبر کے بعد محال ہو گئی لہذا تعمیم قدرۃ امکان کذب کو نہیں چاہتی۔
کیا تو نہیں دیکھتا کہ انسان فی نفسہ ممکن ہے پتھر فی نفسہ ممکن ہے لیکن انسان کا

ستھر ہونا محال اور نا ممکن ہے۔م

نیز اللہ تعالے کا قول تعمیم قدرۃ کا ممکن الکذب ہونے کی تقدیر پر کیسے موجب استدلال ہوسکتا ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ بعض قائلین کذب باری تعالے نے یہ کہا ہے کہ صدق محل مدح میں جب ہوتا ہے کہ جب کذب پر قدرۃ ہو اور اللہ تعالے کا صدق محل مدح میں ہے لہٰذا اللہ تعالے کذب پر قادر ہے تو میں کہوں گا کہ یہ جنون ہے۔ کیوں اللہ تعالے کی ذات و صفات ہر وقت قابل حمد ہیں اور کذب صفت نقص ہے۔ اس سے اللہ تعالے کی تنزیہ واجب ہے۔ اور اگر صفت کمال قابل حمد و مدح جب ہوگی جب اس صفت کی ضد پر قدرۃ ہو تو علم باری تعالے قابل مدح جب ہوگا کہ جب وہ جہل پر قادر ہو۔ اور قدرۃ باری تعالے قابل حمد و مدح جب ہوگی جب وہ عجز پر قادر ہو بلکہ ذات باری تعالے قابل حمد و مدح جب ہوگی جب وہ اپنی ضد اور مثل اور نہ پر قادر ہو۔ اور یہ کفر و جنون کا مجموعہ ہے نیز ملائکہ مقربین قابل مدح ہیں اور وہ اپنے کمالات کے ترک پر قادر نہیں ہیں۔ نیز انبیاء اور ان کی نبوۃ اور رسالت پر قابل مدح ہیں اور وہ ترک نبوت و رسالت پر قادر نہیں ہیں نیز اگر کذب باری تعالے ممکن ہوگا تو کذب رسول بدرجہ اولی ممکن ہو جائیگا اور کذب جبریل اور اس وقت شرائع سے وثوق جاتا رہے گا۔

نیز حمد و مدح میں حسن و کمال شرط ہے قدرۃ شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالے کی ذات بے قدرت ہے اس کی قدرۃ اس کا علم اس کی جملہ صفات بے قدرۃ ہیں یعنی کسی قدرت کا نتیجہ نہیں ہیں اور محمود بالذات ہیں۔ کیونکہ وہ سب کمال اور حسن ہیں۔ موتی اور جواہر نفیسہ سب قابل مدح ہیں اور یہاں نہ وہاں قدرۃ ہے ہی نہیں۔ اور اگر تو کہے کہ تارک زنا قادر زنا ہو تو قابل مدح ہے اور اگر قادر نہ ہو تو قابل مدح نہیں ہے میں کہوں گا۔

مخلوق کے فعل میں ہے۔ اور مخلوق کے فعل پر خالق کے فعل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ
خالق کی صفت یعنی صدق کو مخلوق کی صفت یا فعل قیاس کیا جائے۔ حاصل یہ ہے کہ صدق
لوازم کلام میں سے ہے۔ اور کلام الہٰی صفتِ الہٰی ہے۔ اور صفت الہٰی محمود بالذات ہے
اور صفت الہٰی چونکہ بلا قدرت قادر ہے اس لئے وہ بالذات محمود ہے۔ وہاں خلاف
صدق پر یعنی کذب پر قادر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر بفرض محال صدق
کو فعل الہٰی تصور بھی کر لیا جائے تو فعل الہٰی فعل مخلوقین پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اللہ بغیر جرم
سابق کے انسانوں اور حیوانوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ (جیسے انبیاءؑ کو اور حیوانات کو جیسے قربانی کے
جانوروں کو اور یہ فعل اللہ سے حسن ہے اور یہی فعل بندہ کرے تو اس سے قبیح ہے۔ قابل فہم
ہے۔ جاننا چاہیئے کہ معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کی قدرۃ کی تخصیص کی ہے یعنے اللہ تعالیٰ ظلم و
ستم اور دیگر قبائح پر قادر نہیں ہے اور نہ قدرۃ علی القبیح کے ساتھ متصف ہے۔ اہل
سُنت نے قدرۃ کی تعمیم کی ہے ان میں سے بعض اہل سُنت امکان کذب کے قائل ہو گئے۔ اور
اکثریت جو تقریباً کلیتہ ہے سب کے نزدیک کذب اور دیگر قبائح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف
محال ہے اور سب کے سب استحالہ کذب باری تعالےٰ کے قائل ہیں۔ سوا بعض کے اور ان
بعض نے ایک دلیل عجیب یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالےٰ کہتا ہے۔ وقالت الیھودُ عزیرٌ
ابن اللّٰہِ وقالت النصریٰ المسیحُ ابن اللہ اور قالوا ان اللہ فقیر اور قالوا ان
اللہ ثالث ثلثۃ تو جبکہ اللہ تعالےٰ قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ کہتا ہے تو بغیر قالو کے ان اللہ ثالث
بھی کہہ سکتا ہے۔ اور بغیر قالت الیہود کے عزیر ابن اللہ بھی کہہ سکتا ہے۔ اور بغیر قالت
النصاریٰ کے صرف مسیح ابن اللہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ ان اللہ ثالث ثلثۃ اور
عزیر ابن اللہ اور مسیح ابن اللہ یہ سب کلام جھوٹے ہیں۔ اور جھوٹے کلاموں کو وہ کہتا ہے

بس یہی مع امکان کذب باری تعالےٰ کے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ
اللہ تعالےٰ جب جھوٹوں کے جھوٹے قول نقل کرتا ہے تو وہ قول خود بھی کہہ سکتا ہے تو اب
میں کہتا ہوں کہ فرشتوں نے کہا کہ قالوا لا علم لنا اور بغیر قالو کے اللہ تعالےٰ لا علم لنا
اس قائل کے نزدیک کہہ سکتا ہے حالانکہ لا علم لنا جن کا مقولہ ہے وہ اپنے اس مقولہ میں
سچے ہیں قالا ربنا ظلمنا انفسنا بغیر قالا کے ربنا ظلمنا اس قائل کے نزدیک اللہ تعالےٰ کہہ
سکتا ہے کہ ہم کو علم نہیں اے ہمارے پروردگار ہم نے ظلم کیا قالت رب انی ظلمت نفسی اللہ
تعالےٰ کہہ سکتا ہے رب انی ظلمت نفسی قالو ربنا اغفرلنا بغیر قالو کے اللہ تعالےٰ کہہ سکتا ہے
کہ اے ہمارے رب ہم کو بخش دے واذ قال ابراھیم رب ارنی تو اللہ کہہ سکتا ہے اے رب دکھا
مجھکو قال رب ارنی انظر الیک ای رب دکھا مجھکو میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں قال رب بما
اغویتنی بغیر قال اللہ تعالےٰ کہہ سکتا ہے کہ اے میرے رب تونے تو میرا اغوا کیا ہی ہے۔
حاصل اس استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ یہ بھی کہہ
سکتا ہے کہ ہم ظالم ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہمارا رب ہے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اغوا شدہ ہیں۔ یہ بھی
کہہ سکتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ جاننا چاہیئے کہ یہ قول جنون اور کفر کا مجموعہ
ہے یعنے اللہ تعالےٰ کا یہ کہنا کہ تمام نقائص اور عیوب اور غلط باتیں ہم کہہ سکتے ہیں۔ میں
کہتا ہوں کہ یہ مجنون یہ نہ سمجھا کہ ممکن اس کو کہتے ہیں اگر اس ممکن کو واقع فرض کیا جائے تو محال نہ
لازم آئے اب اگر اللہ تعالےٰ کا یہ کہنا ممکن ہو کہ ہم لا علم ہیں ہمکو علم نہیں۔ ہم نے ظلم کیا ہے
ہم نے اطاعت کی ہمارا رب ہے۔ ہم صاحب اولاد ہیں۔ ہم فقیر ہیں۔ مسیح ہمارا بیٹا ہے عزیز
ہمارا بیٹا ہے۔ کون خاکستر ہڈیوں کو زندہ کرے گا۔ اے ہمارے رب الغرض جملہ لغویات
اور جملہ کفریات کا کہنا اگر اللہ تعالےٰ کے لئے ممکن ہوگا اور اس ممکن کو فرض کیا جائے گا اور

ان ممکنات کو واقع فرض کیا جائیگا تو کتنے عظیم ترین محالات لازم آئیں گے اور ساری شریعت
سارا دین ساری عقل سب اس مجنون کی رائے پر ماری جائیگی۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ
لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ اگر واقعات ان کی رائے کے تابع ہو جائیں گے۔ تو
نظام سماوی وارضی وردرمیانی سب درہم برہم ہو جائے گا۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ممکن فی نفسہ
ممکن ہے، اور ممکن اوصاف وفضائل خواہ حسن ہوں خواہ قبیح سب ممکن ہیں اور کسی شئی کا ممکن
ہونا یہ نہیں چاہتا کہ اس ممکن کی دوسری شئی کی طرف نسبت بھی ممکن ہو۔ مثلاً حرکت فی نفسہ
ممکن ہے اور سکون فی نفسہ ممکن ہے۔

لیکن حرکت کی نسبت سکون کی یا سکون کی نسبت حرکت کی طرف یہ ممکن نہیں ہے
ہوگی اور جو شئی منقسم ہی نہیں ہے۔ محصور ہی نہیں ہے قابل قسمت ہی نہیں وہ منقسم
بننے کے قابل ہی نہیں۔ اس کی نہ قسمیں ہوں گی نہ اس کی تقسیم ہوگی۔ نہ اس کی تشقیق ہوگی چونکہ
ممکن وجود وعدم میں مذبذب ہے۔ اس لئے ممکن منقسم ہوگا اور قابل تقسیم اور قابل
تشقیق ہوگا اور کہا جائے گا کہ ممکن یا موجود ہے یا معدوم ہے اور موجود ومعدوم مقسم
یعنے ممکن کی دو قسمیں ہو جائیں گی اور یہاں حصر عقلی صحیح ہوگا۔ اور واجب الوجود جلت
اسماء ہ چونکہ خالق حصر ہے اس لئے وہ محصور اور منقسم نہیں ہوگا۔ یعنے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ
واجب الوجود یا موجود ہے یا معدوم کیوں کہ واجب تو اس کو کہتے ہیں کہ جو موجود ہی موجود
ہو جس میں عدم کی صلاحیت ہی نہ ہو تو یہاں یہ حصر عقلی صحیح نہیں ہوگا۔ کہ اللہ تعالے موجود
ہے یا موجود نہیں ہے اس لئے کہ اس سوال کے معنے یہ ہوں گے کہ موجود موجود ہے یا موجود نہیں
ہے اور یہ لغو سوال ہے۔ اسی طرح اللہ تعالے عالم ہے یا عالم نہیں ہے۔ یہ حصر صحیح نہیں ہے
یہ لغو ہے۔

کیونکہ اللہ تعالےٰ عالم بالذات ہے۔ جہل کی اس میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس
لئے وہ عالم ہی عالم ہے تو اس وقت اس حصر عقلی اور اس کے یہ معنے ہوں گے کہ عالم عالم
ہے یا نہیں اور یہ لغو اور غلط بیہودہ بات ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ قادر ہے یا قادر نہیں
ہے یہ سوال یہ حصر بیہودہ لغو اور غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ قادر ہی قادر ہے۔ اور اس وقت
اس میں عجز کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لئے یہاں تشقیق اور حصر صحیح نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ
قادر ہی ہے۔ اور اس وقت اس کے معنے یہ ہوں گے کہ قادر ہی قادر ہے۔ یا قادر نہیں ہے۔
اور یہ سوال صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس سارے بیان سے واضح ہو گیا کہ یہ سوال کے اللہ تعالےٰ
قادر ہے یا قادر نہیں ہے۔ یہ سوال صحیح نہیں ہے۔ نہ یہ جواب دیا جائے گا کہ اللہ تعالےٰ کذب
بلکہ محال ہے اور جب کہ ایک ممکن کی دوسرے ممکن کی طرف نسبت محال ہو سکتی ہے۔ یعنی محال
ہے کہ حرکت سکون ہو یا سکون حرکت ہو تو ممکن نسبت واجب کی طرف بدرجہ اولیٰ محال ہے
یعنی محال ہے کہ ممکن واجب ہو محال ہے کہ مخلوق خالق ہو۔ اس لئے کذب و ظلم اور دیگر قبائح
چونکہ ممکن کے اوصاف ذمیمہ ہیں اس لئے ان کی نسبت واجب کی طرف محال ہے۔ بلکہ ممکن کے
اوصاف حمیدہ کی بھی نسبت واجب کی طرف محال ہے۔ تو شئی کا فی نفسہ ممکن ہونا یہ نہیں تھا
کہ اس کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف ممکن ہو۔ بلکہ یہ نسبت محال ہے۔ لہٰذا کذب کے فی نفسہ
ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کذب کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف ممکن ہو جس طرح عدم
کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عدم کی اللہ تعالےٰ کی طرف نسبت ممکن ہو۔ جس طرح
عجز اور بیماری اور موت وغیرہ کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان تمام اشیاء کی نسبت
باری تعالےٰ کی طرف ممکن ہو بلکہ تمام ممکنات اور ان کے اوصاف رذیلہ یا حمیدہ سب کے سب
چونکہ ممکن ہیں ان کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف محال ہے۔ غور کرو۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ بولو کیا کہتے ہو اللہ تعالے کذب پر یعنے کذب بولنے پر قادر ہے یا نہیں ہے۔ یہ حصر عقلی ہے اور حصر عقلی پر حکما اور متکلمین بلکہ تمام عالم کا اجماع ہے اب اگر یہ جواب دوگے کہ قادر ہے تو قطعی کذب مقدور اور ممکن ہو گیا یعنے قطعی جھوٹ بولنا ممکن ہو گیا۔ اب اگر یہ جواب دوگے کہ اللہ تعالے جھوٹ بولنے پر قادر نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں تو قطعی اللہ تعالے عاجز ہو گیا کیونکہ قادر نہ ہونا عاجز ہی ہونا ہے۔ یعنی قدرۃ و عجز محل صالح میں نقیضین کے حکم میں ہیں یعنی جس کی شان سے قدرۃ ہو اور وہ قادر نہ ہو کسی شی پر تو قطعی وہ عاجز ہے۔ تو میں کہوں گا یہی وہ گمراہی ہے جس میں حکما اور متکلمین دونوں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ شئی جو محصور ہے۔ یعنی منقسم وہ ایسے اقسام میں منقسم ہوگی اور محصور اور ظلم اور دیگر قبائح پر قادر ہے نہ یہ جواب دیا جائے گا کہ اللہ تعالے قادر نہیں ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال صحیح نہیں اور بھید اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالے کی ذات و صفات کسی قدرۃ کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اس کی ذات و صفات بلا قدرۃ ہیں۔ اور بلا قدرۃ کے لئے یہ کہنا کہ کیا بلا قدرۃ شی بالقدرۃ ہے یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ یعنی متعلق قدرۃ نہ قادر ہے نہ قدرۃ بلکہ غیر قادر و قدرۃ ہے۔ غور کرو۔

قارئین کرام۔ یہ مضمون حضرت علامہ محمد ایوب صاحبؒ نے خود اپنی قلم سے تحریر فرمایا ہے۔

فاسق وفاجر کے پیچھے نماز جائز ہے

ایک ولی ایک فاسق وفاجر سے اتنا بڑھیا نہیں ہے جتنے حضرت محمدؐ حضرت ابوبکرؓ سے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو کوئی جز نبوت کا ایسا نہیں ہے کہ وہ آخر میں آکر صدیق بن جائے اور اگر بڑے سے بڑے متقی اور ولی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں آکر کہیں نہ کہیں وہ فاسق سے مل جائے گا۔ ورنہیں تو کلمہ لاالٰہ اللہ میں ایمان میں فاسق سے متحد ہو جائے گا۔ اور یہ فاسق ترقی کر کے متقی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس متقی سے اوپر بھی جا سکتا ہے اور اگر متقی تنزل کرے تو فاسق بن جائے گا۔ لیکن نبی کم سے کم درجہ میں بھی ابوبکر صدیق نہیں بن سکتا۔ اور حضرت ابوبکر یا حضرت علی کے مدارج کا کتنا بھی اضافہ کیا جائے وہ کسی وقت بھی نبوت تک نہیں پہنچ سکتے۔ نبیؐ حضرت ابوبکر سے بہت زیادہ بہتر ہیں بمقابلہ اس کے جو ایک بہت بڑا ولی۔ ایک بہت بڑے فاسق کے مقابلے میں ہے۔ اتنے بہتر آدمی یعنی نبیؐ نے جب حضرت ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھ لی تو اگر ایک متقی کسی فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ تو کیا ہرج ہے نبی کے مقابلے میں حضرت ابوبکر بہت گھٹیا ہیں۔ بمقابلہ اس کے کہ ولی کے مقابلہ

میں فاسق ہے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت ابوبکر کے پیچھے دو مرتبہ نماز پڑھی اور
ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پیچھے پڑھی۔ اس کے علاوہ حضرت
عبداللہ بن عمر اور دیگر جلیل القدر صحابہ نے حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز
پڑھی اور پوری قوم اس پر متفق ہے کہ حجاج فاسق الفساق یعنی فاسق ہی نہیں
بلکہ بہت بڑا فاسق تھا۔ تو صحابہ نے فاسق کے پیچھے نماز پڑھی۔ اس کے علاوہ
حضرت عثمان کو جب باغیوں نے گھیر لیا تھا تو لوگوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھنے
کے لئے پوچھا تو حضرت عثمان نے ان کو اجازت دے دی کہ جاؤ ان کے
پیچھے جس نیک کام کے لئے تم کو بلاتے ہیں۔ تو خلافت برحق پر جن لوگوں نے
خروج کیا ان سے زیادہ باغی کون ہوگا۔ لیکن خلیفہ وقت نے ان کے پیچھے
نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اب رہا امام جہاد تو اس میں کوئی شرط نہیں
جس میں نظم اور انتظام کی صلاحیت ہو۔ وہ امام جہاد بن سکتا ہے۔ اگر نیک
بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ امام بن سکتا ہے۔ امام جہاد اور امام نماز میں یہ
شرط نہیں ہے ہاں ہدایت میں اتقا میں ولایت میں یہ شرط ہے۔ وہ اس حکم
میں آجائے گا کہ دوسروں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو
بھول جاتے ہو۔ تَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ اور تم کتاب کی تلاوت
بھی کرتے ہو۔ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ اور تم بہت بے عقل ہو۔ أَفَلَا تَعْقِلُونَ
فاسق اگر دین کی بات کہتا ہے تو اسے مان لینا چاہیئے اور اگر دین کے خلاف
کوئی بات کہتا ہے تو نہ مانیئے۔ اگر کوئی غلط راستہ پر جا رہا ہے اور آپ کو سیدھا
راستہ بتا رہا ہے تو آپ اس کو مان لیجئے اس میں کیا حرج ہے۔ اگر کوئی غلط راستہ

پر چل رہا ہے تو اس کی سیدھی بات بھی نہیں ماننی چاہتے یہ ٹھیک نہیں ہے
ہاں اگر وہ کچھ ادعیٰ کر رہا ہے اور خلاف شرع کچھ باتیں بتا رہا ہے تو اس کی پیروی
نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک دفعہ ایک مجلس میں بڑے بڑے علماء اکٹھا ہوتے تھے
ہم بھی وہاں رات کو دس دس گیارہ گیارہ بجے تک بیٹھتے تھے وہاں مولوی عبدالسلام
صاحب نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا کہ ایک حدیث شریف ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے
کہ زنا کرے اور اس سے ایمان نہ ہٹ جائے یا چوری کرے اور اس سے ایمان
نہ ہٹ جائے۔ یعنی علم صحیح سے عمل جدا نہیں ہوتا۔ یہ اہل شریعت کے یہاں
سب جگہ رائج ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ مولوی صاحب بات مشہور ہو گئی ہے
صحیح نہیں ہے۔ غلط ہے۔ عمل سے تو ہمارا تعلق نہیں مسئلہ کی تحقیق کرنا ہمارا کام
ہے۔ تمام حکماء اور علماء کے یہاں یہ مشہور ہو گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی یہی ہے
یہ بات مفتی کفایت اللہ اور تمام علماء فتح پوری وغیرہ تک بھی پہنچی اور اس
کی بڑی تشہیر کی۔ میں نے کہا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ کیونکہ اگر علم صحیح
سے عمل جدا نہیں ہو گا۔ تو علم صحیح اللہ پاک سے زیادہ کسی کو نہیں ہے۔ تو
اللہ تعالیٰ کا عمل بھی قدیم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کا علم قدیم ہے تو عالم قدیم ہو جائے
گا۔ بالکل نئی بات ہے۔ مولوی صاحب چپکے ہو گئے کہ چلو مفتی صاحب سے پوچھیں۔
میں نے کہا کہ آپ سب سے پوچھ لیجئے۔ عالم اللہ تعالیٰ کا عمل ہے اور حادث ہے
اور اللہ تعالیٰ کو صحیح علم ہے اور ازلی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا عمل اس کے علم سے
جُدا ہو گیا۔ سوال۔ کیا علم صحیح کے خلاف بھی عمل ہو سکتا ہے۔؟
جواب:۔ کیوں نہیں۔ اس کو صحیح علم ہے کہ ابو جہل ایمان نہیں لائے گا

اور برابر کہہ رہا ہے کہ ایمان لاموسیٰ سے کہا کہ تم جاؤ فرعون کے پاس اور فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ اس سے نرم کلامی سے پیش آنا۔ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اللہ کے عذاب سے ڈرے۔ ان سے تو ادھر یہ کہا اور ادھر کہا کہ میں اس کے دل میں ایسی سختی پیدا کر دوں گا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تقدیر کے جتنے مسائل ہیں۔ ان میں یہی ہے عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ، تٰٓئِبٰتٍ، عٰبِدٰتٍ، سٰٓئِحٰتٍ، ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا بالقرآن بالحدیث بالاجماع۔ موجودہ امہات المومنین دنیا کی سب عورتوں سے بہتر ہیں۔ لیکن ان سے اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر یہ تم کو طلاق دے دیں تو ان کو تم سے زیادہ طیب مومن اور باکرہ وغیرہ خوبیوں والی بیویاں دے دوں گا۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ ان سے بہتر کوئی عورت نہیں ہے اور یہ طلاق دینے کے نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان سے اس کے خلاف کہہ دیا۔ وہ قادر ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے اس مجلس میں بھیا احسان میرٹھ والے بھی موجود تھے۔ کہنے لگے عقلی دلیل تو ہوگئی پوری۔ مگر یہ شرعی دلیل نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ شرعی دلیل بھی موجود ہے۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وہ اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہودی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس کے باوجود وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ یہاں بڑا مغالطہ ہوا ہے کہ علم سے عمل جدا نہیں ہوتا اصل بات یہ ہے کہ قصد اور ارادہ سے عمل جدا نہیں ہوتا۔ اور ارادہ جازم جب ہوگا جب علم صحیح ہوگا۔ اس وجہ سے دھوکا لگا ہے

اصل میں ارادہ سے مراد جدا نہیں ہے۔ آپ کو یہ صحیح علم ہے کہ یہ شے گندی ہے۔ تو آپ اس کو کھالیں گے یا نہیں۔ آپ اس کے کھا لینے پر قطعی قادر ہیں۔ ہر شرابی یہ جانتا ہے کہ شراب بری چیز ہے۔ گندی اور حرام ہے۔ اپنی اولاد کو اس سے بچاتا ہے۔ لیکن خود پیتا ہے۔ تو علم سے عمل جدا ہوتا ہے۔ اور ہو جاتا ہے۔ لیکن ارادہ اگر پختہ ہو تو عمل اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ ارادہ کی پختگی میں علم ضرور مدد کرتا ہے۔ عام طور پر یہ ہے کہ ذی علم جو ہوگا وہ جانے گا کہ اس میں یہ نقصان ہے یہ مضرت ہے تو اس سے بچے گا۔ مگر عقلی طور پر علم سے عمل جدا ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک باریک بات ہے اسے سمجھ لیں وہ علم جس سے عمل جدا نہیں ہوتا۔ وہ اور علم ہے اور یہ جو رائج علم ہے یہ اور ہے آپ دیکھئے کہ اسباب موت جو ہیں۔ ان کے متعلق صحیح علم ہے کہ یہ موت تک پہنچا دیں گے۔ زہر۔ سنکھیا وغیرہ ایسی مہلک چیز کو استعمال نہیں کرے گا۔ لیکن موت جو اتنی یقینی چیز ہے اس سے کتنا غافل ہے۔ اس کا امکان ہے کہ زہر کھالے اور بچ جائے نہ مرے۔ لیکن موت یقینی اور یقینی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور مہلک چیزوں میں شبہ ہے تو شبہ کی چیزوں سے بچتا ہے اور یقینی شے سے غافل رہتا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے۔ اگر کوئی نفع کا سودا ہے اور آپ کو ذرا بھی اس میں نقصان کا شبہ ہو جائے تو اس سودے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن موت کا آنا یقینی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس سے بالکل نہیں ڈرتے۔ تو وہ علم جو ہے۔ وہ اصل میں حالی علم ہے۔ جب حالی علم ہو جاتا

ہے تو اس سے عمل عموماً جدا نہیں ہوتا۔ اور یہ جو قالی علم ہوتا ہے۔ یہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس سے عمل جدا ہو جاتا ہے۔ یقین کا فرق ہے۔ یقین سے نیچے کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں سب میں شبہ رہتا ہے اور جب یقین ہو جاتا ہے خواہ وہ حس سے ہو خواہ عقل سے ہو خواہ خبر صحیح سے ہو۔ جتنے ذرائع یقین کے ہیں کسی ذریعہ سے بھی یقین ہو جائے تو عمل جدا نہیں ہو گا۔ یقین میں اور ایمان میں کمزوری ضرور ہو گی۔ لیکن اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ علم جس سے عمل جدا نہیں ہوتا وہ علم دراصل علم الیقین نہیں ہوتا۔ وہ یا عین الیقین ہوتا ہے۔ یا حق الیقین ہوتا ہے۔ علم الیقین میں شبہ کا ذرا بہت شائبہ ہے۔ مثلاً دھواں ہے۔ اس میں یہ شائبہ موجود ہے کہ وہاں آگ نہ ہو۔ جہاں دھواں نکلے گا۔ عام طور پر وہاں یہی سمجھا جائے گا کہ آگ ہے۔ دھواں آگ ہونے کی دلیل ہے۔ ہر انسان اور جتنے جانور ہیں سب چبانے میں نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں تو استقرائی نتیجہ یہ نکلا کہ چبانے میں نیچے کا جبڑا ہلتا ہے۔ لیکن مگرمچھ اوپر کا جبڑا ہلاتا ہے تو یہ استثنے نکل آیا اور یہ عینی مشاہدہ قوی نکل آیا۔ اس عینی مشاہدہ کے بعد یہ استقرائی یقین کہ ہر حیوان نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے۔ جاتا رہا۔ اسی طرح ایمان کو دیکھا جائے کہ اسباب یقین کیا ہے، استقرائی ہے، عینی مشاہدہ جس یقین میں استقرائی علامات ہیں وہ کہیں نہ کہیں جا کے غلطی کر جائے گا اور اگر عینی مشاہدہ ہے تو وہ عین الیقین ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر آگ کو سامنے دیکھ لے گا۔ تو اس میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے گا۔ اگر آگ کو مس کر لے اور اس کا چرکا لگے اور اس سے تکلیف ہو تو یہ جو آگ کا یقین ہوا ہے۔ وہ حق الیقین ہے۔ اگر انگارہ کو دیکھ کر سمجھا ہے

تو یہ عین الیقین ہے اور اگر دھواں دیکھ کر سمجھا ہے تو یہ علم الیقین ہے۔ یہ تین
قسم کے یقین ہیں تو حق الیقین اور عین الیقین میں تو علم سے عمل جدا ہو ہی نہیں سکتا
اور علم الیقین میں امکان ہے کیونکہ بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ دھواں ہے
اور آگ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب برف سے دھواں نکلے تو بارش آئے گی ۔
ایک قصہ یاد آیا کہ تاج محل آگرہ کا جو بڑا دروازہ ہے ۔ اس کے پاس ایک گڑھا سا
ہے ۔ اس میں اس زمانے کے انجینیروں نے یہ انتظام رکھا تھا کہ اس سے دریا کا
پانی کھنچتا تھا اور فوارے خود بخود چھوٹنے لگتے تھے۔ تو انگریزوں نے اسے کھود
کر تحقیق کرنا چاہی تو اس فن کا جاننے والا ایک انجینیر اس وقت موجود تھا۔
اس نے ان کو منع کیا کہ تم اس کو کھولو گے ۔ تو یہ تباہ ہو جائے گا۔ لیکن میں ایک
لاکھ روپیہ لوں گا اور ٹھیک کر دوں گا۔ انگریز نہ مانے اس کو کھول دیا تو اس میں سے ایک دھواں
سا نکلا ۔ ایک لاکھ انگریز دینے کو تیار نہیں ہوا۔ وہ اب تک ویسا ہی پڑا ہے ۔
بڑے انجینیر اس کو معلوم بھی نہ کر سکے کہ یہ کیا تھا ۔ دھوئیں پر یہ قصہ یاد آ گیا کہ بغیر
آگ کے بھی دھواں ممکن ہے ۔ ایک اور واقعہ خواجہ نصیر الدین طوسی کا ہے کہ
جنگل میں کسی جگہ خیمہ لگائے اپنے کام میں مصروف تھے کہ قریب گاؤں سے
ایک بڑھیا آئی اس نے جب ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں اپنا کام کر رہا ہوں
بڑھیا نے کہا کہ بیٹا یہاں سے اپنا سامان اور خیمہ ہٹا لے یہ جگہ نشیبی ہے۔ بارش ہونے والی ہے
سارا پانی یہاں سے بہے گا ۔ ورنہ تیرا سب سامان کتابیں بہہ جائیں گی ۔ اس نے اصطرلاب وغیرہ
آلات نکالے اور دیکھا کہیں بارش کے آثار نہیں پائے ۔ یہ سوچ کر کہ بڑھیا بکتی
ہے اپنے کام میں مشغول ہو گیا ۔ رات کو جب وہ سو رہا تھا ۔ نصف شب سے

بارش تیز شروع ہوئی کئی گھنٹہ مسلسل برستی رہی اور اس کا سب سامان بہہ گیا صبح بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ تو نے میرا کہنا نہیں مانا آخر پریشان ہوا اور نقصان اٹھایا۔ اس نے کہا کہ خیر یہ تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مگر تو یہ تو بتا کہ تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ بارش آنے والی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہمارا ایک بلا ہے۔ وہ اگلے پیروں سے خاک اڑاتا ہے۔ مگر جب بارش ہونے والی ہوتی ہے تو پچھلے پیروں سے خاک اڑاتا ہے۔ کل اس نے ایسا ہی کیا تو میں سمجھ گئی کہ بارش آنے والی ہے۔۔ یہ سنکر طوسی کو بڑا تعجب ہوا کہ جانور آلات سے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ یہ خیر پرانی بات ہے ابھی کی بات ہے۔ یہ مسٹر آصف علی بیرسٹر تھے۔ اب ان کا انتقال ہو گیا یہ کچھ لادینی خیالات کے آدمی تھے۔ ان کی حالت چاند کی تین تاریخ کو بڑی خراب ہو جاتی تھی۔ تیسری تاریخ کا چاند نہیں دیکھتے تھے۔ جب ان سے پوچھا تو بتایا کہ میری اماں نے منع کیا تھا کہ تیسری تاریخ کا چاند نہ دیکھنا۔ ورنہ تم پر کوئی مصیبت آجائے گی تو جب سے میری یہ کیفیت ہے اس قسم کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ ایسی علامتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت ہو جاتی ہے۔ کوئی بات تو ان اسباب کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ اور اگر نہیں ہوتیں تو ان کو اتفاقات پر محمول کر لیتے ہیں۔ یہ قلبی قوت پر منحصر ہے۔ اگر پختہ یقین کر لیا ہے تو وہ بات عموماً ہو جاتی ہے۔

یہودیوں پر ذلت کی حالت

سوال :۔ یہودیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ ہمیشہ ذلت میں رہیں گے اور کبھی ان کی سلطنت قائم نہیں ہوگی۔ پھر یہ اسرائیل کی سلطنت کیسے قائم ہوگئی۔؟

جواب :۔ ایک امام صاحب بندر روڈ کی مسجد میں امام تھے ان کا اب انتقال ہوگیا۔ انھوں نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک طالب علم نے مولوی شبیر صاحب کو خط لکھا اور یہ سوال پوچھا مگر انھوں نے جواب نہیں دیا تو وہ شخص مرتد ہوگیا اصل میں یہاں لوگوں کو مغالطہ ہوگیا ہے۔ غور نہیں کیا۔ یہ بات کہ اسرائیل کی سلطنت کبھی قائم نہیں ہوگی۔ یہ اکثر واعظ بیان کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ تو بہت صاف ہیں۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ان پر ذلت مسلط کردی گئی جہاں بھی کہیں ہوں۔ لیکن وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اگر وہ اللہ سے یا لوگوں سے کوئی معاہدہ کرلیں۔ حبل کے معنی وعدہ یا عہد۔ تو انھوں نے برطانیہ اور امریکہ سے عہد کرلیا ہے۔ یہ غلط ہے کہ ان کی سلطنت نہیں ہوگی۔ قرآن میں تو اس طرف اشارہ ہے۔ بلکہ صراحت ہے کہ اگر وہ

اللہ سے یا کسی دیگر قوم یا ملک سے معاہدہ کریں تو ذلت سے مستثنیٰ ہوں گے ہٹلر نے جب ان یہودیوں کو جرمنی سے نکال دیا تو یہ جتنے صناع تھے۔ یہودی آلات حرب بنانے میں سائنس میں بہت ماہر تھے۔ تو انھوں نے امریکہ سے معاہدہ کر لیا کہ ہم تم کو یہ ایٹم بم وغیرہ بنانے کا راز بتا دیں گے تم ہمارے لئے ایک وطن کا انتظام کر دو۔ یہ بات ایک بہت معتبر سرکاری آدمی نے مجھے بتائی تھی امریکہ نے یہ شرط منظور کر لی تو یہودیوں نے وہ نسخہ ان کو بتا دیا۔ وہ ایٹم بم امریکہ نے جاپان میں پھینکا تھا۔ ایک شہر کا شہر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ تو یہ معاہدہ ہی ہوا مفسرین نے کچھ اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ ورنہ الفاظ بہت صاف ہیں۔

سوال۔ اگر قیامت تک یہ معاہدہ قائم رہا تو کیا یہ حکومت قیامت تک رہے گی۔

جواب۔ بیشک اگر ایسا ہوا تو قیامت تک رہے گی۔ اللہ کا کلام تو سچا ہے۔ اور اگر یہ معاہدہ جلد ختم ہو گیا تو یہ حکومت بھی جلد ہی ختم ہو جائیگی یہ بات بحث سے خارج ہے۔ جو اصل سوال تھا۔ اس کا جواب میں نے دے دیا کہ ان کی یہ ذلیل و رسوا کن عادتیں ان میں ہیں سود خواری اور بخل وغیرہ گو بظاہر وہ بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ اس مال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جو لوگ دیکھ کر آتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے۔ مجھے کہ ان کی ذاتی زندگی بڑی خراب ہے کہ اگر آپ دیکھیں یا سنیں تو آپ کو بڑی کراہت ہو ہمارے یہاں کے مسکین اور فقیر جو ہیں ان کی زندگی ان سے بہتر ہے۔

سوال۔ کافر کسے کہتے ہیں۔

جواب:۔ جو شخص لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو ہے مومن اور اس کے علاوہ جو بھی ہے۔ وہ کافر ہے۔ تمام علمائے اسلام ۷۲، کے ۷۲، فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کلمہ توحید ہے۔ شریعت میں اس پورے کلمہ کا نام کلمہ توحید رکھا حالانکہ توحید صرف لا الٰہ الا اللہ ہے اور محمد رسول اللہ یہ کلمہ رسالت ہے۔ لیکن سب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ یہ پورا کلمہ کلمہ توحید ہے تو پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ کلمہ توحید کیا ہے۔ پھر یہ سمجھیں کہ کلمہ رسالت کیا ہے پھر ان دونوں کا جوڑ کیا ہے۔ ورنہ ایمان کے لئے فقط محمد الرسول اللہ کافی ہے کیونکہ اس میں اللہ کا لفظ بھی شامل ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کے معنی سمجھنے کے لئے یہ ماننا ضروری ہے کہ الٰہ کسے کہتے ہیں یعنی معبود کسے کہتے ہیں اور معبود کے معنی جب سمجھ میں آئیں گے۔ جب عبادت کے معنی سمجھ میں آئیں گے۔ تو پہلے عبادت کے معنی سمجھ لینے چاہئیں کہ "عبادت" کیا چیز ہے۔؟

بڑے بڑے علماء اور ائمہ نے عبادت کے معنی بیان فرمائے ہیں اور جو مستند محقق علماء ہیں۔ انہوں نے عبادت کے معنی غایت تعظیم کے فرمائے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ غلط ہیں۔ کیونکہ غایت تعظیم تو تعظیم ہی کے فرع ہے۔ زیادہ سے زیادہ تعظیم تو یہاں تمام غیر اللہ کی ہوتی ہے۔ انبیاء کی تعظیم ہوتی ہے اولیاء کی ہوتی ہے۔ ماں باپ کی تعظیم ہوتی ہے۔ پیروں کی تعظیم ہوتی ہے۔ بادشاہوں اور بڑے لوگوں کی تعظیم ہوتی

ہے۔ اگر ظاہر عمل کو بھی لیا جائے۔ تو وہ بھی یہاں ہوتا ہے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جھکتے ہیں۔ تو غایت تعظیم اگر عبادت ہوگی۔ تو غیر اللہ اس میں شامل ہو جائے گا۔

بعض ائمہ نے یہ فرمایا کہ جس فعل کے کرنے سے خدا راضی ہو وہ فعل عبادت ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ پاک جس طرح عبادت سے خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح معاملہ کی درستی سے بھی خوش ہوتا ہے پورا ناپنے سے پورا تولنے سے سچ بولنے سے بھی اللہ تبارک تعالےٰ اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا جمعہ کی نماز سے بلکہ جمعہ کی نماز اگر آپ کی قضا ہو جائے اور آپ توبہ کریں تو اللہ تعالےٰ اس کو معاف فرما دے گا۔ لیکن اگر کسی کے روپے آپ کے ذمہ ہیں اور وہ آپ نے ادا نہیں کئے تو وہ ناقابل معافی ہے اس کو پورا کرنے کے لئے اس کی نیکیاں اس کو دے دی جائیں گی اور اگر اس کے پاس نیکی نہیں ہوگی یا کم ہوگی تو اس کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے یا صاحب معاملہ اس کو معاف کر دے۔ اس وجہ سے فقہا نے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں حق اللہ اور حق العباد ایک کا نام عبادات دوسرے کا نام معاملات تو اگر عبادت وہ فعل ہوگا جس سے اللہ راضی ہو تو تمام معاملات بھی عبادت ہو جائیں گے۔

بعض بڑے بڑے آئمہ کی کتاب میں میں نے دیکھا کہ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ لیکن یہ معنی بالکل ہی غلط ہیں۔ کیونکہ اللہ پاک نے فرمایا من یطع الرسولؐ فقد اطاع اللہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کر لی۔ وہ اللہ کی

اطاعت سے بے نیاز ہو گیا۔ خدا کی اطاعت وہی ہے جو رسولؐ کی اطاعت ہے۔ لیکن رسولؐ کی عبادت اللہ کی عبادت نہیں ہے۔ وہ کفر ہے، شرک ہے تو معلوم ہوا کہ اطاعت عبادت نہیں ہے اور ایک نکتہ کی بات یہ ہے کہ اطاعت کہتے ہیں جو حکم دیا جائے اس حکم کو بجالانا۔ تو اطاعت حکم کی فرع ہوئی تو بتوں نے کوئی حکم نہیں دیا کہ ہماری عبادت کرو۔ مسیحؑ نے کوئی حکم نہیں دیا کہ میری عبادت کرو۔ جتنے بھی معبودان باطل ہیں ان میں سے کسی نے بھی حکم نہیں دیا کہ ہماری عبادت کرو۔ تو کسی کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی ہے۔ ایک جماعت نے یہ فرمایا ہے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی عاجزی اور ذلت اپنی ظاہر کرنا کسی کے سامنے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح غیر اللہ کی غایت تعظیم ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کے سامنے انتہائی عجز و انکساری کا اظہار بھی ہوتا ہے اور معنی مجھے یاد نہیں آرہے ہیں۔ اس وقت تک بہرحال جتنے معنی بھی بیان کئے گئے ہیں صحیح نہیں ہیں ناقص ہیں۔ اور ایک نکتہ کی بات ہے کہ آدمؑ کو جو سجدہ تھا۔ وہ سجدہ عبادت نہیں تھا۔ سجدہ تعظیم تھا۔ عام علماء اس پر متفق ہیں تمام مسلمان فقہا محققین اور غیر محققین سب اس بات پر متفق ہیں۔ تو یہاں سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیم میں فرق کر رہے ہیں اور وہاں عبادت کو تعظیم بتاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ بات بھی غلط ہے کہ یہ سجدۂ تعظیم تھا۔ یہ سجدۂ تعظیم کی بنا پر کرایا گیا یہ بات غلط ہے۔ آدم کو معظم بنانا تھا۔ اس لئے سجدہ کرایا گیا یہ اصول ہی غلط ہے۔ یہ تو اصول شیطانی ہے اسی لئے تو وہ راندہ درگاہ کیا گیا۔ اس نے یہی تو کہا تھا کہ میں معظم ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگر عظمت وجہ ہوگی سجدہ کی۔ تو اللہ تبارک و تعالےٰ ہر وقت معظم ہے تو چاہیئے کہ اللہ پاک دائماً مسجود ہو۔ ازل سے ابد تک مسجود ہونا چاہیئے۔ لیکن ازل میں وہ معظم تو ہے۔ مگر مسجود نہیں ہے۔ نیز وہ اوقات مکروہہ میں طلوع اور غروب اور زوال کے وقت بھی معظم ہے۔ لیکن ان اوقات میں سجدہ روا نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سجدہ کی علت عظمت نہیں ہے جب خدا کے یہاں یہ علت ثابت نہیں ہے تو غیر خدا میں کیسے ہو سکتی ہے۔ بلکہ سجدہ کی علت امر ہے۔ اذ امرتک، جب میں نے تجھے حکم دے دیا۔ مامنعک تجھے کس نے روکا۔ پہلے میں نے کہا کہ مجھ کو سجدہ کر اب میں نے کہا آدم کو سجدہ کر۔ اور اس کو حق ہے کہ وہ چاہتا تو حکم کرتا درخت کو سجدہ کر سورج کو چاند کو سجدہ کر وہ اگر ایسا کر دیتا۔ تو وہ سب روا ہوتا۔ یہ صرف سجدہ امری ہے اور کچھ نہیں نہ اس میں عبادت ہے نہ تعظیم ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو حکم دے دے کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو سجدہ کر اگر وہ سمجھدار اور بڑا ہے تو قطعی سجدہ کرے گا۔ مثلاً اس نے منیٰ میں تین دن حکم دے دیا کہ کنکری مارو۔ اگر نہ ماریں تو رکن حج چلا جائے گا۔ عبادت ناقص ہو جائے گی قطع نظر حکم کے وہ فعل عبث ہے کیونکہ اگر وہ فعل مستحسن ہوتا تو ہر جگہ مستحسن ہوتا۔ یہاں اگر آپ یہی فعل کریں یا ان تین دن کے علاوہ وہاں بھی یہ فعل کریں تو لوگ پاگل کہیں گے یا نہیں بلکہ اور مجرم گردانے جائیں گے۔ کنکریاں مارنے میں کیا رکھا ہے۔ وہ محض حکم ہے کعبہ میں کیا ہوتا ہے پتھر کو بوسہ دیا جاتا ہے اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ بت خانوں میں کیا ہوتا ہے یہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں حکم سے

ہو رہا ہے وہاں بغیر حکم ہو رہا ہے اور کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ یہاں بت نہیں ہیں۔ وہاں بت اور تصویریں ہیں۔ وہ چاہتا تو تصویروں اور بتوں کے ہوتے ہوئے بھی حکم دے دیتا کہ طواف کرو اس میں کیا بات تھی۔ وہ کہتا ہے لا تمش فی الارض مرحا صاف قانون ہے کہ زمین پر اکڑ کر نہ چل لیکن صفا و مروہ میں وہ حسن ہے۔ اگر وہاں اکڑ کر نہ چلے گا حج ناقص ہو جائیگا۔ تو کیا نتیجہ نکلا؟ کہ تمام عبادات و معاملات اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ اور دیکھئے کہ پوری جنت آدمؑ اور حواؑ کو دے دی کہ اس میں رہو سہو۔ صرف ایک درخت کے پاس نہ جانا اس ایک درخت کو پوری جنت کی کائنات سے کیا نسبت ہے۔ اگر وہ بھی دے دیتا تو کیا تھا۔ لیکن نہیں اس کے لئے ممانعت اور اس کے لئے حکم۔ تمام عبادات و معاملات سب حکم کے تابع ہیں۔ کسی میں کوئی مصلحت۔ علت۔ وجہ نہیں ہے۔ کسی شے میں کوئی برائی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو منع کر دیا ہو۔ نہ کسی شے میں حسن ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا حکم دیا ہے۔ دیکھئے حج میں کتنی مشقت ہے۔ سفر کرو، پیسہ خرچ کرو۔ بھاگ دوڑ کرو۔ مشقت ہی مشقت ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ نماز ہے کھانا پینا بولنا دیکھنا سب بند روزہ ہے کھانا پینا بند اس میں کیا مصلحت۔ سب میں مشقت ہی مشقت ہے۔ بس حکم دے دیا کہ یہ کر اور یہ نہ کر اگر یہ کہو کہ زکواۃ میں مصلحت ہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے تو یہ بھی بالکل غلط ہے۔ دوسروں کے فائدہ سے ہمیں کیا فائدہ۔ سب بھوکے رہیں ہمارا پیٹ بھرنا چاہیئے۔ سب ڈوب جائیں

ہم کو بچ جانا چاہیئے۔ ارے دوسروں کے فائدہ سے ہمیں کیا فائدہ کوئی بھی نہیں پوچھے گا۔ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ
ان یحمل شئ منہ ولو کان ذا قربیٰ اگر کسی کے سر پر اونٹ کا بوجھ لدا ہوا ہو اور وہ کہے کہ کوئی اٹھا لے تو اس کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں اٹھائے گا جب وہ بھی نہ اٹھائے گا تو کیا قرابت ہوئی تو یہ جتنی عبادتیں نمازیں خیرات زکوٰۃ ان میں کچھ حکمتیں نہیں ہیں صرف حکم رب ہے! اور بس۔ اور اگر وہ کہیں قرآن میں حدیث میں کوئی حکمت بتاتا ہے تو وہ حکمت بھی اس کے کہنے کی وجہ سے ہے۔ فی نفسہ وہ بھی حکمت نہیں ہے۔ اس کو حق ہے چاہے جس کو بنا بیان کر دے۔ چاہے بنا بیان بھی نہ کرے۔ اب نوحؑ نے فرمایا۔ ابنی من اھلی میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ اس نے کہہ دیا۔ لیس من اھلک۔ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی نقیض ہے اگر ایک حق ہے تو دوسرا قطعی جھوٹ ہے۔ تو اب کس کو جھوٹا کہو گے۔ خدا کو جھوٹا کہو تو کافر نوحؑ کو جھوٹا کہو تو کافر۔ اس کو حق ہے جو چاہے کہہ دے۔ نبی کا ہر قول اور ہر فعل وحی کے تابع ہوتا ہے۔ ان اتبع یوحیٰ الی میں وہی کرتا ہوں جو وحی مجھے ہوتی ہے۔ وما ینطق عن الھوا۔ نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا تو نبی کا ہر فعل اور ہر قول وحی کا تابع ہوتا ہے۔ پھر ان سے کہہ دیا۔ لما اذنت لھم تو نے کیوں ان کو اجازت دے دی۔ اس کو ہر وقت حق ہے کہ نبی صحیح فعل کرے اور وہ اس کو کہہ دے کہ کیوں تو نے ایسا کیا۔ یاعیسیٰ أنت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ اے عیسیٰ تو نے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود قرار دینا اللہ کے سوا۔

آج ۱۹۶۷ سال کے بعد بھی ہم کو علم ہے کہ انھوں نے تثلیث کی تبلیغ نہیں کی۔ تو کیا خدا کو علم نہیں تھا۔ خدا کو سب معلوم تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ بپاس ادب انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا بلکہ اعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک تو میرے دل کا حال جانتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرے دل میں کیا ہے تیرا اس سوال سے کیا مطلب ہے۔ ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص چوری کر رہا تھا عیسیٰؑ نے اس کو دیکھ کر کہا ہیں چوری کرتا ہے اس نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم میں چوری نہیں کرتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی آنکھوں کی تکذیب کرتا ہوں اور اپنے رب کی تصدیق کرتا ہوں۔

اگر میں نے کہا ہوگا تو تیرے علم میں ہوگا۔

اب اس نے کہہ دیا۔ ولا تقولوا لمن یقتلو فی سبیل اللہ اموات۔ جو اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں۔ ان کو مردہ مت کہو۔ بھلا کوئی کہے گا کہ شہید اور مقتول مردہ نہیں ہے۔ بل احیاء ولکن لا تشعرون بلکہ وہ زندہ ہیں۔ تم کیا جانو زندہ تو وہ ہیں جن کو میں زندہ کہوں، تم جو یہ سمجھتے ہو کہ حس و حرکت کا نام حیات ہے تو یہ تو میں نے تمہارے لئے نام رکھ دیا ہے۔ حس و حرکت دونوں ناقص چیزیں ہیں مخلوق ہیں۔ حس میں تو یہ نقص ہے کہ یہ تمام چیزوں کو محسوس کرتی ہے اور اپنے آپ کو محسوس نہیں کرتی۔ یہ بڑی بدنصیب ہے۔ یہی حال عقل کا ہے کہ ہر شے کا تعقل کرتی ہے اور اپنے آپ کو آج تک نہیں جان سکی کہ کیا ہے۔ ایک سر کا آدمی خیال کرو وہ آگیا۔ خیال میں یا نہیں۔ اس کو اوندھا گدھے پر بٹھا دو بیٹھ گیا یا نہیں۔ ہر شے خیال میں آجاتی ہے۔ مگر خیال آج تک خیال میں نہیں آیا۔ حرکت میں یہ عیب

ہے کہ مجتمع الاجزاء نہیں ہے۔ ایک جز ہوتا ہے۔ مٹ جاتا ہے۔ پھر دوسرا جز
ہوتا ہے۔ مٹ جاتا ہے پھر تیسرا ہوتا ہے۔ یہی سلسلہ ہے تو حس بھی ناقص اور حرکت
بھی ناقص اور ان ہی دو چیزوں کو زندگی کہتے ہو۔ ڈاکٹر کیا دیکھتا ہے۔ قلب کی
حرکت ہی کو تو دیکھتا ہے۔ حرکت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ زندہ ہے۔ حرکت بند
ہو گئی تو کہتے ہیں مردہ ہے۔ خدا میں نہ حس ہے نہ حرکت ہے تاہم وہ حی ہے یا
نہیں۔ تو یہ بھی بلا حس و حرکت کے حی ہوں گے۔ یہ عقلی دلیل سے بھی سمجھ میں بات
آجاتی ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ آگ گرم ہے مگر اس نے کہا آگ ٹھنڈی ہے
بس۔ آگ ٹھنڈی ہے یا نار کونی بردا فرما دیا مجرد اس کے کہتے ہی آگ ٹھنڈی تھی
کوئی قانون نہیں ہے۔ بس ایک ہی قانون ہے۔ جو وہ کہہ دے وہی ٹھیک ہے
اور جو وہ کر دے وہی عدل ہے۔ عدل کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ جس چیز کا نام چاہے
عدل رکھ دے۔ وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ اگر تم کو ڈر ہو کہ چار بیویوں میں
عدل نہ کر سکو گے۔ تو پھر ایک ہی بیوی رکھو۔ او ما ملکت ایمانکم یا لونڈیاں رکھو۔
تو یہاں اس نے کہہ دیا کہ عدل کی ضرورت نہیں قصہ ختم عدل کا۔ اگر عدل کوئی چیز
ہوتا تو ما ملکت ایمانکم میں بھی ہوتا۔ خودکشی بری چیز ہے۔ بری چیز ہے۔ سب
کہتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے سب غلط ہے۔ میں کہہ دوں بری چیز ہے تو بری ہے اگر
میں اس کو اچھا کہہ دوں تو اچھی ہے۔ فاقتلوا انفسکم۔ قتل کرو۔ اپنے نفسوں کو
ذالکم خیر لکم عند بارئکم یہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے لئے اچھا ہے۔ وہ
کہہ دے خودکشی کرو۔ وہ بہتر وہ کہے نہ کرو وہ بہتر۔ تمام صلحاء کو تمام مومنین کو جہنم میں
ڈال دے وہ اس پر سولہ آنے قادر ہے اور اگر وہ ایسا کر دے تو وہی عدل ہے۔ اسی

طرح شیاطین اور فجار کو بہشت میں بھیج دے وہ اس پر قادر ہے اور اگر وہ ایسا کر دے تو وہی عدل ہے۔ پھر دونوں صورتوں میں بھی وہ مستحق حمد ہے۔ جتنے علماء، فضلاء اور صلحاء ہیں یہاں بھی ان کی اکثریت تکلیف میں ہے یا نہیں اگر اسی طرح یہ وہاں بھی تکلیف میں رہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ اگر یہاں وہ تکلیف میں رکھ سکتا ہے۔ وہاں بھی رکھ سکتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے۔ وہی حق ہے اور وہی عدل ہے۔ اسی لیے جس شے کو اس نے کہہ دیا یہ عبادت ہے۔ بس وہ عبادت ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے نہ حسن ہے نہ کوئی اور وجہ سوائے امر کے ہے جس کی وجہ سے اس کو عبادت قرار دیا۔ عبادت محض تابع ہے اس کے حکم کے۔

عبادت کے معنی سمجھنے سے پہلے آپ ایک نکتہ کی بات اور سمجھ لیں ایک شے تو یہاں ہے۔ حاجت اور ایک ہے ضرورت حاجت جس شے کی ہو اگر وہ نہ ملے تو آپ کو دکھ ہوگا۔ اور ضرورت جس شے کی ہے۔ اگر وہ نہ ملے تو آپ ہلاک ہو جائیں گے۔ کھانا ہے پینا ہے ہوا ہے اگر نہ ملے تو ہلاک ہو جائے گا۔ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ نکاح ضرورت نہیں ہے۔ حاجت ہے کہ نہ ملے تو دکھ میں رہے گا۔ ہلاک نہیں ہوگا۔ وہ تمام اشیاء جو اس بدن کے تشخص میں مقوم ہوتی ہیں۔ ان کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے بغیر وہ کامل نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً بھوکا انسان ہے وہ ناقص ہے۔ جب وہ کھانا کھا لے گا تو اب مکمل ہو گیا۔ تو یہ انسان کے جسم میں دخیل ہیں۔ جب یہ مل جائیں گی۔ تو یہ ایک شے بن جائے گا۔ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو صرف زیب و زینت

کی ہیں۔ ان کا درجہ حاجت سے بھی کم ہے۔ یہ راحت کہلاتی ہیں تو یہ دونوں
چیزیں جو حاجت اور ضرورت کی ہیں یہ انسان کے لئے ہیں۔ انسان ان کیلئے
نہیں ہے یعنی وہ سب چیزیں اپنے آپ کو فنا کر رہی ہیں۔ انسان کو بنانے
کے لئے۔ ہر چھوٹی چیز اپنے سے اوپر والی چیز میں فنا کر رہی ہے۔ اپنے آپ کو
یہ مٹی اینٹیں دیوار و در سب فنا ہو رہے ہیں۔ مکان میں۔ تو کل اشیا، انسان
کے لئے ہیں۔ یعنی یہ کل اشیا، وہ ہیں۔ جن کی انسان کو حاجت اور ضرورت
ہے۔ تو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے بعد اب یہ کس کے لئے۔؟ تین صورتیں
ہیں یا تو یہ کسی کے لئے نہیں ہے یا اپنی ذات کے لئے ہے یا کسی اور کیلئے ہے

اگر یہ کسی کے لئے نہیں ہے تو اس کا بننا نہ بننے کے برابر ہو گیا۔ ٹوپی
بنی اور کسی کے سر پر نہ رکھی گئی تو اس کا بننا نہ بننے کے برابر ہو گیا۔ ایک مکان
جنگل میں بنوایا جہاں کوئی نہ رہے تو اس کا بنانا نہ بنانے کے برابر ہو گیا۔ اگر بننا
نہ بننے کے برابر ہو تو اس کو عبث کہتے ہیں۔ تو اگر انسان کسی کے لئے نہیں ہے
تو اس کا ہونا عبث ہو گیا۔ لیکن عبث ہے نہیں افحسبتم انما خلقناکم عَبَثاً"۔
کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے۔ تو معلوم ہوا یہ کسی کے
لئے نہ ہو ایسا نہیں ہے۔

اب اگر یہ اپنی ذات کے لئے ہے تو ذات کے جو تقاضے ہیں۔ وہ
جدا نہیں ہوا کرتے جیسے برف کا تقاضہ ٹھنڈک ہے آگ کا تقاضہ گرمی ہے
سورج کا تقاضہ روشنی ہے۔ یہ ذاتی تقاضے ذات سے جدا نہیں ہوا کرتے۔ اگر
اس کی ذات یعنی روح اس کے وجود کی مقتضی ہوتی تو یہ وجود جدا نہ ہوتا۔ لیکن

یہ جدا ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اس کا ذاتی تقاضہ نہیں ہے۔ یعنی انسان
اپنی ذات کے لئے نہیں ہے۔ آسمانی کتابیں سب بڑھیا ہیں لیکن قرآن
شریف ان سب میں بڑھیا ہے کہ ہر شے کی ہدایت اس میں موجود ہے۔ یہ جو
مسلمانوں کو اس وقت یہودیوں کے ہاتھ ذلت ہوئی کیوں ہوئی قرآن میں
صاف صاف اعلان ہے کہ ولا تهنوا اے نامردمت بنو ولا تحزنوا اور
رنجیدہ مت ہو۔ انتم الاعلون ان كنتم مومنين تم ہی اعلیٰ رہو گے اگر تم مومن ہو
تو خالی لا الہ الا اللہ کہنے سے تو مومن نہیں ہوتا۔ جب تک کامل یقین نہ ہو اور
اس پر صحیح عمل نہ ہو۔ خالی توکل سے تو کام نہیں چلتا۔ جنگ احد میں شکست
ہوئی۔ لوگ مال غنیمت لوٹنے میں لگ گئے جہاں آپؐ نے کھڑا کیا تھا۔
وہاں سے ہٹ گئے تو آپؐ ناراض نہیں ہوئے تو اللہ پاک نے اس کو سراہا
اور فرمایا فبما رحمت من الله لنت لهم وہ تو اللہ کا بڑا کرم ہو گیا کہ تو ان سے
نرمی سے پیش آیا۔ ولو كنت فظا غَلِيظَ الْقَلْبِ۔ اگر کہیں تو سخت دل ہوتا
لَا نْفَضُّوا من حولك تو وہ تیرے ارد گرد سے بھاگ جاتے۔ اس سے ایک
بڑا نکتہ نکلا کہ اتنے بڑے آدمی کی سخت دلی سے آدمی بھاگ جاتے تو معمولی عالم فاضل کی
سخت دلی سے تو بدرجہ اولیٰ بھاگ جائیں گے۔ علماء کو چاہیئے کہ سخت کلامی سے
لوگوں سے پیش نہ آئیں۔ سیاست بتاتی ہے کہ تو ان کو معاف کر دے۔ آگے
فرمایا کہ اس کے بعد بھی ان کے دل صاف نہیں ہونگے۔ ان تستغفر لهم ان
کی معافی کے لئے مجھ سے بھی دعا کر کہ اللہ تو بھی ان کو معاف کر دے یہ بھی
کافی نہیں ہے۔ وَ شَاوِرْهُم۔ ان سے مشورہ کر کہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔

اب سر جوڑ کر بیٹھو اور سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔ کتنی حسین سیاست اور تدبیر بتائی ہے۔ توکل توکل کیے جاتے ہیں۔ کس نے تعلیم دی ہے۔ توکل کی جب یہ سب تدبیریں کر چکے۔ تب فتوکل علی اللہ پھر اللہ پہ توکل کر دو یہ نہیں کہ ہماری تدبیر کا یہ نتیجہ ہے کتنی اچھی تعلیم ہے۔ ساری دنیا کی کتابوں سے معارضہ کریجئے۔ اس سے اچھی کہیں نہیں ملے گی تعلیم

اب آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ انسان نہ عبث ہے اور نہ اپنی ذات کے لئے ہے۔ فلولا ان کنتم غیر مدینین۔ کتنی حسین دلیل ہے۔ اس کتاب کے باہر جتنی دلیلیں ہیں۔ آپ دیکھیں گے وہ یا تو غلط ہوں گی۔ یا الجھی ہوئی ہوں گی۔ فلاسفہ اور حکماء کی جتنی دلیلیں ہیں سب باریک اور دقیق ہیں کہ بڑے سے بڑا عالم بھی سمجھ نہیں سکتا۔ اور اگر تھوڑی بہت سمجھ میں بھی آگئیں تب بھی یقین نہیں ہوتا ہے کہ پتہ نہیں صحیح ہے یا غلط کتنی واضح اور صاف دلیل ہے۔ اذا بلغت الحلقوم وانتم حینئذ تنظرون فلولا ان کنتم غیر مدینین۔ ترجعونها ان کنتم صادقین اگر تم کسی کے بس میں نہیں ہو تو لوٹا کیوں نہیں لیتے اگر تم سچے ہو جب جان حلقوم میں آجاتی ہے تو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔ مرنا کوئی نہیں چاہتا جب نہیں لوٹا سکتے تو سمجھ لو کہ بے بس ہو جس کے بس میں ہو وہ ہی تو میں ہوں۔ اذا بلغت الحلقوم وانتم حینئذ تنظرون جب جان حلق میں آجاتی ہے۔ تو تم دیکھتے کہ دیکھتے رہ جاتے ہو ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون ہم اس کے بہت قریب ہوتے ہیں لیکن تمہیں نظر نہیں آتے۔

قرآن شریف میں جتنی دلیلیں الوہیت کی ہیں وہ سب یقینی ہیں۔

اور بہت آسان ہیں جو بڑی سے بڑی عقل کے آدمی سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی عقل کا آدمی تک ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ حکماء اور فلسفیوں کی دلیلیں بہت دقیق ہوتی ہیں۔ جو عالموں کے بھی بہت کم سمجھ میں آتی ہیں۔

اب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان کسی کے لئے ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے لئے اور انسان کائنات کی کسی شے کے لئے نہیں ہے تو پھر ضرور وہ کائنات سے باہر کسی شے کے لئے ہے اور کائنات سے باہر صرف ذات باری تعالیٰ ہے تو انسان اپنے رب کے لئے ہے۔ کل کائنات انسان کے لئے اور انسان خالق کائنات کے لئے۔ خالق کسی کے لئے نہیں ہے وہ خود ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا۔ ومَا صنعتک الا لنفسی میں نے تجھے صرف اپنے لئے پیدا کیا۔ کل کائنات تیرے لئے ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کل کائنات کو اپنے میں صرف کر اسی کا نام معاملہ ہے۔ اس نے دلیل بیان کی کہ ہم نے نبی کو بھیجا کتاب بھیجی ان کو تو تو نے لے لیا مگر انزلنا الحدید ہم نے لوہا پیدا کیا اس کو نہیں لیا۔ یورپ والوں نے اس ٹکڑے کو لے لیا۔ لوہے کا پانی بنا دیا اور اس سے اسلحہ وغیرہ بنا لیا۔ تم نے اس ٹکڑے کو چھوڑ دیا۔ قل انظروا ماذا فی السمٰوات ومَا فی الارض فرمایا دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں اور زمینوں میں یہ نظریہ پہلے قرآن ہی نے پیش کیا ہے۔ تم نے کائنات کو چھوڑ دیا۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا۔ ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصّالحون ہم نے زبور میں بعد نصیحت کے یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے وہ بندے ہوں گے جن میں صلاحیت امن عامہ کے قائم کرنے

کی ہوگی۔ ان فی ھذا البلاغ لقوم عابدین۔ سخت تنبیہ ہے عابدوں کے لئے صرف
عبادت پر بھروسہ نہ کرنا نظام عالم قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ وما ارسلناک
الا رحمۃ للعالمین ہم نے تم کو دونوں قوموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
عابدین کے لئے بھی اور نظام عالم قائم کرنے والوں کے لئے بھی۔ دونوں کو
بتانا۔ دونوں کو ہدایت دینا۔ پھر اس کی تدبیر بتائی واعدوا لھم ما استطعتم من
قوۃ ومن رباط الخیل جتنی طاقت ہے تم میں زیادہ سے زیادہ سامان حرب
بناؤ۔ اس زمانہ میں وہی گھوڑے ہی تھے۔ اب یہ توپ گولے وغیرہ ہیں ترھبون
بہ عدو اللہ وعدوکم۔ تاکہ تم ڈرا دو۔ خوفزدہ کر دو۔ خدا کے اور اپنے دشمن
کو۔ تو کہاں کیا تم نے اس پر عمل۔ تعیشات میں وقت ضائع کر دیا جو اس
نے کہا تھا۔ اس کے خلاف کیا۔ خدا کی جو عادت ہے۔ وہ جاری رہے گی
مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کا سبب کیا ہے۔ غدر کے بعد مسلمانوں
کے بڑے بڑے لیڈروں نے بڑے بڑے مضامین لکھے کسی نے کچھ لکھا۔
کسی نے کچھ لکھا۔ جو برائیاں تھیں وہ بتائیں۔ سرسید کو اس کا بہت شوق
تھا۔ مسلمانوں کا لیڈر اول تھا۔ غدر کے بعد جامع مسجد میں امام صاحب
جامع مسجد موجودہ امام جو کبھی کبھی یہاں آتے ہیں۔ اس روز حکیم صاحب
کے یہاں آئے تھے۔ ان کے دادا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے لوگ
جامع مسجد کے حوض پر مل کر بیٹھے۔ ان لوگوں نے بڑا رنج کیا اور کہا کہ بھئی
ہندوستان سے چلے چلو۔ عرب یا افغانستان ان میں مولانا قاسم نانوتوی اور
سرسید احمد خاں بھی تھے۔ تو سرسید نے کہا کہ بھئی تم تو دیوبند میں دینی مدرسہ

قائم کرو اور میں علی گڑھ میں کالج قائم کرتا ہوں یہیں بیٹھ کر کچھ کام کریں
گے۔ تو یہ اس قسم کے مضامین لکھوایا کرتے تھے۔ مگر اصل سبب خدا نے
بنایا۔ بڑی عجیب بات ہے۔ عقل سے تو کام لینا ہی غلط ہے۔ عقل سے کام
حب ہیں جب وہ کہے ورنہ نہ لے۔ کیونکہ عقل کا تو اس زندگی میں کوئی دخل ہی
نہیں ہے۔ اگر دخل ہوتا تو اتنی بڑی تعداد جو جانوروں کی ہے۔ جس کے
مقابلہ میں انسان سمندر میں قطرہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ ان کو بھی عقل دی
جاتی ہے۔ وہ سب بغیر عقل کے زندگی گذار رہے ہیں۔ تو عقل زندگی گذارنے
کے لئے نہیں یہ کسی اور کام کے لئے ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ افتؤمنون ببعض
الکتاب وتکفرون۔ ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ کتاب کے
ایک حصہ کو تو لیتے ہو۔ اور دوسرے کو نہیں لیتے یعنی لا الہ الا اللہ تو کہتے ہو۔
مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ فما جزاء من یفعل ذالک منکم ایسا کرنے والے کی
کیا سزا ہے۔ کوئی سزا نہیں اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا — دنیا کی زندگی
میں رسوائی اور اقوام عالم میں پستی اور قیامت میں رسوائی۔ ایک ٹکڑے کو
لے لیا ایک کو چھوڑ دیا یا تو دونوں کو چھوڑ دیتے تو ان جیسے ہو جاتے جیسے
کہ دونوں کو چھوڑنے والے ہیں۔ یورپ و امریکہ یا دونوں کو لے لیتے تو ایسے
ہو جاتے جیسے دونوں کے لینے والے تھے یعنی حضرت ابوبکر و عمر کتنی اچھی
بات ہے۔ بڑا نقصان ہوا ہے۔ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ برابر کہہ رہا ہے تقولون
مالا تفعلون ارے ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ زبان
سے کہہ دیتے ہیں۔ کرتے ہیں نہیں۔ مصر میں ہوئی تا لغویت۔ اندازہ نہیں کیا

بتایا پہلے اندازہ کرو۔ طاقت کم ہو۔ تو طاقت پیدا کرو۔ سب بتایا یہ کرو یہ کرو۔
کہاں گیا۔ نہیں کیا نا۔ آخر ذلت ہوئی۔ اب اصل بات کو سمجھیں کہ تمام
کائنات کو فنا کر و اپنے میں۔ اس کا نام ہے معاملہ۔ سب سے فائدہ اٹھاؤ
کوئی چیز اللہ نے بے کار نہیں بنائی۔ تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں۔
سخر لکم مافی السموات ومافی الارض زمین آسمان سب تمہارے لئے مسخر
کر دیئے۔ کیوں کائنات آسمانی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیوں کائنات زمینی سے فائدہ نہیں
اٹھایا۔ حکم دیا۔ سیروافی الارض دیکھو تو زمین میں کیا کیا ہے کس پر عمل کیا۔ کسی پر بھی نہیں
کیا۔ ایک چھوٹی سی عوام کی جماعت نے نماز روزہ پر عمل کیا۔ باقی عوام نے اس
کا بھی خیال نہیں کیا۔ اصل بات رہ جائے گی۔ ہمیں سمجھانا یہ ہے کہ انسان خالق
انسان کے لئے ہے۔ کل کائنات کو اپنے میں مٹا لے یہ معاملہ ہے۔ اپنے آپ کو خالق
کائنات میں مٹا دے۔ یہ عبادت ہے۔ اپنے آپ کو خالق پر نثار
کر دینا۔ فنا کر دینے کا نام عبادت ہے۔ بس یہ معنی عبادت کے ہیں اور کچھ نہیں۔
اس ہزار سالہ دور میں متفردانہ حیثیت سے کہہ رہا ہوں کسی نے صحیح تعریف
عبادت کی نہیں کی ہے۔ تو لاالہ الا اللہ کے کیا معنی ہیں کہ کوئی ذات ایسی
نہیں ہے جس پر انسان اپنے آپ کو نثار کر دے سوائے خدا کے۔ خدا ہی اس
قابل ہے کہ انسان اس پر اپنے آپ کو نثار کر دے۔ خواہ روزہ رکھ کر خواہ نماز
پڑھ کر خواہ جہاد کر کے۔ کوئی صورت نہیں ہے۔ بس جو وہ کہے۔ وہ کہہ دے کہ
یونہی بیٹھے رہو۔ بس بیٹھے رہو۔ یہی عبادت ہے یہی نثار ہونا ہے۔ جب یہ بات
ثابت ہو گئی کہ سوائے خدا کے کوئی ذات ایسی نہیں ہے جس پر نثار ہو جائے

یہاں نثار ہوتے ہیں۔ کہتے نہیں ہیں کہ

ع :۔ مرتے ہیں ہم تو تم پر جیتے ہیں جب تلک ؛ یہ مرنا کیا ہے۔ یہ
خیال ہوتا ہے کہ یہاں سورج کی چاند کی درختوں کی جانوروں کی بتوں کی
پوجا ہوتی ہے۔ خیر یہ سب تو گھٹیا چیزیں ہیں کوئی ان میں اس قابل نہیں
ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ تو بہت بڑھیا چیز ہیں۔
آیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر جان فدا کی جائے تو کہا نہیں یہ بھی الٰہ نہیں
ہیں۔ یہ بھی اللہ کے رسولؐ ہیں۔ محمد الرسولؐ اللہ کے یہ معنی ہیں۔ یہ بھی اللہ نہیں
ہیں۔ بلکہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ محمد الرسولؐ اللہ دلیل
ہے۔ لاالٰہ اللہ کی محمد ایسی بڑھیا چیز خدا نہیں بن سکتی تو گھٹیا چیز کیسے خدا
بن سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب بہتر سے بہتر چیز خدا بننے کے قابل نہیں
ہے۔ وہ بھی خدا کا رسولؐ بننے کے قابل ہے۔ تو گھٹیا چیز کیوں کر خدا بن سکتی
ہے۔ اب اگر وہ کہہ دے کہ جو کچھ رسولؐ کہہ دے وہ منظور تو وہی بات ہوگئی
وہ خدا ہی بات ہوئی۔ یہ کس نے کہا کہ محمد رسولؐ اللہ ہیں۔ اللہ ہی نے کہا اور
اس نے یہ کہا یطع الرسول فقد اطاع اللہ اللہ پاک نے کہہ دیا کہ نبی کی اطاعت میری
اطاعت ہے تو نبی کی اطاعت نہ رہی وہ اللہ ہی کی اطاعت ہوئی ایک ہی چیز ہے اگر وہ نہ کہتا
تو ان کی اطاعت نہیں ہوئی۔ اب کلمہ طیبہ کے معنی آپ کے سمجھ میں آ گئے۔ جب
سب سے بڑھیا چیز کی نفی ہوگئی تو ہر شے کی نفی ہوگئی۔ خود بخود دوسرا ٹکڑا
پہلے ٹکڑے کی دلیل ہے۔ پہلا ٹکڑا مدلول ہے۔ دوسرا دلیل ہے۔ محمد رسول اللہ
نے دلالت کی لا الٰہ الا اللہ پر۔ اگر وہ دلالت نہ کرتے تو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے

تھے۔ توحید کی تعلیم انہیں نے دی ہے۔ اگر وہ یہ تعلیم نہ دیتے تو کسی حکیم، کسی عالم کسی جاہل کے سمجھ ہی میں نہیں آسکتا تھا۔ مختلف طریقوں سے مختلف عقلوں کے مطابق اسے سمجھایا۔ بات بہت واضح ہوگئی۔

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کریں۔ پھر گھر والوں کو پھر محلہ والوں کو پھر اس طرح پوری قوم کو صحیح کریں اور خدا کے قانون پر عمل کریں۔ خدا کے قانون پر بغیر عمل کئے کوئی نظام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اب اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

دُعا

اعتراض یہ ہے کہ دعا نہیں کرنی چاہیئے۔ دلیل یہ ہے کہ جو دعا کی جائے گی یا خدا کو اس کے وقوع کا علم ہوگا یا اس کے لا وقوع کا علم ہوگا۔ اب اگر اس کے واقع ہونے کا علم ہے۔ خدائے تعالیٰ کو تو وہ ضرور بالضرور واقع ہو کے رہے گی۔ اور اگر اس کے واقع نہ ہونے کا علم ہے تو وہ ہرگز واقع نہ ہوگی وہ ممتنع اور محال ہے۔ خواہ دعا مانگی جائے یا نہ مانگی جائے۔ اگر ملنا اس کے علم میں ہے تو مل کے رہے گی اور اگر نہ ملنا اس کے علم میں ہے تو کبھی نہیں ملے گی۔ لہٰذا دعا مانگنا بے سود ہے۔ بہت مشکل بات ہے۔ ہم لوگ جو دعا کے قائل ہیں ہمارے علماء قاعدہ میں اس کا جواب نہیں دے سکے۔ میں اسی قسم کے مسائل بیان کیا کرتا ہوں۔ جو اختلافی ہوں اور ان میں جو دقت ہو اس کو حل کر دیتا ہوں۔ اسی مسئلے کو ایک اور طریقہ پر بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قضا و قدر ثابت ہے۔ وہ طے ہو چکا۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا جف القلم بما ھو کائن الی یوم القیامہ قلم خشک ہوگیا قیامت تک کے واقعات لکھ کر ایک اور طریقہ پر یوں بیان کیا ہے کہ اگر خدا کو اس کا علم ہو کہ شے واقع ہوگی۔ اور پھر نہ ہو تو خدا کا علم جہل سے بدل جائے گا۔ اور اگر خدا نے کسی شے کا ارادہ کر لیا کہ ہو اور پھر وہ نہ ہو تو ارادہ ارادہ نہیں رہے گا۔ تمنا رہ جائے گی۔ ایک خیال ہے کہ ایسا ہونا چاہیئے ہوتا ہوا تا کچھ بھی نہیں۔ ہر شے خدا کی قدرت سے ہوتی ہے۔ پھر وہ اس کی قدرت سے نہ ہو تو اللہ پاک قادر نہیں رہے گا۔ عجز لازم آئے گا۔ اور اگر خدا نے یہ خبر دی کہ یہ ہوگا اور پھر نہ ہو تو صدق کذب سے بدل جائے گا۔ یہ چار خرابیاں لازم آئینگی لہٰذا اعتراض بہت مستحکم ہوگیا۔ انہوں نے جواب یہ دیا کہ اگر اس کے وقوع کا علم

ہے تو طالب دعا کر کے رہے گا۔ اور اگر اس کے لاوقوع کا علم ہے تو وہ دعا ہرگز نہیں
کرے گا۔ اسی بات کو وقوع سے طالب دعا کی طرف رجوع کر کے اس کا معارضہ
کر دیا۔ دلیل کی غلطی نہیں پکڑی۔ دلیل کا پہلا عنوان علم کا ہے۔ دوسرا عنوان ارادہ
کا ہے۔ تیسرا عنوان قدرت کا ہے اور چوتھا عنوان صدق کا ہے۔ اور اسی سے انہوں
نے تکلیف مالایطاق اور جبر کو ثابت کیا ہے۔ اور اس دعا کے معاملہ میں اہل سنت
و جماعت اور معتزلہ سب شریک ہیں اور مخالف جماعت ملحدوں کی ہے یہ جماعت
دعا کی منکر ہے اور کہتی ہے کہ دعا بے سود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کسی شے
کا علم اللہ کو ہو کہ وہ واقع ہو گی تو وہ قطعی واجب ہے۔ اور لاوقوع کے علم کی صورت
میں ممتنع اور محال ہو گی تو واجب اور ممتنع اور محال کی دعا بے سود ہے۔ اس میں جو
خرابی ہے۔ اسی کی وجہ سے اہل سنت و جماعت جبر کے قائل ہوتے۔ اور حکماء اور
فلاسفہ کے جتنے خراب عقیدے ہیں۔ سب اسی کی وجہ سے خراب ہوئے۔ یہ ایک
دھوکا ہے۔ اسے آپ غور کریں۔ غور طلب بات ہے۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ
نے جان لیا کہ یہ شے واقع ہو گی۔ تو وہ واجب ہو گئی۔ تو کیا شے واجب ہوئی۔ وہ شے
واجب نہیں ہوئی بلکہ اس شے کا واقع ہونا واجب ہوا۔ وہ شے تو جیسی ہے۔ ویسی
ہی رہے گی۔ اللہ کے علم سے صرف اتنا واجب ہوتا ہے کہ اس کے واقع نہ ہونے
سے جہل لازم آتا ہے۔ اس لئے اس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ تو واجب اس کا واقع
ہونا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ جان لیا کہ زید کو دس ہزار روپیہ ملے گا۔ تو دس ہزار روپیہ
کا ملنا اس کے علم میں ہے وہ قطعی واجب ہے۔ لیکن دس ہزار روپیہ فی نفسہٖ ممکن
ہے یہ واجب نہیں ہے یعنی کسی شے کے وقوع کا واجب ہونا یہ نہیں چاہتا کہ وہ
شے واجب ہو جائے۔ مثال سے سمجھیں۔ انسان کے لئے حیوان ہونا واجب ہے۔
ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان جسم نہ ہو سکے یعنی انسان ہو اور جسم نہ ہو یہ محال اور ناممکن ۔

ہے۔ تو انسان کے لئے جسم کا ہونا واجب ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ یہ وجوب جو ہے وہ دراصل جہت قضیہ ہے۔ یہ نسبت کا وجوب ہے۔ منتسبین کا وجوب نہیں ہے انسان اور حیوان دونوں غیر واجب اور دونوں ممکن۔ انسان بھی ممکن اور حیوان بھی ممکن۔ لیکن ایک کے لئے دوسرے کا ثبوت واجب — جیسے آگ کے لئے حرارت کا ثبوت تو واجب اور آگ اپنی جگہ پر ممکن اور حرارت اپنی جگہ پر ممکن۔ دونوں غیر واجب۔ واجب اس شے کو کہتے ہیں جو جدا نہ ہو سکے۔ جس کا جدا ہونا ناممکن ہو۔ آگ کو حرارت واجب ہے۔ آگ بغیر حرارت نہیں ہو سکتی۔ حرارت کے الگ ہوتے ہی آگ فنا ہو جائے گی۔ راکھ بن جائے گی۔ حرارت آگ کو ضروری اور لازم ہوئی۔ حرارت کی آگ سے جدائی ناممکن ہے۔ یہ معنی حرارت کے واجب ہونے کے ہیں۔ آگ مخلوق ہے۔ ممکن ہے، حرارت مخلوق ہے۔ ممکن ہے۔ لیکن ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے لئے ثبوت یہ واجب ہے یعنی وجوب صفت ثبوت کی ہے۔ ثابت اور مثبت کی نہیں ہے۔ یہ دقیقہ ہے جس پہ یہ سب لوگ مطلع نہیں ہوئے اور اس کو واجب اور ممتنع قرار دے کر جبر اور قدم عالم کے مسئلوں میں غلطیاں کیں۔ ان سب مسئلوں کی بنیاد یہی ہے۔ کہ ایک وجوب تو نسبت اور صفت کیلئے ہے اور ایک وجوب موصوف کیلئے ہے۔ آگ اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ چاہے تو ہو۔ اللہ چاہے تو نہ ہو۔ تو ایسی شے خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔ اس کا نام واجب نہیں ہے۔ واجب اسے کہتے ہیں کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے ہر حال میں وہ ہو۔ اور محال کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے وہ "نہ ہو"۔ ممکن کے معنی یہ ہیں کہ چاہے ہو چاہے نہ ہو۔ تو اللہ تعالےٰ نے جب جان لیا کہ ایک شے واقع ہوگی تو وہ ضرور ہوگی۔ اسی سے انہوں نے نکالا کہ ابو جہل کا کفر اللہ پاک نے جان لیا تو اب وہ کفر کر کے رہے گا اور جو اسے تکلیف ایمان کی دی جائے گی وہ محال کی تکلیف ہوگی۔ ابو جہل مجبور ہو گیا اس کا اختیار جاتا رہا۔ محال کی تکلیف ہوئی۔ میں اس خرابی کو کھول رہا ہوں اور بتا رہا ہوں کہ اس میں دقت کیا

ہے۔ اس میں دقت یہ ہے کہ اللہ کا جو معلوم ہے وہ واقع ہوگا۔ غیر واقع نہیں ہوگا۔ لیکن وہ جو شئے ہے جس شئے کا وقوع ہے۔ وہ شئے اپنی جگہ جوں کی توں رہے گی۔ اس میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔ وقوع اور عدم وقوع میں تغیر ہوگا علم سے۔ وقوع کا علم ہے تو واقع ہوکے رہے گا۔ لا وقوع نہیں ہوگا۔ اگر لا وقوع کا علم ہے تو لا وقوع ہوگا۔ وقوع نہیں ہوگا۔ لیکن جس شئے کا وقوع یا لا وقوع ہے۔ وہ ممکن ہے وہ نہ واجب ہے نہ ممتنع ہے۔ خدا کے علم سے شئے واجب یا محال نہیں ہوتی۔ کیونکہ خدا کو تو تمام موجودات کا علم ہے اور تمام معدومات کا علم ہے۔ تو اس کے علم۔ موجودات اور معلومات سے یہ نہیں ہوتا کہ موجودات تمام واجب ہو جائیں۔ اور معدومات سب محال ہو جائیں خدا کو ہر شئے کا علم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے خلاف تو ہونے کا نہیں جب اس کے خلاف نہیں ہونے کا تو وہ سب شئے واجب ہو جائیں گی۔ حالانکہ کوئی واجب نہیں ہے۔ سب ممکن ہیں۔ اور سب اس کی مخلوق ہیں۔ سوائے اس کی ذات وصفات کے وہ تو واجب ہی رہیں گی مگر وہ اس کے جاننے سے واجب نہیں ہوتی ہیں۔ وہ جاننے سے قطع نظر واجب ہیں۔ یعنی اگر خدا اپنے آپ کو نہ جانے تو قطع نظر جاننے کے وہ فی نفسہٖ واجب ہے۔ علم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تو اگر خدا کسی چیز کو جان لے تو جاننے سے اس شئے کا واجب ہونا یا اگر اس کا نہ ہونا اس کے علم میں ہے تو اس شئے کا ممتنع اور محال ہونا لازم نہیں آتا بلکہ موجود ہونا اور معدوم ہونا لازم آتا ہے۔ تو اب دعا سے جو شئے مانگی گئی ہے۔ وہ فی نفسہٖ ممکن ہے۔ اور ممکن کے لئے دعا کی جاسکتی ہے سیدھی بات یہ ہے کہ بندہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خدا کو اس کے وقوع کا علم ہے۔ یا لا وقوع کا علم ہے۔ بندہ جو خدا سے چیز مانگ رہا ہے۔ تو اس کو تو جب علم ہوگا۔ جب چیز اس کو مل جائے گی اور جب تک نہیں ملی۔ اس وقت تک اس کو یہ علم نہیں ہے کہ خدا کا علم اس کے دینے کے ساتھ متعلق ہوا یا نہ دینے کے ساتھ متعلق ہوا۔

اگر بندہ کو یہ علم ہوجائے کہ یہ شے اس کو ملے گی تو کبھی دعا نہ مانگے۔ یا نہیں ملے گی۔ تب بھی دعا نہ مانگے۔ تو دھوکہ یہ ہوا کہ خدا کے علم کو بندہ کے علم میں شامل کر دیا۔ خدا کے علم کا بندہ کو علم نہیں ہوا۔ خدا کے علم کا علم جب ہوگا جب وہ شے واقع ہوگی۔ یا نہ واقع ہوگی۔ اگر نہیں ملی تو سمجھے گا کہ خدا کی مرضی یہی تھی۔ اور اگر مل گئی تو سمجھے گا کہ خدا کا علم اس سے متعلق ہوا۔ تو چونکہ اس کو علم نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت اس سے مانگے گا۔ صحیح حل اس کا یہ ہے۔ اب رہ گیا جف القلم کا مسئلہ۔ کہ قلم خشک ہوگیا کائنات کے واقعات لکھکر۔ تو وہ بہت مشکل بات ہے۔ وہ بھی لاینحل ہے۔ اسے بھی سمجھ لیں کہ جو چیز لکھی جاچکی ہے۔ مثلاً' عمر' وہ نہ گھٹے گی۔ نہ بڑھے گی مگر جہاں یہ سب مضامین ہیں وہاں یہ مضمون بھی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اس کو گھٹا بڑھا بھی دے گا۔ جہاں وہ قضائیں اور قضیے لکھے ہیں۔ وہاں گھٹاؤ اور بڑھاؤ بھی لکھا ہوا ہے۔ تو جہاں وہ چیزیں لکھ کر خشک ہوگئی ہیں۔ وہاں یہ لکھ کر بھی خشک ہوچکا ہے کہ اگر یہ دعا مانگے گا تو قبول ہوگی۔ اگر نہیں مانگے گا تو نہیں قبول ہوگی۔ اور یہ دعا مانگے یا نہ مانگے میں اس کو دوں گا۔ یہ چیز بھی اس میں لکھی ہوئی ہے۔

سر صفحہ نوشتہ بود يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے ثابت کر دیتا ہے۔ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ کتاب اس کے پاس ہی رکھی ہوئی ہے یعنی لوح محفوظ۔ تو جہاں قضا و قدر لکھی ہوئی ہے وہاں تغیر و تبدل اور گھٹانے بڑھانے کے کل اختیارات بھی لکھے ہوتے ہیں۔ وہاں لکھا ہوا ہے کہ اس کو کچھ نہ ملے گا مگر اس نے کہہ دیا کہ دعا کر مانگ تو، میں تجھے دوں گا۔ تو آپنے دعا مانگی تو اس نے اسے مٹا دیا اور یہ لکھ دیا۔ اور یہ مٹانا اور لکھنا یہ پہلے لکھ چکا ہے کہ جو چاہوں گا مٹاؤں گا اور لکھوں گا۔ ابو درداؓء سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ رات کے پچھلے حصہ میں (اندازاً تین بجے کے بعد) اللہ تعالےٰ اس کتاب

کو دیکھتا ہے اور کوئی مخلوق اس پر نظر نہیں ڈال سکتی۔ اس وقت وہ جو چاہتا ہے مٹا
دیتا ہے اور جو چاہتا ہے۔ لکھ دیتا ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ رات کے وقت
دعا کرنی چاہیئے۔ اگر شرعی طریقہ پر لیں تو انبیاء علیہم السلام نے اتنی دعا مانگی ہے کہ
کوئی بھی امتی اتنی دعا نہیں مانگ سکتا۔ سارا قرآن شریف دعاؤں سے بھرا ہوا ہے۔
الصدقۃ قطع غضب الربانیہ۔ صدقہ غضب الہٰی کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔
صلہ رحمی سے اور دعا سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو یہ تبدیلی درحقیقت تقدیر کی
تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ تقدیر یہ ہے کہ تبدیل بھی شامل ہے۔ جہاں تقدیر سے جف القلم
ہوا۔ وہاں تغیر و تبدل سے بھی جف القلم ہوا۔ یہ ہے اس کا صحیح جواب۔ مسئلہ صاف
ہو گیا مگر ایک دقت ہے یہاں وہ بہت مشکل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اذا سألك عبادی
عنی فانی قریب۔ جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں اس وقت میں
پاس ہی ہوتا ہوں۔ یہاں قل یا فقل انی قریب نہیں کہا۔ خدا کی کتاب میں دستور
یہ رہا ہے۔ کہ جہاں سوال ہوا ہے۔ وہاں جواب قل سے یا فقل سے شروع ہوا ہے
جیسے یسئلونك عن الجبال وہ تجھ سے پہاڑوں کی بابت پوچھتے ہیں (کہ یہ حادث
ہیں یا قدیم) کہا فقل ینسفها ربی نفسا۔ اللہ اس کا ریزہ ریزہ کر دے گا۔ یا یسئلونك
عن الروح تجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کیا ہے قل الروح
من امر ربی کہہ دے روح اللہ کے حکم میں سے ایک حکم ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ
علیہ نے فرمایا کہ روح کا مسئلہ اور تقدیر کا مسئلہ مکاشفات سے تعلق رکھتا
ہے۔ احیاء العلوم میں یہ مضمون موجود ہے۔ تو انہوں نے گھبرا کر یا کسی طریقہ سے
یہ بات کہہ دی کیونکہ سوال جو کیا تھا وہ یہودیوں نے کیا تھا۔ وہ ارباب مکاشفہ
میں سے نہیں تھے وہ اس لائق ہی نہیں تھے۔ جواب تو ان کی عقل کے مطابق دینا چاہیئے
تھا۔ یہ کہنا کہ روح کا معاملہ علم مکاشفہ میں سے تعلق رکھتا ہے علمی معاملہ یا علم کے معاملے سے اس

کاتعلق نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ سوال یہودیوں کا تھا۔ ان کو صحیح جواب دینا چاہیئے
ـــــ ـــ ـــ یہ جواب جو ان کو دیا گیا صحیح ہے ـ اسے آپ سمجھ لیں یہ لفظ
"کیا" جو ہے یہ کس شئے سے ہے۔ کس چیز کا سوال کرتا ہے۔ یہ علل کا متلاشی ہے۔
وجود کی چار علتیں ہیں۔ مرکبات کی چار علتیں ہیں۔ علت فاعلی، علت غائی۔ علت
مادی۔ علت صوری۔ فاعل کو پوچھتا ہے۔ غایت کو پوچھتا ہے۔ مادہ کو پوچھتا ہے
اور صورت کو پوچھتا ہے۔ یہ کس نے بنایا۔ کس مقصد سے بنا۔ کس شئے سے بنا اور
اس کی موجودہ ہیئت کیا ہے۔ جیسے کرسی کی طرف پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے تو کہا جائے گا
کہ اس کو بڑھئی نے بنایا۔ بیٹھنے کے لئے بنایا۔ اور لکڑی سے بنا۔ چوکور ہے۔ گول ہے۔
وغیرہ۔ تو مرکبات کے لئے چار اور غیر مرکب کے لئے دو علتیں ہیں۔ مرکب کے لئے
فاعل۔ غایت۔ مادہ اور صورت بتانی ہوگی۔ اور جو شئے غیر مرکب ہے بسیط ہے۔
اس کے لئے فاعل اور غایت بتانی ہوگی۔ تو روح جو ہے وہ مرکب چیز نہیں ہے۔
اس لئے کہ روح کے اندر غیر مرکب چیز آتی ہے۔ یعنی نقطہ اور نقطہ ناقابل تقسیم
ہے۔ نقطہ خط کی طرف ہے۔ اور اگر وہ قابل تقسیم ہوگا تو سطح بن جائے گا نقطہ
بسیط چیز ہے۔ اور اس کا تصور دل میں یعنی روح میں آتا ہے۔ تو جب روح کو کاٹیں
گے تو جو اس میں حال ہے وہ بھی کٹ جائے گا لیکن نقطہ نہیں کٹ سکتا۔ تو معلوم
ہوا کہ اس کا جو محل ہے۔ وہ بھی نہیں کٹ سکتا۔ لہٰذا روح غیر منقسم چیز ہے۔ جب
غیر منقسم ہوگئی تو مرکب نہ رہی تو مفرد ہوئی۔ اور اس کے لئے دو علتیں چاہئیں۔ ایک
فاعل اور دوسری غایت یعنی کس نے بنایا اور کس لئے بنایا۔ ان دونوں علتوں میں
جو قوی علت ہے وہ فاعل کی ہے کہ فاعل کے بغیر تو ہو ہی نہیں سکتا۔ غایت کے
بغیر ممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ درجہ میں وہ لغو ہوگا۔ جیسے بیٹھے بیٹھے تنکا توڑتے
ہیں۔ کیوں توڑا؟ کوئی وجہ نہیں کوئی غایت نہیں۔ لیکن فعل ہو ضرور گیا۔ لیکن فاعل

کے بغیر فعل نہیں ہو سکتا۔ تو علت فاعلی اور علت غائی میں علت فاعلی زیادہ قوی تھی تو علت فاعلی میں جواب دیا کہ الروح من امر ربی روح کا وجود صرف میرے رب کے امر سے ہے۔ محض ارادہ سے کسی مادہ یا صورت کے تابع نہیں ہے۔ مجرد ارادہ کیا۔ ان سے اور وہ ہو گئی تو جواب بالکل قاعدہ میں دیا گیا ہے۔ بہت بڑھیا جواب ہے۔ سارا عالم ملکر بھی اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا۔ بالکل صحیح جواب دیا اور علمی معاملہ میں جواب دیا۔ یہ میں کہہ رہا ہوں کہ جواب قانون کے اندر ہے اگر روح مرکب ہوتی تو بتاتا کہ روح فلاں فلاں اجزائے سے بنی ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ یعنی تمہیں صرف مرکبات کا علم ہے کہ ان ان اجزائے سے یہ شئے بنی ہے۔ اس بات پر غور نہیں کیا کہ مرکبات کا سلسلہ لاانتہا تو جا نہیں سکتا کہ وہ اجزائے سے پیچھے ہوتا ہے۔ تو شروع میں اول مفردات اور واحدات ہی آئیں گے۔ اور واحدات کا وجود امر رب سے ہوا کسی جز سے نہیں۔ تو قل سے جواب دیا۔ مگر یہاں کیا ہے۔ اذا سالک عبادی عنی فانی قریب۔ جب بندہ پوچھتا ہے میرے بارہ میں تو قل کہنے میں دیر لگتی ہے۔ اتنی دیر میں کہیں بندہ گھبرا نہ جائے۔ تو کہا میں موجود ہوں۔ بول کیا کہتا ہے۔ تو اس کو بندہ سے اتنا علاقہ ہے کہ قل کا لفظ بھی درمیان میں نہیں لایا کہ قل کہنے میں دیر لگے گی۔ انی قریب میں موجود ہوں۔ اجیب دعوت الداع اذا دعان۔ جب دعا مانگنے والا دعا مانگتا ہے۔ میں اس کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں۔ فلیستجیبولی۔ پس بندوں کو چاہئے کہ میری اطاعت کریں۔ فلیو منوبی اور مجھے مانیں۔

یہاں یہ دقت ہے کہ ایک آدمی دس دس برس دعا مانگتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی۔ اور یہاں کہتا ہے کہ میں فوراً جواب دیتا ہوں۔ تو دوسری آیت میں شرط لگا دی کہ اگر میں چاہوں گا تو قبول کروں گا۔ فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء تو وہ سوال ہی

ختم ہو گیا۔ اگر مشیت ہوگی تو قبول کرے گا۔ مگر میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ وہ عنقریب میں بیان کروں گا۔ یہاں وہ یہ کہتا ہے میں سنتا ہوں قبول کرتا ہوں جواب دیتا ہوں اور قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ کسی چیز کو کسی شے سے اتنا قرب نہیں ہے۔ جتنا اللہ کو قرب ہے بندہ سے یعنی بندہ کی ذات کو بھی بندہ سے اتنا قرب نہیں ہے۔ بڑا عجیب نکتہ ہے۔ اس کو آپ سمجھ لیں۔ ایجاد کے معنی یہ ہیں کہ ماہیت کو وجود کے ساتھ متصف کر دینا۔ آپ کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ کی ماہیت کو آپ کے وجود کے ساتھ چسپاں کر دے تو وہ جو پہنانا ہے۔ وہ پہننے سے پہلے بیچ میں آگیا ہے۔ ذات کو وجود کے ساتھ متصف کرنا یہی معنی تخلیق اور ایجاد کے ہیں۔ تو وہ جو ایجاد ہے وہ ذات اور وجود کے بیچ میں آگئی۔ تو ذات تو پرے رہی اور ایجاد مقدم ہو گیا۔ اللہ پاک انسان کے وجود سے بھی زیادہ قریب ہے اور فرمایا نحن اقرب الیہ من حبل الورید ہم اسکی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ بہت زیادہ قریب ہے اور برابر سنتا ہے۔

اب بات جو میری سمجھ میں آئی یہ ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے چار طریقے ہیں۔ یا تو مقصود فوراً حاصل ہو جائے گا۔ یا کچھ دیر میں حاصل ہوگا یا دوسرے جہاں میں حاصل ہوگا یا گناہ جو کئے ہیں ان کے بدلہ میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔ یہ سب معنی دعا کے قبول ہونے کے ہیں۔ جیسے آپ نے مجھ سے چار ہزار مانگے۔ مجھے آپ سے سات ہزار لینے ہیں۔ میں نے وہ نہیں مانگے۔ چھوڑ دیئے تو یہ بھی تو ملنے ہی کے برابر ہیں۔ اب آپ دعا کے معنی سمجھ لیں دعا کیا چیز ہے۔ جب آپ نے کہا کہ یا اللہ مجھے یہ دے دے تو اس کے کیا معنی ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اللہ کو جانتا ہو کہ وہ ہے پھر یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالٰے کو میری حاجت کا علم ہے۔ پھر یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالٰے میں یہ قدرت ہے کہ میری حاجت کو رفع کر دے۔ پھر وہ جانتا ہو کہ اللہ کی طبیعت کا میلان ہے اس کی

طرف۔ تو موجود ہو۔ عالم ہو۔ قادر ہو رحیم ہو اور یکتا ہے روزگار ہو کوئی اور نہ ہو شریک
اس میں۔ اگر یکتا نہیں ہوگا تو وثوق اور اطمینان طبیعت میں نہیں ہوگا۔ طبیعت نہیں
لگے گی کہ دینا ہے تو دے نہیں تو آگے جا کر لے لوں گا۔ اور جب یہ جانے گا کہ کوئی اور
دینے والا ہی نہیں ہے تو پوری عجز اور انکساری سے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور پورا
خشوع وخضوع ہوگا۔ تو دعا کتنی قیمتی چیز ہوگئی۔ اُدھر تو اس کے وجود۔ علم قدرت
ورحمت اور یکتا ہونے کا علم ہوا اِدھر اپنی محتاجی۔ عجز۔ ذلت سے پورا مطلع ہوا تو دعا
توحید مطلق تمام علوم الٰہی اور اپنے تمام ذاتی نقائص اور عیوب کو جامع ہے۔ دعا
پوری ربوبیت اور پوری عبودیت کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا۔ الدعاء مخ العبادت۔ دعا تو عبادت کا بھیجا اور مغز ہے۔ دعا میں
تمام عقائد اور تمام عمل انکساری اور عاجزی وغیرہ سب جمع ہوگئے۔ بہت بڑی عبادت
ہے۔ پوری عبادت ہے۔ اس لئے بہت اہم چیز ہے۔ تمام انبیاء کا شیوہ رہا ہے سب
ہی مانگتے چلے آرہے ہیں۔ ہمار دعا مانگنی چاہیئے۔ ادعوا ربکم تضرعا وخیفۃ
دعا مانگو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا آمین
اسم الٰہی ہے یا دعا ہے۔ یا اس کے یہ معنی ہیں۔ اللھم استجب یا اسم ہے یا آمین
جیسے یا کریم یا رحیم۔ اگر یہ دعا ہے تو ادعوا ربکم تضرعا وخیفۃ چپکے چپکے دعا مانگو
تو آمین چپکے سے کہو۔ اور اگر یہ اسم الٰہی ہے تو واذکر ربک خیفۃ ودون الجہر
اپنے رب کو زور سے نہیں بلکہ چپکے چپکے یاد کرو۔ تو ہر صورت میں آمین چپکے سے ہونا
چاہیئے۔ یہ ان کا استدلال ہے اور بڑا محکم استدلال ہے۔ مذہبی چیز ہے۔ خدا تعالٰی
دعا کو قبول فرماتا ہے۔ اور مختلف طریقہ پر قبول فرماتا ہے۔ اس نے اپنی پہچان بتائی کہ
امن یجیب المضطر اذا دعاہ مضطر کے دعا کو کون قبول کرتا ہے۔ میں ہی تو قبول
کرتا ہوں۔ تو دعا میں بے قراری اور اضطرار اور خفیہ کی شرط لگائی۔ خفیہ کی قید اس لئے

لگائی کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔ اگر دکھاکر، زور سے دعا مانگے گا تو وہ دوسرے
کے لئے ہو جائے گی۔ یہاں بھی آپ دیکھیں کہ اگر کسی پر آپ دکھا کر احسان کریں یا تعظیم
کریں تو وہ خوش نہیں ہو گا بلکہ توہین سمجھے گا۔ دل میں ناراض ہو گا۔ تو خفیہ کی قید اس
لئے لگائی کہ ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔ خالص اللہ کے لئے ہو۔ اور تضرع کی شرط اس لئے
لگائی کہ تضرع گڑگڑاہٹ اور پریشانی اس کی علامت ہے کہ حاجت صحیح ہے۔ اگر
حاجت صحیح نہ ہو تو گڑگڑائے گا نہیں۔ اور طلب صحیح سے مطلوب جدا نہیں ہوتا! دہر
دعا مانگے گا ادہر قبول ہو جائے گی۔ اگر آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ میں آپ کو ایک پیسہ
دے سکتا ہوں اور مجھ سے مانگیں گے تو میں قطعی دے دوں گا۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا
کہ جب دعا مانگو تو یہ نہ کہو کہ اللھم اغفر لی ان شیئت۔ اے اللہ اگر تو چاہے تو بخش دے
نہیں۔ کہو۔ اللھم اغفر لی۔ پورے یقین کے ساتھ کہو اے اللہ مجھے بخش دے۔ مشیت
کی قید مت لگاؤ۔ اسے ہر وقت اختیار ہے۔ تو اگر آپ پوری قوت کے ساتھ کوشش کریں
اور یہ یقین رکھیں کہ میرے رب کا قانون یہی ہے۔ اور پھر آپ دعا مانگیں گے تو فوراً
قبول ہو گی۔ اور اگر آپ اس طرح دعا مانگ رہے ہیں جیسے وہ فقیر کہ اس نے کہا آپ نے
سنا نہ سنا اور وہ آگے بڑھ گیا تو اسے کیا ملے گا۔ نہیں اسے زور سے کہنا چاہئے تاکہ آپ کے
کان تک آواز پہنچ جائے اور اس کا طریقہ یہی ہے۔ کہ عاجزی انکساری، خشوع و خضوع
اور اس بات کا یقین کہ وہ دے گا۔ ایک بزرگ نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ ایک
شخص مسجد میں روزانہ گڑگڑا کر دعا مانگتا رہا اور کوشش کرتا رہا مگر دعا قبول نہیں ہوتی تھی
مگر وہ مانگتا ہی رہا۔ پیچھے نہیں ہٹا۔ آخر ایک عرصہ کے بعد ہاتف نے آواز دی کہ تیرے
نصیب کا یہاں کچھ نہیں ہے۔ کیوں پریشان ہوتا ہے۔ اس نے سنا۔ مگر دوسرے
روز پھر آکر دعا میں مصروف ہو گیا۔ پھر آواز آئی کہ کل تجھے منع کر دیا تھا۔ پھر تو کیوں آگیا
تو اس نے کہا کہ میں نے سن لیا تھا مگر میں آج اس لئے آیا ہوں کہ اگر تو نہیں دیتا ہے تو نہ دے

مگر مجھے اگر کوئی اور جگہ ہے جہاں سے مجھے مل سکتا ہو تو بتا دے۔ مگر چونکہ کوئی درواز
نہیں ہے۔ اس لئے مجبوراً میں یہیں آتا ہوں تو اس کی دعا قبول ہوگئی۔ تو اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ پہلے آزمائش ہوتی ہے پھر قبولیت ہوتی ہے۔ لہذا دعا برابر مانگتے رہنا
چاہیئے۔ ایک طریقہ انہوں نے یہ بتایا کہ رسول مقبولؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ پاک فرماتا ہے
کہ جو بندہ دعا نہیں مانگتا میں اس کو دعا مانگنے والے سے زیادہ دیتا ہوں۔ اس سے
یہ پتہ چلا کہ دعا نہ مانگنا صدیقین کا شیوہ ہے کہ وہ راضی برضا ہیں۔ لیکن وہ حدیث کا صحیح
مطلب نہیں سمجھے۔ حضور کا فرمان ٹھیک ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ اس
کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان سے تو نہیں کہتا مگر دل اس کا برابر مانگ رہا ہے۔ وہ حاجتی
ہے۔ یعنی جو دل سے دعا مانگتا ہے اس کو میں زبان سے دعا مانگنے والے سے زیادہ دیتا
ہوں۔ لہذا یہ دلیل بھی ختم ہوگئی۔ دعا کے خلاف ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ استغراق الٰہی
کے منافی ہے۔ اپنی حاجت کے لئے دل کی توجہ اللہ کی طرف کرنے کا نام دعا ہے تو خدا
کی طرف توجہ بغیر کسی مقصد کے استغراقاً ہو یہ بدرجہا بہتر ہے اس کے کہ وہ اپنی حاجت
کے لئے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ ایک دھوکا ہے۔ کیونکہ استغراق مقصود بالذات نہیں
ہے۔ مقصود بالذات وہ شے ہے جس کا حکم دیا جائے۔ اس نے حکم دیا عبادت کا اس نے
حکم دیا دعا کا۔ تو حکم کے تحت عبادت کرنا دعا کرنا دونوں صحیح ہیں اور اپنی رائے سے
استغراق میں اسکے حکم کے بغیر رہنا یہ اچھی بات نہیں ہے۔

فغانِ قرآن

جلسوں میں سنایا جاتا ہوں ٹیپوں میں بجایا جاتا ہوں | لہروں پہ اڑایا جاتا ہوں جب نشر کیا جاتا ہوں
تقریب جب کوئی ہوتی ہے وہ دین کی ہو یا دنیا کی | آغاز مجھ ہی سے ہوتا ہے پھر خوب بہلایا جاتا ہوں
مکتب ہی تلک محدود نہیں تعلیم مری تدریس مری | اب کالج و یونیورسٹی میں معنوں سے پڑھایا جاتا ہوں
الفاظ کو میرے علامہ پہناتے ہیں کچھ ایسے معنے | جبریل امین لائے نہ جسے مضمون وہ بتلایا جاتا ہوں
بوبکر و عمر سمجھے نہ جسے عثمان و علی پہنچے نہ جہاں | اسرار و معارف کے ایسے زینہ پہ چڑھایا جاتا ہوں
تصدیق رسولِ برحق کی مقصد تھا مرا غایت تھی مری | اب قولِ نبیؐ کو جھٹلانے کے کام میں لایا جاتا ہوں
جب کوئی مفکر مغرب کا دنیا سے نرالی بات کہے | تائید کرانے کو اس کی فوراً میں بلایا جاتا ہوں
جو اپنے من کو بھاتی ہیں پڑھتے ہیں وہی آیات مری | اک رخ سے دکھایا جاتا ہوں اک رخ سے چھپایا جاتا ہوں
امداد تو مجھ سے لیتے ہیں پر یہ نہیں کیسے چھپا جاؤں | اک بار جگایا جاتا ہوں اک بار سلایا جاتا ہوں

قرآنِ عزیز اس طرح کرے فریاد و فغاں اللہ اللہ
عرقِ ندامت عرقِ ندامت میں تو نہایا جاتا ہوں

مولوی عزیز الحق مرحوم
ڈپٹی سکریٹری حکومت پاکستان

تیغِ قرآن

یہ نظم ۳ مئی ۱۹۵۹ء کے جلسۂ تقسیمِ اسناد دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو آلہیار، زیرِ صدارت عالی جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (صدرِ پاکستان) میں پڑھی گئی۔

چوں سیاست عقدۂ پیدا کند — ناخنِ شمشیر آں را وا کند
چوں فتد در رشتۂ تدبیر پیچ — وانشد جز خمِ شمشیر، ہیچ
چیست دانی کارِ شمشیر و سناں — حفظِ خیر و دفعِ شر اندر جہاں
عقل کَے دارد تمیزِ خیر و شر — بے خبر باشد ہم از نفع و ضرر
امتیازِ نیک و بد یا خیر و شر — نیست ممکن جز بہ قرآنِ و خبر
فرق کردن در صواب و ناصواب — نیست ممکن جز بہ تعلیمِ کتاب
تیغ اگر از حکمِ قرآں سر کشد — سر بہ تخریبِ و فساد و شر کشد
گردنش چوں پیشِ قرآں خم شود — تیغ اگر زخمے زند مرہم شود
اہلِ حق را تیغ با قرآں بس است — کاں علاجِ احتیاجِ ہر کس است

این[1] دو قوت حافظ یک دیگر اند	کائنات زندگی را محور اند
کارگر باشد ہمیں تدبیر ما	تابع قرآن شود شمشیر ما
قاہری از خواہش خود کافری است	قاہری با حکم حق پیغمبری است
ایں برائے ملت ماخوب شد	بہرہ یاب از فیض دو ایوب شد
آں یکے در ملک پاکستان صدر	واں دگر[2] بر آسمان علم بدر
حق یکے را صاحب شمشیر کرد	دیگرے را عالم تفسیر کرد
امر ہم باشد چہ شوریٰ بینہم	اہل حق نکنند راہ خویش گم

گر بہم سازند دو ایوب ما
زود تر حاصل شود مطلوب ما

---

[1] علامہ اقبال مرحوم

[2] علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی

پتہ تبدیل ہوگیا ہے

نیا پتہ یہ ہے

سید شوکت علی

پوسٹ بکس نمبر ۳۵۸ کراچی نمبر ۱